دس فاتح

بشیر احمد سعدی

زندہ کتابیں

خالد بن ولیدؓ، ابو عبیدہؓ، عمرو بن العاصؓ، سعد بن وقاصؓ، طارق بن زیاد
محمد بن قاسمؒ، محمود غزنوی، صلاح الدین ایوبی، شہاب الدین غوری، محمد فاتح

5.00

البیان

دس فاتح

دس فاتح

سیّد بشیر احمد سعدی

البیان
چوک انارکلی - لاھور

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

۱۹۶۸ء
ناشر: محمد حنیف رامے، البیان، لاہور
طابع: اشرف پریس لاہور

جسٹس سردار محمد اقبال صاحب

جج: ہائی کورٹ مغربی پاکستان لاہور

کے نام

کتابیات

۱۔ تاریخ طبری
۲۔ تاریخ کامل ابنِ اثیر
۳۔ فتوح البلدان بلاذری
۴۔ کتاب الانساب سمعانی
۵۔ تاریخ ابنِ خلدون
۶۔ تاریخ فرشتہ
۷۔ طبقات ناصری
۸۔ ابنِ خلکان
۹۔ جواہر مغلیہ
۱۰۔ سلاطین اسلام لین پول
۱۱۔ منہاج السراج۔

ترتیب

	نام فاتح		سن فتح			
۱-	حضرت خالدؓ بن ولید	فاتح عراق	۱۲	ہجری بمطابق	۶۳۳	عیسوی
۲-	حضرت ابوعبیدہؓ ابن الجراح	فاتح شام	۱۷	″ ″	۶۳۸	″
۳-	حضرت عمروؓ بن عاص	فاتح مصر	۲۰	″ ″	۶۴۱	″
۴-	حضرت سعد بن وقاص	فاتح ایران	۲۱	″ ″	۶۴۲	″
۵-	جناب طارقؒ ابن زیاد	فاتح اندلس	۹۱	″ ″	۷۱۰	″
۶-	جناب محمدؒ بن قاسم	فاتح سندھ	۹۴	″ ″	۷۱۴	″
۷-	سلطان محمودؒ غزنوی	فاتح پنجاب	۴۰۸	″ ″	۱۰۱۷	″
۸-	سلطان صلاح الدین ایوبی	فاتح بیت المقدس	۵۸۱	″	۱۱۸۷	″
۹-	سلطان شہاب الدین غوری	فاتح ہند	۵۹۰	″ ″	۱۱۹۴	″
۱۰-	سلطان محمد فاتح	فاتح قسطنطنیہ	۸۵۷	″	۱۴۵۳	″

تمہید

جن لوگوں کے دلوں میں کشورکشائی اور ملک گیری کے جذبات چٹکیاں لیتے رہے اور تلوار کے زور سے ایک دُنیا فتح کرنے کے لیے نکلے وہ جنگ وجدل اور خون آشامی کی تاریخ میں فاتح کہلاتے ہیں، مگر دُنیا جانتی ہے کہ ان فاتحوں کے ہاتھوں قومیں کبھی محفوظ نہیں رہیں بلکہ اُن کی جان ومال اور آبرو ہمیشہ لُٹتی رہی۔ یہ واقعہ ہے کہ فاتح اور حاکم قوم نے مفتوح اور محکوم قوم سے کبھی اچھا سلوک نہیں کیا۔ مثلاً آریہ جب ایران سے نکل کر ہندوستان آئے تو انھوں نے غیر آریہ قوموں سے نہایت انسانیت سوز سلوک کیا حتیٰ کہ وہ یہاں سے اِدھر اُدھر نکل بھاگنے پر مجبور ہوگئیں اور نووارد آریہ قوم ہندوستان کی واحد مالک بن گئی۔ اسی طرح جب یونانیوں کو ایرانیوں پر غلبہ واقتدار حاصل ہُوا تو انھوں نے بھی وہ قیامت برپا کی کہ اس کے بیان سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

رومیوں نے جن کا دعویٰ ہے کہ وہ دُنیا کی سب سے زیادہ قدیم، متمدن اور مہذب قوم ہیں۔ اہل قرطاجنہ پر جب فتح پائی تو کارتھیج کا ایک گھر بھی سلامت نہ رہنے دیا، سب کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ بخت نصر کا حال یہ تھا کہ اُس نے فتح کے بعد پورے ایک لاکھ انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتارا، مگر اس کی آتشِ غضب اس پر بھی سرد نہ ہوئی۔ اسپین میں فتح پانے

کے بعد مفتوح مسلمانوں کے ساتھ فرڈی نینڈ نے بھی ایسا ہی بہیمانہ سلوک کیا اور وہاں ایک بھی مسلمان باقی نہ رہنے دیا، سب کو فنا کے گھاٹ اتار دیا۔ عیسائیت جس کی بنیاد محبت اور صلح و آشتی پر بیان کی جاتی ہے، اس مذہب کے پیروکار عیسائیوں نے بھی فتح کے نشے میں بیت المقدس کی مسجد کے عین صحن میں پورے ستر ہزار مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہایا۔

اس کے برعکس مسلمان فاتحوں کی کیفیت ہمیشہ یہ رہی کہ وہ جب کبھی کسی ظالم قوم کی تسخیر و تعزیر اور ان کے ملک کی فتح کے لیے مدینۃ النبیؐ سے باہر نکلتے انھیں سب سے پہلے یہ ہدایت کی جاتی کہ دیکھنا ہر معاملے میں چاہے وہ ظاہر ہو یا پوشیدہ خدا سے ڈرتے رہنا۔ اس کی رضا کو ہر دوسری رضا پر ترجیح دینا۔ دشمن سے جنگ میں اگر اللہ تعالیٰ انھیں فتح عطا فرمائے تو کسی کے گلے میں لوہے کا طوق یا پیروں میں بیڑیاں نہ ڈالنا۔ نہ کسی کے ہاتھ، پیر، کان اور جسم کا کوئی حصہ کاٹنا یعنی مثلہ نہ کرنا۔ نہ دشمن کو فریب دینا نہ اس سے بے وفائی کرنا اور نہ لڑائی میں بزدلی دکھانا۔ نہ بچوں کو مارنا، نہ بوڑھوں اور عورتوں کو قتل کرنا، نہ کسی جانور کی چونچیں کاٹنا۔ سوائے اس کے کہ اس کا گوشت کھانے کے لیے ایسا کرنا پڑے۔ تمھارا گزر ایسے لوگوں سے بھی ہوگا جو خانقاہوں میں راہبانہ زندگی بسر کرتے ہیں، جو کہیں گے کہ ہم نے اپنی زندگی خدا کی عبادت کے لیے وقف کر دی ہے۔ اُن سے بھی کوئی تعرض نہ کرنا، نہ کسی پھل والے درخت کو کاٹنا، نہ کھجور کے درخت کو برباد کرنا۔ غرض مفتوحین سے اچھا سلوک کرنا۔ اُن کے حقوق اور آبرو کی حفاظت

کرنا اُن کے ساتھ نرمی و رواداری سے پیش آنا۔

بفرض محال اگر مسلمان فاتحوں نے بھی غیر مسلم فاتحوں ایسا بہیمانہ سلوک کیا ہوتا تو بلادِ عجم میں بلاشبہ آج ایک بھی عجمی دکھائی نہ دیتا۔ یورپ جیسے مسلمان فاتحوں کے کردار پر باوجود عمدہ ہونے کے کیچڑ اچھالتے ہوئے کبھی شرم نہیں آتی اگر مسلمانوں نے بھی اس کے ساتھ یہی طرزِ عمل اختیار کیا ہوتا، یقین کیجیے آج یورپ میں بھی ترک مسلمانوں کے ہاتھوں ایک بھی عیسائی اور یہودی قائم نہ رہتا۔

حق تو یہ ہے کہ ہند (بھارت)، شام، بلقان اور اناطولیہ پر مسلمانوں کی صدیوں حکومت رہی مگر اس کے باوجود مسلمانوں کی مثالی رواداری اور حُسنِ سلوک کی بدولت ان ملکوں میں آج بھی غیر مسلموں کو اکثریت حاصل ہے۔ لامحالہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ اسلام کے جاں نثاروں اور مسلمان فاتحوں ہی کی منفرد شان ہے کہ اُن کے وجود کو غیر مسلم دنیا نے بھی اپنے لیے ہمیشہ رحمت اور خیر و برکت کا موجب خیال کیا ہے جو براہِ راست نتیجہ ہے اسلام کی تعلیمات کا۔

یہ بات کہ مسلمان فاتحین لٹیرے اور ہوس کار تھے۔ یہ دشمنانِ اسلام کی طرف سے اُن پر صریحاً ایک الزام اور بہتان ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں جہاں فاتحین کی زندگی اور اُن کے پسندیدہ کردار کے عمدہ نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ وہاں یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ مسلم فاتحین جب کبھی کسی دوسرے ملک پر قبضہ کرتے تو سب سے پہلے اُس کی رعیت کے مال و جان اور اُن کی عزت اور

آبرو کی حفاظت کرتے۔ اور غیر مسلم مفتوحین کے رسم و رواج اور اُن کے مذہبی معاملات میں مداخلت کرنا اسلام کی تعلیمات کے خلاف سمجھتے اور اس سے ہمیشہ اجتناب کرتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کی یہی وہ روحانی قوت ہے جس سے دنیا میں اسلام کی اشاعت ہوئی اور غیر مسلم قوموں نے آپ سے آپ برضا و رغبت اسلام قبول کیا۔

زیرِ نظر کتاب کا لُبِ لباب یہ ہے کہ من حیث القوم مسلمانوں کو بین الاقوامی سطح پر اُبھرتا ہُوا دیکھ کر اگر حسد و بغض کی راہ سے رومیوں اور ایرانیوں کی طرف سے اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے کے منصوبے قائم نہ کیے جاتے تو مجاہدینِ اسلام عراق و شام اور مصر و ایران پر کبھی چڑھائی نہ کرتے۔

اسی طرح اگر مظلوم عیسائیوں نے باوجود ہم مذہب نہ ہونے کے مسلمانوں کو پکارا نہ ہوتا اور سندھ کے راجہ داہر نے مسلمان عورتوں اور بچوں کو لٹیروں کے سپرد کر کے مسلمانوں کی غیرت کو للکارا نہ ہوتا تو مسلمان ہرگز اندلس اور سندھ پر حملہ نہ کرتے۔ پھر اسی طرح اگر لاہور کے راجہ جے پال نے توسیع مملکت کے شوق میں غزنہ کی اسلامی حکومت پر چڑھائی نہ کی ہوتی اور اپنی ہندو قوم کو جان سے چلے جاؤ، مگر کیے گئے وعدوں کو کبھی پورا نہ کرو کا سبق نہ دیا ہوتا تو سلطان محمود غزنوی ہندوستان پر کبھی سترہ حملے نہ کرتا۔ اسی طرح سے عیسائیوں نے، جو ابتدا ہی سے اسلام اور مسلمانوں کے دشمن چلے آتے ہیں، باوجود مسلمانوں کی بے مثال رواداری اور کریمانہ صفات کے اگر مذہب کے نام پر انسانی خون کی ارزانی نہ کی

ہوتی تو سلطان صلاح الدین ایوبی نہ صلیبی لڑائیوں میں معرکہ آرا ہوتا نہ سلطان محمد فاتح کو قسطنطنیہ فتح کر کے عیسائیوں کی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجانے کی نوبت آتی۔ اور یہی صورت کچھ سلطان شہاب الدین غوری کو بھی پیش آئی۔ اگر اُسے ہندو راجے مہاراجے چھیڑ چھاڑ کر جنگ پر نہ اُکساتے اور اُس کے چھوٹے سے مفتوحہ علاقے پر للچائی ہوئی نظریں نہ ڈالتے یا ملتان کی قرمطی حکومت کو اس کے خلاف آلۂ کار کے طور پر استعمال نہ کیا ہوتا تو یقین کیجیے نہ دلی پر شہاب الدین غوری کا غلام قطب الدین حکومت کرتا اور نہ اُس کا دوسرا غلام بختیار خلجی چند آدمیوں کو لے کر بنگال فتح کرتا ہوا تبت تک پہنچتا۔

لیکن بایں ہمہ جب دشمنوں سے مدافعت کے نتیجے میں مسلمانوں نے عراق و شام اور مصر و ایران کو فتح کر لیا تو مسلمانوں نے غیر مسلم مفتوح قوموں سے جو عمدہ برتاؤ اور حسن سلوک کیا اور مسلمانوں کی حکومت قائم ہو جانے سے انھیں فارغ البالی اور خوشحالی میسر آئی جو اس سے پہلے انھیں روم و ایران کے قیصر و کسریٰ کی حکومتوں میں بھی نصیب نہیں ہوئی تو وہ اپنی بادشاہت کو بھول گئے۔ اسی روایتی رواداری کا مظاہرہ مسلمانوں نے ہندوستان میں بھی کیا۔ حتیٰ کہ ہندوستان کے غیر مسلموں کو فرش سے اُٹھا کر عرش پر پہنچا دیا۔

لیکن افسوس غیر مسلموں بالخصوص ہندوؤں کی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف آج تک وہی روش چلی آ رہی ہے جو سب سے پہلے برہمن نژاد

راجہ جے پال نے سلطان محمود کے مقابلے میں اختیار کی تھی۔ باوجود اس کے کہ وہ شکست کھا کر گرفتار ہوا اور سلطان محمود نے ایک سچے مسلمان اور حوصلہ مند اور فاتح بہادر کی طرح نہ صرف اُسے آزاد کر دیا بلکہ اس کا تخت و تاج بھی واپس کر دیا لیکن اس حسن سلوک اور احسان کا بدلہ برہمن زادے نے یہ دیا کہ دوسرے سال غزنہ پر پھر چڑھائی کر دی۔

اسلامی تاریخ کا اگر سرسری طور پر بھی مطالعہ کیا جائے تو بغیر کسی دشواری کے یہ بات نہایت آسانی کے ساتھ واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کا حقیقی مقصد وہ فتوحات نہیں جس میں تیر سے بھالے اور تیر و تلوار استعمال کیے جاتے ہیں بلکہ یہ جنگ تو ذریعہ تھی اُن فتوحات کے لیے جن کے نتیجے میں انسانی دل و دماغ اسلام کی ناقابلِ تسخیر قوت کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔

مختصراً یہ کہ اسلام دین برحق ہے اس کے ظہور سے آج تک باطل کی قوتیں اس سے برابر برسرِ پیکار ہیں اور جب تک اسلام ہے اس سے برابر الجھتی رہیں گی وہ سب سے پہلے مکے کی گلیوں میں الجھیں شب ہجرت میں بھی اُلجھیں، بدر و اُحد میں بھی اُلجھیں، احزاب و خیبر میں بھی اُلجھیں پھر شام میں الجھیں، عراق میں الجھیں، روما کی سلطنت تلملا کے اٹھی، ایران کی سلطنت بل کھا کے نکلی۔ غرض میدان حق و باطل ستیزہ کاری ابتدا ہی سے چلی آ رہی ہے۔ شرار بولہبی نے مسلمانوں کے امن کا خرمن جلا کر راکھ کا ڈھیر کرنے کی ہمیشہ کوشش کی۔ لیکن چشم فلک نے دیکھ لیا کہ باطل کی قوتیں چاہے

کتنے ہی ساز و سامان رکھتی ہوں ؛ یا تعداد و طاقت کے لحاظ سے خواہ کیسی ہی ہوں، ہمیشہ حق ہی اُن پر غالب آتا ہے اور اس سے ٹکرانے والی ہر قوت پاش پاش ہو کر رہ جاتی ہے۔

دو لفظی بات یہ کہ ۱۳۸۵ برس کی طویل مدت میں جنگ بدر سے لے کر پاک بھارت جنگ تک ایک دو نہیں ہزاروں معرکے برپا ہو چکے ہیں جن میں مردانِ حق آگاہ نے جو محیر العقول کارنامے پیش کیے، وہ ۱۳۸۵ ھ مطابق ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں زندہ واقعات بن کر دنیا کے سامنے آگئے اور دُنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ حضرت خالد بن ولید تین ہزار مسلمانوں کے ساتھ ایک لاکھ رومیوں سے کیونکر ٹکرا گئے یا حضرت سعد بن وقاص جب تین ہزار سپاہ لے کر نکلے تو انھوں نے پدرنے دو لاکھ کے لشکر جرار کو کیسے شکست دی ؟ طارق ابنِ زیاد نے سات ہزار سپاہ کے ساتھ یورپی ممالک پر کیسے اسلامی عَلم لہرایا اور محمد بن قاسم نے بارہ ہزار سپاہ لے کر پورے سندھ کو کیونکر فتح کیا۔ یا سلطان محمود غزنوی اور سلطان شہاب الدین غوری نے ہندوستان کے در و بام کو اسلامی ہند کے نام سے کیونکر آشنا کیا اور احمد شاہ ابدالی نے ۶۵ ہزار فوج کے ساتھ پانی پت کے میدان میں چھ لاکھ مرہٹہ سپاہیوں کے ٹڈی دل لشکر کا کیسے منہ پھیرا اور اس پر کیونکر فتح پائی ؟

آج پاکستان کے مٹھی بھر مسلمانوں نے جن کے سینوں میں اسلام کے یقین و ایمان کی حرارت موجود ہے گذشتہ ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں اپنے ایمان کی قوت، اور شجاعت و بسالت کے وہ جوہر دکھائے

اور باوجود ساز و سامان کی کمی کے اپنے سے چار گنا زیادہ بھارتی دشمن کے جس ہمت اور جوانمردی سے دانت کھٹے کیے اس نے اسلامی تاریخ کے ان واقعات کو زندہ کر دکھایا اور ان کے علم کو عین الیقین بنا دیا اور حیلے وسیلے تلاش کرنے والی اشیاء کے اسباب و علل کے سلسلے میں جوڑ توڑ کر نتائج نکالنے اور مادی قوتوں پر بھروسہ رکھنے والی انسانی عقل کو ایک مرتبہ پھر سبق دیا ہے کہ تمام قوتوں سے بالاتر ایک قوت ایسی بھی ہے جو اسباب و علل کے سارے حساب کو غلط کر دیتی ہے۔ اس کی مشیئت ہوتی ہے تو دریاؤں میں بھی راستے نکل آتے ہیں اور اگر نہیں چاہتی تو سارے ساز و سامان دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں اُسے منظور ہوتا ہے تو موت خود حفاظت کرتی ہے اور اگر منظور نہ ہو تو میدان جنگ سے جی چرانے والے شبستانوں میں بیٹھے بیٹھے بھی موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں اور زندگی اُن سے منہ پھیر لیتی ہے۔ مسلمانوں کی طاقت اور قوت کا سرچشمہ فقط یہ ہے کہ وہ خدائے وحدۂ لاشریک پر ایمان و یقین رکھتے ہیں۔ شوقِ شہادت اور جوشِ جہاد کی گرمی ان کے رگ و پے میں بجلیاں بھر دیتی ہے اور سینوں میں حرارت قائم رکھتی ہے۔

سید بشیر احمد سعدی

فاتح مکہ

حضور پیغمبرِ اسلام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی پاکیزہ حیاتِ مبارکہ کے مختلف شعبوں میں ایک نمایاں پہلو یہ بھی تھا کہ آپ ایک عظیم سپہ سالار اور بہترین فاتح بھی تھے۔ آپ کی ذات، دالاصفات میں، جہاں اور دوسرے کمالات کی انتہا درجہ تھی وہاں آپ نے جنگی قابلیت اور حربی صلاحیت اور اس کی تنظیم کے بھی ایسے اعلیٰ نمونے پیش فرمائے جن کی فاتحوں کی دنیا میں کہیں نظیر نہیں ملتی۔

حضور کی حیاتِ نبوت تیئس ۲۳ برس پر مشتمل ہے جن میں سے تیرہ ۱۳ برس کی زندگی کے ہیں جن میں آپ کو کفار مکہ کے ہاتھوں طرح طرح کے روح فرسا دکھ اور صدمے اٹھانے پڑے اور آپ نے ان کے روکنے کے لیے بالکل تلوار نہیں اٹھائی اور دس برس مدنی زندگی کے ہیں جن میں آپ کو اسلام اور مسلمانوں کی تبلیغ، خدمت اور حفاظت کے لیے کفار مکہ سے لڑنا پڑا۔

کفار مکہ سے جنگ و جدال کا آغاز ہجرت سے دوسرے ہی سال ہو گیا تھا۔ کفار چاہتے تھے کہ جو مسلمان ہمارے ظلم و ستم سے تنگ آکر مکہ سے ہجرت کر کے مدینے چلے گئے ہیں وہ کبھی آرام و سکون کے ساتھ زندگی بسر نہ کر سکیں۔ انھیں ڈر تھا کہ اگر بروقت ان پر حملہ نہ کیا گیا تو یہ لوگ ضرور ایک روز ہم پر غالب آ کر رہیں گے اور ان کا دین گھر گھر پھیل جائے گا۔

مسلمانوں کی کیفیت یہ تھی کہ وہ جب حضورؐ کے دست مبارک پر اسلام لاتے اُن میں کسی قسم کی تنظیم نہ تھی۔ یہ مکہ کے چند افراد تھے جنہیں اسلام کی تاریخ میں قرآن حکیم کے حوالے سے سابقین الاولین کہا جاتا ہے۔ پھر ان کے بعد جو لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوتے۔ یہ مدینہ کے قبیلہ اوس خزرج کے تھوڑے سے غریب اور مفلس لوگ تھے جن کے شب و روز فقروفاقہ مستی میں گزرتے تھے اور ان کی زندگی کے سارے معاملات یہودیوں کے ہاتھ میں تھے۔ یہ لوگ پہلے شام اور فلسطین پر حکمران تھے۔ پھر جب دوسری صدی عیسوی میں رومیوں نے ان کی حکومت کو مٹا دیا تو مجبور ہو کر حجاز چلے آئے اور مدینے سے شام کی سرحد تک ان کے مختلف قبیلے آباد ہو گئے، جہاں اُنھوں نے قدم قدم پر اپنے لیے فوجی قلعے اور چھاؤنیاں قائم کر لیں۔

مدینہ اور اُس کے آس پاس کے علاقوں میں جو یہودیوں کے قبیلے آباد تھے اُن میں خاص کر بنی قینقاع، بنی نضیر اور بنی قریظہ بڑی شہرت رکھتے تھے۔ رہے بنی اوس اور بنی خزرج یہ قبائل یمنی الاصل تھے اور مدینے میں کھیتی باڑی کرتے تھے۔ یہ لوگ عام طور پر یہودیوں کے مقروض رہتے تھے۔ اس لیے یہودیوں کا ان پر غلبہ تھا۔ گویا مدینے کے یہی لوگ حاکم اور سیاہ و سفید کے مالک تھے۔

مختصراً یہ کہ مکے میں اہلِ قریش کی حکومت تھی سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے انہی کے سادات کا غلبہ تھا اور مدینے میں اہل یہود حکومت کر رہے تھے اور انہی کے رؤسا کا ہر وقت سکہ چلتا تھا۔ اب ایسے حالات میں

جب مکے کے مسلمان ہجرت کر کے مدینے پہنچے تو گویا وہ چکی دو پاٹوں کے درمیان آ گئے اور اُنھیں اپنا دین اور اپنی جان بچانے کے لیے مکی زندگی سے بھی زیادہ مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ اب ان کا اسلام کے دشمنوں سے دوہرا مقابلہ تھا۔ ایک طرف مدینے کے یہودی تھے، جو در پردہ اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی میں لگے ہوئے تھے۔ دوسری طرف مکے کے قریشی تھے جو اسلام اور مسلمانوں کی ترقی کو اپنے مفاد اور وقار کے خلاف پا کر کھلم کھلا مخالفت کر رہے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ جب مسلمانوں پر حملہ کرنے میں پہل کریں تو اہلِ یہود بھی اُن کا ساتھ دیں اور اُن کے ساتھ مل کر اسلام اور مسلمانوں کو بالکل ملیامیٹ کر ڈالیں

بلا شبہ ایسے نازک حالات میں بڑے سے بڑا تجربہ کار سپہ سالار بھی اپنے دشمن کا مقابلہ کرتے ہوئے ہچکچاتا ہے مگر خدائے اسلام رب العلمین نے اپنے رسول محمدؐ عربی قرشی الہاشمی رحمۃ اللعالمین کو ایسی حربی طاقت اور جنگی بصیرت عطا فرمائی کہ اُن کے ترتیب دیے ہوئے تین سو تیرہ نفوس قدسیہ کے مختصر سے بے سروسامان لشکر نے دشمن اسلام کے سازوسامان سے لیس کثیر التعداد لشکر کی قوت وطاقت کے غرور کو مٹی میں ملا دیا۔ یہ لڑائی جس میں پیغمبرِ اسلام بہ نفس نفیس شریک ہوئے اور اسلام کے لشکر کی کمان سپہ سالار کی حیثیت سے آپ نے فرمائی۔ مدینے سے تھوڑی دُور بدر کے مقام پر لڑی گئی اور اسی مناسبت سے اسلامی تاریخ میں یہ پہلی باقاعدہ اور فیصلہ کن لڑائی جنگ بدر کہلاتی ہے۔

حضور پیغمبر اسلام کی جنگی تنظیم اور حربی صلاحیت کا اس سے بڑھ کر
اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ مکہ بغیر لڑے بھڑے فتح ہو گیا۔ ہر چند حضور
دس ہزار نفوس قدسیہ کے جلو میں وارد مکہ ہوتے۔ اسلام کا لشکر دیکھ کر اہلِ
مکہ کے چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگیں مسلمانوں پر ڈھائے ہوئے طرح طرح
کے ظلم و ستم موت بن بن کر سامنے آنے لگے۔ ابوسفیان جس نے بیس برس تک
اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کی اور اُن کا مقابلہ کیا، اب کاٹو تو بدن
میں لہو نہ تھا۔ سمجھتا تھا کہ اس کی ہر حرکت اور اس کا ہر جرم اُس کے قتل
کے لیے کافی ثبوت ہے۔ لیکن رحمت عالم نور مجسم فاتح مکہ حضور محمد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے مفتوحین سے جو سلوک کیا وہ نہ تو نوشیرواں
ایسے عادل حکمران ہی سے ہو سکا نہ سکندر ایسے عالی ظرف اور طاقتور بادشاہ
ہی سے آپ نے اپنے دشمنوں سے وہی سلوک کیا جو مصر میں حضرت
یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کیا۔

ذرا چشم تصور میں لایئے اس نازک گھڑی کو جب پیغمبر اسلام کے
سر اقدس کی قیمت لگائی گئی اور باوجود اس قدر وسعت زمین کے آپ کو
ایک غار میں پناہ لینے پر مجبور ہونا پڑا۔ خیال کیجیے اُس دشمن کا جس نے
آپ کے محبوب چچا سید الشہداء حضرت حمزہ پر چھپ کر وار کیا اور وہ
اسی وحشی کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ ان کا کلیجہ
چبایا اور مثلہ کیا گیا۔ غور کیجیے یہ وہی وحشی ہے جس کے نیزے کی ضرب سے
دختر رسول سیدہ زینب حمل کی حالت میں شہید ہوئیں۔ آج رحمت عالم

ظلم وستم کے حضور میں بڑے بڑے جبارانِ وقت اور سرکشانِ زمانہ موجود تھیں اور سر جھکائے اپنے انجام کے منتظر ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں، جن کی ستم رانیوں، ننگی تنگی شرارتوں اور سازشوں سے اگر ایک طرف مکہ کے مسلمانوں کو اپنا گھربار، مال و دولت اور عزیز و اقارب کو چھوڑ دینا پڑا تو دوسری طرف بے گھر اور بے سہارا ہونے کے باوجود وہ مدینے میں بھی سکون کا سانس نہ لے سکے۔

حضورؐ نے ایک ہلکا سا تبسم فرما کر انھیں دیکھا اور فرمایا: اے لوگو! جانتے ہو میں تم سے کیا سلوک کرنے والا ہوں۔ ہر چند ان لوگوں نے حضورؐ پر بڑے بڑے ظلم و ستم ڈھائے تھے۔ انھیں جس قدر ستایا جا سکتا تھا ستایا تھا۔ تاہم وہ مزاجِ نبوت کے اداشناس ضرور تھے۔ بیک زبان پکار اٹھے۔ آپ ایک شریف بھائی ہیں۔ ہمیں آپ سے اچھے سلوک ہی کی توقع ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: جاؤ اے لوگو! تم پر کوئی الزام نہیں، تم سب آزاد ہو۔

مدنی زندگی کے دس سال کے عرصے میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت اور حفاظت کے لیے کل باسٹھ لڑائیاں ہوئیں، جن میں سے چھبیس[۲۶] لڑائیاں ایسی تھیں، جن میں پیغمبرِ اسلام بنفسِ نفیس شریک ہوئے اور فوج کی سپہ سالاری کی اور چھتیس لڑائیاں ایسی ہیں جن میں اگرچہ حضورؐ نے شرکت نہیں فرمائی۔ تاہم لشکرِ اسلام کو ایسی ترتیب اور واضح ہدایات دے کر مہمات پر بھیجتے رہے کہ اس کی حربی تنظیم میں سرِ مو کوئی فرق نہیں آنے پایا۔

بلاشبہ یہ حضور کی اسی حربی تنظیم کا نتیجہ تھا کہ مکّہ اور مدینے کے چند بے سروسامان اور مفلس مسلمانوں نے مغرب و ایشیا کی فضاؤں میں اسلامی حکومت کے پھریرے اُڑاتے اور بحر و بر پر حکمرانی کی پیغمبرِ اسلام، سپہ سالارِ اعظم نے اسلامی فوجوں کے لیے جو قوانینِ جنگی منضبط فرمائے اُن میں سرِفہرست اصول اور پہلی ہدایت یہ ہے کہ اللہ سے ڈرتے رہو۔ تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کرو، خدا ہی کے لیے جنگ کرو، خدا ہی سے مدد مانگو۔ جب غلبہ و اقتدار حاصل کرو تو قیدیوں سے بھی اچھا سلوک رکھو اور کبھی کسی پر ظلم نہ کرو۔

غرض یہ تھی اسلام کے سالارِ اعظم اور پیغمبرِ آخرالزماں کی حربی طاقت اور تنظیم جس کے طفیل بے سروسامان مسلمانوں نے قیصر و کسریٰ ایسی باجبروت سلطنتوں کی بنیادیں ہلا ڈالیں اور طاغوتی قوتوں کے طلسمات ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پاش پاش کر دیئے۔

خالدؓ بن ولید

نام و نسب

ابو سلیمان خالدؓ بن ولید بن مغیرہ بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم بن یقظہ بن مرہ بن کعب ابن لوی۔ یعنی خالد بن ولید قبیلہ قریش سے تھے اور آپ کا شجرۂ نسب ساتویں پشت میں پیغمبر اسلام حضور محمد رسول اللہ اور خلیفۂ اول سیدنا ابوبکر صدیقؓ سے مل جاتا ہے۔

قریش، عرب کے تمام قبیلوں میں، اور مکہ عرب کے تمام شہروں میں شروع ہی سے دو معزز نام چلے آتے ہیں۔ اس کے اسباب کچھ تو مذہبی ہیں، کچھ سیاسی اور کچھ تجارتی۔

قریش کی فضیلت یہ ہے کہ وہ سیدنا اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ مکہ جو آج عرب کے تمام شہروں میں سب سے زیادہ بارونق اور پر عظمت شہر ہے انہی کے جد امجد سیدنا اسماعیل اور ان کی والدہ ماجدہ سیدہ ہاجرہ سلام اللہ علیہا کے دم قدم کی برکت سے بے آب و گیاہ ویرانے سے پر عظمت و بارونق شہر بن کر آباد ہوا۔ مذہبی اعتبار سے مکہ معظمہ کو جو فضیلت آج ہمارے زمانے میں حاصل ہے اسلام سے پہلے بھی حاصل تھی اور اس کا سبب اللہ کا وہ مقدس گھر ہے جسے عبادت کے لیے سیدنا ابراہیم و سیدنا اسماعیل علیہما السلام باپ، بیٹا دونوں نے مل کر تعمیر کیا اس گھر کا طواف اور حج کرنے کے لیے جس طرح آج دنیا کے تمام اسلامی ملکوں

سے استطاعت رکھنے والے مسلمان مکّے جاتے ہیں اسی طرح ظہورِ اسلام سے پہلے بھی عرب کے تمام قبیلے بیت اللہ کا طواف اور حج کرنے کے لیے مکّے میں آیا کرتے تھے۔

مکّہ معظمہ اگر ایک طرف مذہبی تقدس کے اعتبار سے عرب کے تمام قبیلوں کی نگاہوں کا مرکز تھا، تو دوسری طرف تجارتی نقطۂ نظر سے بھی وہ بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ اکثر تجارتی قافلے جو اپنے اور ہندوستان کے ملک کی چیزیں لے کر آتے تھے وہ مکّہ ہی کے راستے یمن سے شام اور مصر کی طرف جایا کرتے تھے یعنی مکّہ معظمہ اُن کے راستے میں پڑتا تھا، جہاں انھیں کھانے، پینے کی وافر چیزیں بھی مل جاتی تھیں اور کچھ دیر ٹھہرنے اور سستانے کا موقع بھی مل جاتا تھا۔

اس زمانے میں مکّہ کی جہاں ایک خصوصیت یہ بھی کہ اُس کے بارونق بازاروں میں ہر قسم کا تجارتی سامان فروخت ہوتا تھا، وہاں ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ انھی بازاروں میں عرب کے مختلف قبیلوں کو شعر و ادب کے ذریعے ایک دوسرے پر اپنی بڑائی اور فوقیت ظاہر کرنے کے مواقع بھی میسر آتے تھے۔

مگر بایں ہمہ سادات قریش جس طرح آج ہمارے زمانے میں ہم سب مسلمانوں کے نزدیک معزز و محترم خیال کیے جاتے ہیں (کہ اسلام کے پیغمبر آخر الزماں حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ولادت باسعادت انھی میں ہوئی جن کا خدا کی طرف سے لایا ہوا پیغام ہدایت اور ضابطۂ حیات دنیا کے ہر دور، ہر زمان اور ہر قوم کے لیے کافی ہے) اسی طرح عہدِ جاہلیت میں بھی قریش تمام عرب قبائل کی نظر میں معزز و محترم سمجھے جاتے تھے کیونکہ اپنی گوناگوں خوبیوں کے باعث مکّہ کی سرداری

انہی کو حاصل تھی اور یہی بیت اللہ (کعبہ) کے متولی تھے، اس گھر کا طواف اور حج کرانے کا انتظام انہی کے ہاتھ میں تھا۔

قبیلہ قریش اصل میں عرب کا ایک بہت بڑا قبیلہ ہے جو دس بڑے بڑے خاندانوں پر پھیلا ہوا ہے، ان میں سے بعض خاندان تو اپنے ذاتی اوصاف اور شخصی کمالات کے باعث بے حد شہرت رکھتے ہیں، جیسے حضور پیغمبر اسلام کا خاندان، بنی ہاشم جو اہل قریش میں اپنی سخاوت و شجاعت کے اعتبار سے بے حد مشہور خاندان ہے۔ اسی طرح اہل قریش کا ایک مشہور خاندان بنی مخزوم تھا جس سے خالد بن ولید تعلق رکھتے تھے۔

قبیلہ قریش کا یہ مشہور خاندان، شجاعت اور فراست کے اعتبار سے اپنا ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ شجاعت اور بہادری کے لحاظ سے تو اس کا اندازہ خالد بن ولید کی فتوحات سے کیا جا سکتا ہے جس کے یہ ایک فرد ہیں۔ سخاوت، اور فراست کے باب میں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ مغیرہ بن عبداللہ بن عمر اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، جن کی سخاوت کا سارے عرب میں جواب نہیں تھا۔ اور فراست کے سلسلے میں ابو وہب ابن عمرو کا نام لیا جا سکتا ہے جو اسی خاندان کے مشہور فرد تھے۔ عرب کے لوگوں میں سب سے پہلے انہی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ بیت اللہ کی تعمیر میں صرف وہی رقم خرچ کی جائے، جسے جائز طریقے پر حاصل کیا گیا ہو۔ چنانچہ جب اہل قریش نے تعمیر شروع کی تو ابو وہب نے قریش سے کہا، دیکھو تم خدا کے اس گھر کی عمارت کو تعمیر کرنے تو لگے ہو، مگر یاد رکھو اس کی تعمیر میں کوئی ایسی رقم نہ لگانا، جو حرام ہو یا اس کے حرام ہونے کے بارے میں تمہیں شبہ ہو۔

مؤلف روضۃ الانف لکھتے ہیں کہ ابو وہب رسول اللہؐ کے والد جناب عبداللہ کے ماموں اور مکہ کے نہایت معزز و محترم شخص تھے ان کے قبیلہ بنی مخزوم کی تکریم و حرمت کا اندازہ اس ایک واقعہ سے کیا جا سکتا ہے جس میں رسول اللہؐ کا تمام قبیلوں کو شامل کر کے بیت اللہ کی تعمیر میں حصہ میں لینا بیان کیا جاتا ہے۔ اس موقع پر قبیلہ بنی مخزوم بھی شامل تھا اور بیت اللہ (کعبہ) کی عمارت کا چوتھائی حصہ یعنی حجر اسود سے رکن یمانی تک اسی کے حصے میں آیا۔

بنی مخزوم کی عظمت اور شان کا اندازہ ایک اس امر سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ شرافت، سخاوت اور شجاعت کے اعتبار سے اس قبیلے کو بنی ہاشم کی ہمسری کا دعویٰ تھا، جو قریش کا ممتاز ترین قبیلہ شمار ہوتا تھا اور سیادت صرف اسی کے لائق خیال کی جاتی تھی لیکن بایں ہمہ بنی مخزوم اپنی بڑائی اور برتری کے دعوے سے کبھی الگ نہ ہوتے تھے حتیٰ کہ جب پیغمبر اسلام نے اپنی رسالت کا اعلان کیا تو بنی مخزوم اپنے تفوّق کے جذبے سے فوراً بول اُٹھے کہ اگر خدا آدمیوں میں سے کسی کو نبی بناتا تو یقیناً ہم میں سے بناتا۔ ہاشمیوں کی اُسے کیا ضرورت پیش آئی؟

رشتے ناطے کے لحاظ سے دیکھا جائے تو بنی مخزوم کو اس معاملے میں بجا طور پر فخر حاصل ہے کہ پیغمبر اسلام کی دادی[1] فاطمہ بنت عمرو انہی میں سے تھیں

[1] رسول اکرمؐ کی یہ دادی فاطمہ بنت عمرو آپ کے والد عبداللہ ابن عبدالمطلب چچا زبیر بن عبدالمطلب، ابو طالب ابن عبدالمطلب اور پھوپھی بیضا بنت عبدالمطلب کے سوا دوسری تمام پھوپھیوں کی والدہ تھیں۔ رسول اللہ کی حقیقی دادی بنی ہاشم سے تھیں۔

اور یہ کہ پیغمبر اسلام کی پھوپھی عاتکہ بنت عبدالمطلب بنی مخزوم ہی کے ایک فرد ابو امیہ بن مغیرہ یعنی خالد بن ولید کے سگے چچا سے بیاہی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ خود پیغمبر اسلام کی ازواج مطہرات میں سے حضرت ام سلمہ اور خالد بن ولید کی سگی خالہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا بنی مخزوم ہی سے تھیں۔

ہر چند بنی مخزوم نے اسلام اور مسلمانوں کی دل کھول کر مخالفت کی تاہم ان میں کچھ خوش نصیب مسلمان ایسے بھی نکل آئے جن کا نام خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے "سابقون الاولین" کی فہرست میں شامل ہو گیا ہے۔ ان میں سے حضرت ابو سلمہ بن عبدالاسد اور حضرت ارقم بن ابی ارقم کا نام خاص کر قابل ذکر ہے۔ اوّل الذکر ابتدا ہی میں اسلام لے آئے اور انھوں نے حضورؐ کے حکم پر پہلے حبشہ کی طرف ہجرت بھی کی۔ پھر اس کے بعد مکّے سے دوسری مرتبہ ہجرت کر کے مدینے آ گئے۔ مؤخر الذکر کے بارے میں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ مکّے میں جہاں آپ رہتے تھے وہ مقام مسلمانوں کی پہلی مسجد بننے کا شرف رکھتا ہے۔

ولادت

خالد بن ولید کے سن ولادت سے متعلق مورخین میں اختلاف ہے۔ قیاس ہے کہ وہ سیدنا عمر فاروقؓ کے بچپن میں اُن کے ساتھ کھیلتے کودتے تھے۔ اور ایک مرتبہ ہنسی مذاق میں اُنھوں نے حضرت عمرؓ کی پنڈلی توڑ دی تھی اس لیے ضرور ہے کہ وہ اُن کے ہم عصر ہوں گے۔

ظہور اسلام کے وقت حضرت عمرؓ ستائیس۲۷ برس کے تھے۔ لہٰذا حضرت خالد بن ولید بھی اس لحاظ سے کچھ اتنے ہی یا اس سے کچھ زیادہ یا کم عمر کے ہوں گے۔ اگر یہ بات مان لی جائے کہ دونوں ہم عمر تھے تو اس حساب سے حضرت خالدؓ بن ولید کا سن ولادت ۵۸۲ء یعنی پیغمبرِ اسلام کے سن ولادت سے بارہ سال بعد کا عرصہ قرار پاتا ہے۔

خالدؓ کے والد کا نام ولید اور کنیت عبدالشمس تھی۔ وہ مغیرہ مخزومی کا بیٹا تھا، جو اہل قریش میں صائب الرائے، فصیح البیان خطیب اور صاحبِ فہم و فراست خردخیال کیا جاتا تھا۔ اُس کی فضیلت علمی کے باب میں اتنا کہنا کافی ہے کہ ظہورِ اسلام سے پہلے ہی اُس نے شراب پینا چھوڑ دیا تھا اور یہی وہ پہلا شخص ہے جس نے چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا تجویز کی جس کی بعد میں اسلام نے بھی توثیق ثبت کر دی۔ اس کی شخصی عظمت کے باب میں صرف اتنا کہنا بس ہے کہ وہ "عدل قریش" کے نام

سے پکارا جاتا تھا۔ خانہ کعبہ کا غلاف جو قریش کے نزدیک بڑی عظمت رکھتا تھا۔ ایک سال صرف وہی اکیلا خانہ کعبہ پر غلاف آویزی کرتا اور دوسرے سال تمام قریش مل کر غلاف آویزی کی سعادت حاصل کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ولید بن مغیرہ مخزومی حج کے دنوں میں منیٰ کے مقام پر تمام حاجیوں کو کھانا بھی کھلایا کرتا تھا۔ نیز یہ کہ کوئی شخص خانہ کعبہ میں جوتیاں پہن کر داخل نہ ہو، اُس کی قائم کی ہوئی پاکیزہ رسم ہے۔

ولید بن مغیرہ اپنے عقائد میں چونکہ بے حد پختہ تھا اس لیے جب پیغمبرِ اسلام نے توحید کی دعوت دینا شروع کیا تو اس نے خوب ڈٹ کر مخالفت کی۔ لیکن ایک مرتبہ جب قرآن حکیم سننے کا موقع ملا تو اُس کا دل بے ساختہ پکار اُٹھا کہ یہ ضرور آسمانی کلام ہے، انسانی کلام ہرگز نہیں مگر افسوس ولید بن مغیرہ کو چونکہ قریش میں بڑی اہمیت حاصل تھی، اس لیے وہ اس جھوٹے وقار اور سرداری کو قائم رکھنے اور غرور و تکبر کا شکار ہونے کے سبب اسلام قبول کرنے کی سعادت سے مرتے دم تک محروم رہا۔

خالدؓ بن ولید کے بھائی کتنے تھے؟ اس سے متعلق بھی مورخین میں اختلاف ہے۔ کوئی کہتا ہے دس تھے، کوئی کہتا ہے تیرہ۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ سات بھائی تھے، جن میں سے ہشام بن ولید اپنے بھائی خالد بن ولید سے پہلے مسلمان ہوئے اور آخر تک ثابت قدم رہے۔ ایک بھائی ولید تھے، جن پر قریش اور ان کے خود اپنے سگے بھائیوں نے اسلام قبول کرنے کی پاداش میں سخت ظلم و ستم ڈھائے۔ اور وہ اپنے بھائیوں میں سب سے پہلے مسلمان ہوئے۔ پیغمبرِ اسلام

کو ان سے بے حد محبت تھی اور ان کے لیے دُعا مانگا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ خالد بن ولید اپنے انہی بھائی ولید بن ولید کی کوششوں سے مسلمان ہوئے۔ ان کے باقی جو چار بھائی تھے وہ بھی اسلام لانے کی سعادت سے کچھ محروم گئے اور کچھ محروم رہے۔

خالدؓ بن ولید کی والدہ کا نام لبابتہ الصغریٰ تھا اُن کے اسلام لانے کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ صاحبِ کتاب الاصابہ انھیں مسلمان بتاتے ہیں۔ اور دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ وہ سیّدنا عمر فاروقؓ کے زمانے تک حیات رہیں۔ لیکن ابنِ حجر ان کا اسلام لانا تسلیم نہیں کرتے۔ اب اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ مسلمان تھیں کہ نہیں؟

لبابتہ الصغریٰ جو اپنے شوہر ولید بن مغیرہ کی ہم نسب تھیں، معلوم نہیں اپنی بہنوں میں سب سے بڑی تھیں کہ چھوٹی۔ لبابتہ الصغریٰ سمیت یہ کل نو بہنیں تھیں، جن میں سے ایک میمونہؓ زوجہ رسولؐ تھیں۔ دوسری ام الفضل لبابتہ الکبریٰ زوجہ عم رسولؐ سیّدنا عباس بن عبد المطلب تیسری عصما بنت حارث زوجہ ابی ابن خلف الجمی ان کے بطن سے صحابی رسولؐ، جناب ابان پیدا ہوئے۔ چوتھی عزہ بنت حارث زوجہ زیاد بن عبد اللہ بن مالک الہلالی پانچویں اسماء بنت عمیس (یہ باپ کی طرف سے سوتیلی بہن تھیں) یہ سب سے پہلے سیدنا علی ابن ابی طالب کے بھائی سیّدنا جعفر ابن ابی طالب کے نکاح میں آئیں۔ ان کے بعد سیّدنا ابو بکر صدیقؓ کے عقد میں۔ اور پھر آخر میں وہ سیّدنا علی ابن ابی طالب کی زوجیت میں

آگئیں۔ چھٹی ہزیلہ بنت حارث یہ کسی اعرابی سے بیاہی گئیں۔ یہ اکثر اپنی بہن میمونہ زوجۂ رسول ؐ کو گھی، مکھن اور پنیر بھیجا کرتی تھیں۔ ساتویں سلمیٰ بنت عمیس یہ بھی سوتیلی بہن تھیں۔ یہ پہلے سیدنا حمزہ بن عبدالمطلب سے بیاہی گئیں۔ ان کی شہادت کے بعد شداد بن اسامہ بن ہادا اللیثی کے عقد میں آگئیں۔ آٹھویں سلامہ بنت عمیس یہ بھی سوتیلی بہن تھیں۔ یہ عبداللہ بن کعب منبہ خثعمی سے بیاہی گئیں۔ مختصراً یہ کہ خالد رضؓ بن ولید کی والدہ لبابۃ الصغریٰ بنت حارث اپنے سمیت کل نو بہنیں تھیں جن میں سے چھ تو ان کی سگی بہنیں تھیں اور باقی دو باپ کی طرف سے سوتیلی تھیں ان میں سے ایک دو کے سوا جن کے اسلام لانے سے متعلق مورخین میں اختلاف ہے۔ باقی سب کی سب اسلام لانے کی سعادت سے مشرف ہوئیں۔ سب سے بڑھ کر میمونہ کو یہ اعزاز نصیب ہوا کہ وہ زوجۂ رسول کہلائیں۔

پرورش و تربیت

خالد رضؓ بن ولید ایک ایسے امیر کبیر باپ کے بیٹے تھے جس کے مکے سے طائف تک بے شمار باغات تھے اور روپے پیسے کی کسی طرح کمی نہیں تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں خالد نے شاہانہ انداز میں پرورش و تربیت پائی۔ وہ عام طور پر امرا کے لاڈلے بیٹوں کی طرح گھوڑے کی سواری اور گھوڑ دوڑ وغیرہ دلچسپ مشغلوں میں لگے رہتے تھے۔ اور چونکہ وہ قریش[1] کے بنی مخزوم ایسے ایک مشہور خاندان سے

---

[1] حضرت عیاش بن ابی ربیعہ عمرو بن ذی الرمحین بن المغیرہ مخزومی۔ حضرت خالد بن ولید المغیرہ کے چچا کے بیٹے ہیں۔ حضرت عیاش بن ربیعہ اور ابوجہل بن ہشام، ان دونوں کی ماں ایک ہے۔ ابوجہل اپنے ماں جائے بھائی حضرت عیاش کو بڑی تکلیفیں دیتا تھا۔

تھے، جسے قریش کی طرف سے فوجی کیمپ کا انتظام اور فوجوں کی سپہ سالاری کرنے کی خدمت سونپی گئی تھی۔ لہٰذا جب خالدؓ بن ولید جوان ہوتے تو ان کے قبیلے بنی مخزوم نے یہ خدمت انہی کو تفویض کی۔ واضح رہے کہ خالدؓ بن ولید کے باپ ولید نے ہجرت نبوی کے تین مہینے بعد پچانوے برس کی عمر میں انتقال کیا۔ اب قیاس کر لیجیے کہ خالد بن ولید کو اپنے باپ ہی کی زندگی میں یہ منصب جو حاصل ہوا تو اس وقت ان کی عمر کیا ہو گی۔

خالدؓ بن ولید فنون حرب میں لاجواب تھے۔ سارے عرب میں کوئی ان کے پائے کا سپہ سالار اور تلوار کا دھنی نہیں تھا اور یہ نتیجہ تھا ایک ایسے قبیلے میں پیدا ہونے کا جو شجاعت و قوت اور وجاہت و عزت میں اپنی مثال آپ تھا اور یہ اثر تھا ایسے والدین کی تربیت و پرورش کا جو عقلمندی، بہادری اور فنونِ حرب سے واقفیت میں عرب کے تمام قبیلوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

قریش کے ایک مشہور قبیلے بنی مخزوم کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے خالدؓ بن ولید کے ہاتھ میں قبہ اور اعنہ کا کام تھا یعنی فوجوں کے خیمے لگوانے اور سپہ سالاری کرنے کی خدمت خالد بن ولید کو سونپی گئی۔ دستور یہ تھا کہ اہلِ قریش جنگ کے لیے جتنا سامان اکٹھا کرتے وہ سب کا سب انہی کی تحویل میں رہتا تھا۔ اس کے علاوہ جنگی گھوڑوں کا معائنہ اور ان کی دیکھ بھال بھی انہی کو کرنی پڑتی تھی۔

اب رہی بات کمانے دھمانے کی یعنی ان کا ذریعۂ معاش کیا تھا تو جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ ایک ایسے امیر کبیر باپ کے بیٹے تھے جس نے اپنی اولاد کے لیے اس قدر مال و دولت چھوڑا تھا کہ زندگی بھر اسے کوئی تجارت یا

ببیشہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ ہاں البتہ یہ قیاس ضرور کیا جا سکتا ہے کہ جیسے دیگر معززین قریش اپنے ملازموں کو تجارتی سفر پر بھیج کر گھر بیٹھے کاروبار کیا کرتے تھے، ایسے ہی خالد بن ولید بھی تجارت کرتے ہوں گے۔ رہی بات ادھر اُدھر آنے جانے اور سفر کرنے کی تو خالد بن ولید نے اس غرض کے لیے مکہ سے باہر کبھی قدم نہیں رکھا۔ عام طور پر یہ کام اُن کے ملازموں کے ذمے تھے جن کو وہ ہر مہینے معقول تنخواہیں دیتے تھے۔

اب آخر میں خالد بن ولید کی جنگی مہارت کے بارے میں اتنی بات اور جان لیجیے کہ وہ قدرت ہی کی طرف سے جنگی دل و دماغ لے کر آئے تھے۔ ورنہ فنونِ حربیہ کے سلسلے میں وہ کسی کی تربیت کے محتاج نہیں ہوئے۔ انھوں نے اگر کہیں تربیت پائی ہے تو وہ صرف جنگ کے میدان میں، جہاں وہ اپنے باپ کے شانہ بشانہ کھڑے ہو کر دادِ شجاعت دیا کرتے تھے۔ اور یہ اسی تربیت کا اثر تھا کہ خالد بن ولید نہایت دلیر، بہادر اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لڑنے والے نڈر سپاہی بن گئے۔

اسلام دشمنی

ابتداء میں خالد بن ولید بھی اسلام کے اتنے ہی دشمن تھے کہ جتنے دوسرے سردارانِ قریش مخالف تھے۔ اور یہ اس بات کا نتیجہ تھا کہ جب مسلمانانِ مدینہ اور مشرکینِ مکہ کے درمیان لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا، تو خالد بن ولید کی بھی پوری کوشش یہی ہوتی تھی کہ مدینہ پر بڑا بھاری حملہ کر کے اسلام اور مسلمانوں کو یکسر

مٹادیا جائے تاکہ انھیں دنیا میں پنپنے کا کبھی موقع نہ مل سکے۔

جنگِ اُحد جس میں پہلے پہل میدانِ جنگ مسلمانوں نے سر کر لیا تھا۔ خالد بن ولید ہی کے مسلمانوں پر اچانک حملہ کرنے سے اُن کی فتح شکست میں بدلا۔ اگر اُن مسلمانوں نے اپنی جگہ سے ہلنے میں تھوڑی دیر اور تامل کیا ہوتا جنھیں پیغمبر اسلام نے تا حکم ثانی کھڑے رہنے کی تاکید فرمائی تھی تو جنگِ بدر کے بعد جنگِ احد سے کفار مکہ کی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کمر ٹوٹ جاتی اور وہ پھر کبھی مسلمانوں پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کر سکتے۔

اس موقع پر خالد بن ولید نے چند بے سمجھ مسلمانوں کی اسی غلطی سے فائدہ اٹھایا یعنی عین اُس وقت جب مسلمان مالِ غنیمت لوٹ رہے تھے پیغمبر اسلام کے مقررہ تیر اندازوں کو اپنے مقام پر ایستادہ نہ پاکر مسلمانوں پر ہلّہ بول دیا اور اس طرح سے جنگ کا خالد بن ولید کی دور اندیشی، جنگی چال اور تدبر سے پانسہ پلٹ گیا۔

جنگِ اُحد سے ایک مدت بعد جب جنگِ خندق کا واقعہ پیش آیا تو اس موقع پر بھی خالد بن ولید اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے میں پیش پیش تھے وہ خندق کے کنارے کنارے تمام دن گشت کرتے رہے جس سے انھیں یہ معلوم ہو سکے کہ آیا خندق کا کوئی حصہ کہیں سے ایسا کمزور بھی ہے کہ جہاں سے مسلمانوں پر آسانی سے حملہ کیا جا سکے۔

ہر چند مسلمانوں کی دانشمندی اور غیر معمولی بہادری کے باعث خالد بن ولید کو خندق پار کرنے کا موقع نہ مل سکا تاہم وہ تیروں کی بوچھاڑ کے باوجود

خندق پار کرنے کی برابر کوشش کرتے رہے۔ اگر خدانخواستہ مسلمانوں کو خالد بن ولید کے ارادے کا علم نہ ہوتا اور وہ اُن پر تیروں کی بوچھاڑ نہ کرتے تو وہ ضرور خندق پار کر جاتے اور مسلمانوں کے لیئے سخت نازک صورت حال پیدا ہو جاتی۔

جنگِ خندق میں جب مسلمانوں کی تیغ خار اشگاف سے لشکر کفار میں بھگدڑ مچی تو اس وقت خالد بن ولید اور عمرو بن عاص یہ دو افراد ہی ایسے تھے کہ جن پر کفار بھروسہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ یہ دونوں بھاگتے ہوئے لشکر کے پیچھے پیچھے رہے تاکہ وہ کسی غیر متوقع خطرے کی صورت کا مقابلہ کر سکیں اور مسلمانوں کے حملے سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکیں۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر جب پیغمبرِ اسلام حضور محمد رسول اللہ نے کعبۃ اللہ کے طواف کا قصد فرمایا اور کفارِ مکہ کو حضورؐ کی آمد کا علم ہوا تو انھوں نے مزید تحقیقات کے لیے خالد بن ولید ہی کو مقرر کیا چنانچہ خالد بن ولید اپنے ساتھ دو سو سوار لے کر چل پڑے اور کراع الغمیم کے مقام پر پہنچ کر اُن کی پیغمبرِ اسلام کے قافلے سے مڈبھیڑ ہوئی۔

خالد بن ولید نے چاہا کہ جب مسلمان ادائے نماز میں مشغول ہوں اُن پر چپکے سے حملہ کر دیا جائے مگر پیغمبرِ اسلام کو اُن کے ارادے کا پتہ چل گیا اور انھوں نے "صلوٰۃ خوف" ادا کرنے کا حکم فرمایا یعنی باری باری ایک ایک دستہ نماز پڑھے اور ایک دستہ اُن کی حفاظت کے لیے پہرہ دے تاکہ دشمن موقع پا کر مسلمانوں پر حملہ نہ کر سکے۔ اس موقع پر اگر کفارِ مکہ صلح کرنے پر تیار نہ ہوتے تو یقین کیجیے کفارِ مکہ کی جنگی تاریخ میں خالد بن ولید کا نام بھی

نمایاں ہوتا۔

خالد بن ولید کو اسلام اور مسلمانوں سے جس قدر نفرت اور دشمنی تھی اس کا اندازہ کچھ اس واقعہ سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جب صلح حدیبیہ کے واقعہ کے ایک سال بعد کیے گئے معاہدے کے مطابق حضور پیغمبر اسلام عمرۃ القضا کرنے کے لیے مکے میں داخل ہوئے تو خالد بن ولید مکے سے باہر چلے گئے کیونکہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے وجود کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

قبولِ اسلام

اگرچہ حضرت خالد بن ولید کے اسلام لانے سے متعلق مختلف روایات ہیں۔ تاہم اُن سب سنین میں صحیح ۸ ہجری ہے جس میں آپ مشرف بہ اسلام ہوئے۔
حضرت خالد رضؓ بن ولید نے اسلام کیسے قبول کیا اس کا سبب انہی کی زبانی سنیے۔ فرماتے ہیں جب اللہ تعالیٰ نے مجھ پر اپنا فضل وکرم کرنا چاہا تو اُس نے میرے دل میں اسلام کی طرف لگاؤ پیدا کر دیا اور مجھے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بخشی۔

میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ میں پیغمبرِ اسلام کے خلاف ہر جنگ میں شامل ہوا، لیکن ہر محاذ پر ناکامی ہوئی۔ اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے کی کوشش میں نہ میں کبھی کامیاب ہوسکا اور نہ کسی اور کو کامیابی ہوئی۔ آخر کار آہستہ آہستہ میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ میں جس راستے پر چل رہا ہوں وہ یقیناً غلط ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ کوئی غیبی طاقت اپنے زور و قوت سے میرے دل میں محمدؐ کے لیے جگہ پیدا کر رہی ہے۔

جب حضورؐ پیغمبرِ اسلام عمرۃ القضاء کے لیے مکے میں داخل ہوئے تو میں وہاں سے نکل چکا تھا۔ میرے بھائی ولید جو مسلمان ہو چکے تھے اور پیغمبرِ اسلام کے ہمراہ تھے اُن کی معرفت سے مجھے حضورؐ نے یاد فرمایا مگر میں کہاں تھا اس

پر میرے بھائی نے مجھے ایک خط بھیجا جس میں لکھا تھا کہ مجھے تعجب ہے تم اسلام سے اس قدر نفرت کیوں کرتے ہو، حالانکہ تمھارے ایسا عقلمند آدمی کبھی اسلام سے دُور نہیں رہ سکتا۔ رسولِ خدا نے مجھ سے تمھارے بارے میں دریافت فرمایا اور پوچھا کہ خالد کہاں ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ خالدؓ کو اللہ تعالیٰ ہی لائے تو لائے حضورؐ نے فرمایا: خالد ایسا شخص اسلام کی حقیقت سے کچھ ناواقف نہیں رہ سکتا۔ اگر وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر مشرکوں اور کافروں سے لڑتے تو یہ اُن کے لیے بہت ہی اچھا ہوتا۔

اے بھائی (خالد) تم بہت دنوں سے گمراہی میں گرفتار چلے آرہے ہو اب حقیقت کو پہچاننے کی کوشش کرو تاکہ سیدھی راہ پر آجاؤ اور گمراہی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے سے نکل کر حق کے نور کی روشنی میں چلے آؤ۔

بھائی کا یہ خط پڑھ کر میرے دل پر بے حد اثر ہوا جس سے مجھے اسلام سے رغبت ہوگئی۔ سب سے زیادہ خوشی مجھے اُس بات سے ہوئی جو پیغمبرِ اسلام حضور محمد رسول اللہ نے میرے بارے میں میرے بھائی سے کہی۔ آخر کار میں نے پختہ ارادہ کرلیا کہ میں مکہ سے نکل کر مدینے پہنچوں گا اور حضورؐ کے قدموں پر سر رکھ کر دل و جان سے اسلام قبول کرلوں گا۔

خالد بن ولید کہتے ہیں کہ جب میں عازمِ مدینہ ہوکر مکے سے نکلا، تو راستے میں مجھے ایک شخص صفوان بن امیہ ملا۔ میں نے اس سے کہا اے ابو وہب! تم دیکھتے ہو کہ محمدؐ عرب و عجم پر غالب آگئے ہیں۔ اگر ہم اُن کے پاس جا کر اسلام قبول کرلیں تو اُس حقے میں ہم بھی شریک ہوجائیں گے جو انھیں ملنے

والا ہے۔ صفوان بولا۔ اگر تمام دنیا بھی اسلام قبول کرلے اور میرے سوا دُنیا کا ہر شخص بھی مسلمان ہوجائے تو سمجھ لو میں اس وقت بھی اسلام قبول نہیں کرسکتا۔

تب میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ شخص مجبور ہے کیونکہ اس کا باپ اور بھائی میدانِ جنگ میں مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ اس کے بعد میں ابوجہل کے بیٹے عکرمہ سے ملا۔ اُس سے بھی یہی بات کہی۔ اُس نے بھی وہی جواب دیا۔ اب میں نے اُسے ان باتوں کا کسی سے ذکر نہ کرنے کی تلقین کرکے عثمان بن طلحہ سے ملاقات کی۔ اس کا باپ طلحہ، چچا عثمان اور چار بھائی مسافع، جلاس، حارس اور کلاب۔ چونکہ مسلمانوں کا مقابلہ کرتے ہوئے جنگِ اُحد میں مارے گئے۔ اس لیے میں نے اس سے مل کر پہلے ارادہ بدل دیا کہ اُسے اسلام کی تلقین کروں مگر تھوڑی دیر بعد طبیعت سے بے قابو ہو کر میں نے اس سے بھی کہہ ہی ڈالا کہ تم اسلام کیوں قبول نہیں کر لیتے۔ تمھیں اس میں کیا خرابی نظر آتی ہے؟ اس پر عثمان بن طلحہ میری توقع کے خلاف بول اُٹھا اور فوراً قبولِ اسلام پر آمادہ ہوگیا اب دونوں میں یہ طے پایا کہ اگلے روز صبح سویرے، سورج نکلنے سے پہلے پہلے دونوں مدینہ کی طرف چل پڑیں چنانچہ میں اور عثمان دوسرے روز مقررہ وقت پر مکّے سے مدینے کو چل دیے۔

جب ہم ہدہ" کے مقام پر پہنچے تو ہمیں راستے میں عمرو بن عاص ملے جو حبشہ سے چلے آرہے تھے اُنھوں نے مجھ سے پوچھا، اے ابوسلیمان! کدھر کا رُخ ہے؟ میں نے جواب دیا۔ بخدا میرا دل گواہی دیتا ہے کہ محمدؐ اللہ کے رسولؐ ہیں اور اب میں اسلام لانے کے لیے مدینے جا رہا ہوں۔ اس پر

عمرو بن عاص بولے میں بھی اسلام قبول کرنے ہی کی غرض سے حبشہ سے آرہا ہوں۔
چنانچہ ہم سب اکٹھے ہوکر مدینے کی طرف چل پڑے۔

اس دوران میں رسول اللہ کو ہمارے مدینے پہنچنے کی خبر مل چکی تھی۔ آپ بہت خوش ہوئے اور مسلمانوں سے فرمایا مکّے نے تمھارے سامنے اپنے جگر کے ٹکڑے ڈال دیے ہیں۔ میں نے حضورؐ کی خدمت میں پہنچنے کے لیے نئے کپڑے پہنے اور چل پڑا۔ راستے میں مجھے میرے بھائی ملے وہ کہنے لگے۔ جلدی چلو۔ رسولِ خدا تمھارے آنے سے بے حد خوش ہیں۔ چنانچہ ہم دونوں بھائی جلدی جلدی قدم اُٹھاتے ہوئے حضورؐ پیغمبرِ اسلام علیہ السّلام کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور سلام عرض کیا۔ حضور نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ سلام کا جواب دیا۔ میں نے عرض کیا۔ حضورؐ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور آپؐ اللہ کے برحق رسولؐ ہیں۔ رسولِ خدا نے فرمایا۔ الحمدللہ، کہ تم سیدھی راہ پر آگئے۔ اس کا شکر ہے کہ اُس نے تمھیں ہدایت فرمائی۔ مجھے یہی امید تھی کہ تم ضرور سیدھے راستے پر آجاؤ گے۔ میں نے پھر عرض کیا یا رسولؐ اللہ! میں آپ کے خلاف کئی جنگیں لڑ چکا ہوں۔ آپؐ اللہ تعالیٰ سے میرے اس گناہ کی معافی کے لیے دُعا فرمائیں۔ حضورؐ نے فرمایا: اسلام پچھلے گناہوں کو مٹا دیتا ہے اور تمام دھبّوں کو دھو ڈالتا ہے۔ اس کے بعد حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے میرے لیے دُعا فرمائی۔

میرے مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد پھر عمرو بن عاص اور عثمان بن طلحہ آگے بڑھے اور انھوں نے بھی اسلام قبول کیا اور حضورؐ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی سعادت پائی۔ یہ حقیقت ہے کہ کلمہ توحید کے دل و جان سے ادا کرنے کے بعد حضورؐ نے

میرے اور اپنے دیگر صحابہؓ کے درمیان پھر کبھی کوئی فرق نہیں کیا بلکہ مجھے بھی ہمیشہ ہر موقع و معاملے میں شریک فرماتے اس کے علاوہ حارث بن نعمان نے حضور علیہ السلام کو جو مکان پیش کیے تھے حضورؐ نے اُن مکانوں میں سے ایک مکان مجھے عنایت فرمایا۔

حضرت خالد بن ولید کے اس بیان کی روشنی میں اب یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ وہ کسی خوف یا لالچ کے سبب مسلمان نہیں ہوتے تھے، بلکہ اس کی وجہ صرف اُن کے ضمیر کا جاگنا اور شعور و آگہی کا پانا تھا۔ اس سلسلے میں حضرت خالدؓ بن ولید نے برس ہا برس اسلام اور مسلمانوں کے خیالات و حالات کا مطالعہ کیا جس کے نتیجے میں انھیں ضمیر کی بیداری اور علمی شعور کی دولت حاصل ہوگئی اور وہ ڈنکے چوٹ مسلمان ہو گئے اور پھر ایسے راسخ العقیدہ ہوئے کہ سینکڑوں بھٹکے ہوئے لوگوں کو دین پر از سر نو قائم کر دیا۔

اب رہی یہ بات کہ خالد بن ولید ایسے فرزانہ و یگانہ صاحب فراست شخص اسلام میں اس قدر تاخیر سے کیوں داخل ہوئے۔ اس کے جواب میں یوں تو بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ مگر مختصراً اتنا سمجھ لیجیے کہ اسلام نے انسانیت کو اس کا صحیح مقام دلانے کیلئے فضائل سہ گانہ یعنی، حریت، اخوت اور مساوات کا جو نعرہ بلند کیا تھا وہ خالدؓ بن ولید ایسے رئیس مکہ اور سرداران قریش کی نظر میں کھٹکتا تھا اور چونکہ ابھی اس پر تجربہ نہیں ہوا تھا اس لیے ایک خالد بن ولید کیا سبھی سرداران قریش ڈرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر اسلام کے فضائل سہ گانہ زندگی پر اثر انداز ہو گئے تو ہماری قبائلی عظمت اور نسلی وقار خاک میں مل جائے گا۔ علاوہ ازیں یہ بھی کہا جا

سکتا ہے کہ جنگ بدر میں چونکہ خالد بن ولید کے چچا اور چچیرے بھائی مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ چونکہ ایک عرصے تک اُن کا زخم مندمل نہ ہو سکا اس لیے وہ جلد اسلام نہ لا سکے۔ مگر جب دل سے یہ کدورت مٹ گئی اور خیال جاتا رہا، وہ مسلمان ہو گئے۔ حتیٰ کہ عکرمہ بن ابی جہل کو بے حد تعجب ہوا۔ اور کہا اے ابو سلمان تم مسلمان ہو گئے، تعجب! قدرت خدا کہ حضرت خالد بن ولید پر تعجب کرنے والے یہ عکرمہ، جو اسلام کے مشہور دشمن اور قریش کے نامی گرامی سردار ابو جہل کے بیٹے تھے۔ توفیق الٰہی پا کر خود بھی مسلمان ہو گئے۔

خدمات

حضور پیغمبر اسلام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ملاء اعلیٰ کو تشریف لے جانے کے بعد جب سیدنا ابوبکر صدیقؓ مسند خلافت پر بیٹھے تو نئے نئے مسلمان ہونے والے قبائل نے جنھیں صرف اسلام کا غلبہ و اقتدار دیکھ کر اسلام میں داخل ہونے کی تحریص ہوئی تھی مگر ذات رسالتمآب پیغمبر اسلام کو بابرکت صحبت میں رہنے کا موقع میسر نہیں آیا تھا۔ وہ اپنی دانست میں اسلام کو کمزور پاکر اس سے پھر گئے، زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا اور صرف یہی نہیں بلکہ انھوں نے مدینۃ النبی پر حملہ کرنے کی بھی ٹھان لی۔ اب یہ ایک ایسا نازک موقع تھا جس میں ایک طرف باغی اور مرتد لوگوں نے آفت برپا کی ہوئی تھی اور دوسری طرف ایسے لوگوں کا زور بڑھ رہا تھا جو نبوت کے جھوٹے مدعی بنے بیٹھے تھے۔ سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے اس پُر کٹھن ساعت میں کمال ہمت اور استقامت سے کام لیا۔ اور آپ کی نگہ انتخاب نے منکرین زکوٰۃ اور مرتدین اسلام کی سرکوبی کے لیے جہاں دیگر اولوالعزم صحابہؓ رسولؐ کو مقرر کیا۔ ان میں ایک حضرت خالدؓ بن ولید، سیف اللہ کا نام بھی سرفہرست تھا۔

حضرت خالدؓ بن ولید سب سے پہلے طلیحہ کی سرکوبی کے لیے بھیجے گئے جس نے حجۃ الوداع کے بعد حضور پیغمبر اسلام کو بستر علالت پر دیکھ کر اپنی نبوت کا دعویٰ

کر دیا تھا مقصود اس سے یہ تھا کہ نبوت کے زور سے ایک دنیا سمٹ کر اس کے قدموں میں آجائے اور اسے بھی وہ شان و شوکت نصیب ہو جائے، جو بڑے بڑے بادشاہوں کو بھی نہیں ہوتی ہے۔ خالدؓ بن ولید نے اول اسے اور اس کے مددگار قبیلوں کو سمجھانے بجھانے کی سعی کی۔ لیکن جب اس سے کام نہ چلا تو بزاخہ کے مقام پر طلیحہ سے جنگ کی جس میں اُسے شکست فاش ہوئی اور وہ میدانِ جنگ سے بھاگ نکلا اور شام پہنچ گیا۔ بنی اسد جس نے اس کی مدد کی تھی، اطاعت قبول کرنے پر اُسے معاف کر دیا گیا۔

طلیحہ کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد خالدؓ بن ولید نے بنی تمیم کا رُخ کیا، جس میں بنی یربوع کے خاندان کی ایک عورت سجاح نبوت کا دعویٰ رکھتی تھی اور اس کا سردار مالک بن نویرہ تھا۔ اگرچہ بنی تمیم کے لوگ ایک ایک کر کے سب کے سب نئے سرے سے اسلام کے اطاعت گزار بن گئے۔ لیکن بنی یربوع بدستور مرتد رہے۔ آخر کار حضرت خالدؓ بن کو اُن سے بھی مجبوراً جنگ کرنی پڑی تھا۔ بنی یربوع نے شکست کھائی اور میدانِ جنگ سے بھاگ نکلے مگر حضرت خالد بن ولید نے اُن کا پیچھا کیا اور گرفتار کر لیا۔ ان قیدیوں میں قبیلے کا سردار مالک بن نویرہ بھی تھا جس کے مسلمان ہونے کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اسے خالد بن ولید کے حکم سے، جناب ضرار بن ازدر نے قتل کیا، مگر بعض کہتے تھے کہ نویرہ بن مالک نے اسلام کی اطاعت اختیار کر لی تھی اور حضرت خالد بن ولید کے ایک حکم کا مطلب سمجھنے میں ضرار بن ازدر نے غلطی کھائی اور اس کے نتیجے میں مالک بن نویرہ قتل ہو گیا۔ اور معاملے نے اس قدر طول پکڑا کہ خالد

پیش کرنے کے لیے مدینے بلا لیے گئے۔ سیدنا عمر فاروقؓ نے اعتراض اُٹھایا کہ مالک بن نویرہ کو باوجود مُسلمان ہو جانے کے کیوں قتل کیا گیا؟ حضرت خالدؓ بن ولید نے واقعہ کی نوعیت بلا کم وکاست بیان کی کہ خود مجاہدین ہی میں اس بات پر اختلاف پیدا ہو گیا تھا کہ مالک بن نویرہ نے آذان دی کہ نہیں دی (آذان دینا اُن لوگوں کے لیے اطاعت گزار ہو جانے کی علامت قرار دیا گیا تھا جو دین سے پھر گئے تھے اور خلافت صدیقی میں انھیں اسلام میں نئے سرے سے پھر داخل ہونے کا موقع دیا گیا تھا) بعض کہتے تھے کہ ہم نے آذان سنی ہے۔ ان میں ابو قتادہ کا بیان سرِ فہرست ہے اور بعض کہتے تھے کہ ہم نے اذان نہیں سنی۔ اسی حال میں جب مرتدین و منکرین مسلمانوں سے جنگ و قتال کرنے کے بعد گرفتار ہوئے تھے تو انھیں یہ حکم دیا گیا کہ اپنے قیدیوں کو گرمی پہنچاؤ، لیکن وہ اس کا مطلب غلط سمجھے اور بجائے اس کے قیدیوں کو قتل کر دیا، جن میں ایک مالک بن نویرہ بھی تھا۔

واقعہ چونکہ ظنی اور قیاسی نوعیت کا تھا اس لیے سیدنا ابو بکر صدیقؓ نے حضرت خالد بن ولید کو مالک بن نویرہ کے قتل سے بری الذّمہ قرار دے دیا۔ البتہ بعض مصلحتوں کو سامنے رکھتے ہوئے مالک بن نویرہ کا خون بہا ادا کرنے کا حکم فرمایا، جس کی حضرت خالدؓ بن ولید نے تعمیل کی۔

اب خالد بن ولید کو حکم ملا کہ وہ مسیلمہ کذاب کی سرکوبی کریں، جس نے حضورؐ پیغمبرِ اسلام کی حیات مبارکہ ہی میں نبوت کا جھوٹا دعویٰ کر دیا تھا اور حضورؐ کی خدمت میں لکھا تھا کہ آپ مجھے اپنی رسالت و نبوت میں شریک

کرلیں اور نصف حکومت میرے حوالے کردیں حضورؐ کے انتقال کے بعد مسیلمہ کذاب کا فتنہ بے حد زور پکڑ گیا اور بنی حنیفہ کے لوگ اس کے حامی اور مددگار تھے۔

اس سے پہلے حضرت عکرمہ اور حضرت شرجیل کو اس مہم پر بھیجا گیا تھا، لیکن وہ مسیلمہ کذاب پر قابو نہ پا سکے۔ اب خالدؓ بن ولید ایک چھوٹا سا لشکر اسلام لے کر مسیلمہ کذاب کے لشکر جرار سے نبرد آزما ہوئے۔ یمامہ کے مقام پر دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ بڑی ہولناک جنگ شروع ہوئی جس میں دونوں طرف سے بہادروں نے بڑھ بڑھ کر دادِ شجاعت دی۔

ہر چند پہلے پہل دشمنانِ اسلام کا پلہ بھاری رہا۔ مجاہدینِ اسلام پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئے، لیکن جب خالد بن ولید نے اپنی بے مثال سپاہیانہ صلاحیت اور فوجی قیادت سے اسلام کے مجاہدین کو ہمت دلائی تو وہ اس جوش و خروش کے ساتھ آگے بڑھے اور تیغ خارا شگاف کے ایسے جوہر دکھائے کہ جنگ کا نقشہ ہی بدل کے رکھ دیا۔ اب مرتدین شکست کھا کر میدان جنگ سے بھاگ نکلے اور ایک قلعہ میں پہنچ کر پناہ گزین ہو گئے۔ حضرت خالدؓ بن ولید نے ملکہ کا محاصرہ کر لیا جس میں براء بن مالک ایک جیالے مجاہد اسلام نے بڑی شجاعت دکھائی وہ چند ساتھیوں کو لے کر قلعے کی دیوار پر چڑھ گئے۔ اور دشمن کی صفوں کو چیرتے پھاڑتے قلعے کے دروازے تک پہنچ گئے۔ دروازے کا کھلنا تھا کہ دشمن مسلمانوں کے حملے کی تاب نہ لا کر پھر بھاگ کھڑا ہوا۔ سات ہزار آدمی مارے گئے اور بچے کھچے لوگوں نے اسلام کی اطاعت قبول کر لی۔ اس جنگ میں مسلمانوں کا بھی خاصا جانی نقصان ہوا جن میں بیشتر علمائے دین اور حفاظ قرآن بھی تھے۔

فتوحات

مرتدینِ اسلام اور منکرینِ زکوٰۃ سے فراغت پانے کے بعد اب حضرت خالد بن ولید کی اُن فتوحات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جو اسلام کی حفاظت اور مدافعت کے نتیجے میں مسلمانوں کو حاصل ہوئیں۔

عرب و ایران اور شام کی سرحدیں ساتھ ساتھ واقع ہونے کے سبب اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہمیشہ ایک علامتی خطرہ بنی رہتی تھیں۔ قصہ یہ تھا کہ ان سرحدوں پر اکثر عرب نسل کی قومیں آباد تھیں جن پر ایران و روم کا بڑا اثر و نفوذ تھا۔ رومی اور ایرانی انھیں اکثر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اُکساتے رہتے تھے۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضؓ نے ان لوگوں کو مرکزی حکومت کا تابع بنانے کی جب کبھی کوشش کی۔ رومی اور ایرانی ان کی کھلم کھلا مدد کرتے اور اس طرح اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے کی ہمیشہ فکر میں لگے رہتے تھے

مرتدین اسلام اور منکرین زکوٰۃ کے فتنے میں جب رومیوں اور ایرانیوں نے نمایاں حصہ لیا تو سیدنا ابوبکر صدیق رضؓ کے لیے ضروری ہو گیا کہ وہ اُن کا زور توڑنے اور مداخلت بیجا سے باز رکھنے کے لیے ان پر لشکر کشی کریں چنانچہ مرتدین و منکرین کے معاملے سے فراغت پانے کے بعد طے پایا کہ حضرت خالد بن ولید رضؓ عراق پر۔ حضرت ابو عبیدہ ابن الجراح حمص پر۔ زید بن ابی سفیان

دمشق پر۔ شرجیل بن حسنہ اردن پر اور عمرو بن عاص فلسطین پر حملہ کریں تاکہ رومی اور ایرانی، جو اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے کے آئے دن منصوبے اور ارادے قائم کرتے رہتے ہیں وہ ملیامیٹ ہو جائیں۔ اور پھر ایسے حالات میں جبکہ رومی اور ایرانی اسلام کے باغیوں کی پشت پناہی کرتے ہوئے مسلمانوں کے خلاف کھلم کھلا اعلانِ جنگ کر چکے تھے۔ حفاظت خود اختیاری کے پیشِ نظر لازم تھا کہ اسلام کے دشمنوں رومیوں اور ایرانیوں کا قلع قمع کیا جائے۔ اب اگر کوئی مسلمانوں کے اس اقدام کو ملک گیری اور کشور کشائی کے جذبات سے تعبیر کرے تو اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ عقل کا اندھا ہے۔

ایرانیوں اور مسلمانوں کی پہلی باقاعدہ جنگ ایران کی سرحد سے پچاس میل کے فاصلے پر مقام حفیر میں ہوئی جس میں ایرانی سپاہیوں نے جنگ سے فرار کو جانے کے امکانات کو دُور کرنے کے لیے اپنے پاؤں میں لوہے کی بھاری بھاری زنجیریں ڈال رکھی تھیں۔ تاریخ اسلام میں اسی واقعہ کی مناسبت سے یہ جنگ ذات السلاسل کہلاتی ہے۔ ابتداء میں ایک مجاہد مثنیٰ بن حارث شیبانی جن کا قبیلہ ایرانیوں کے زیرِ اثر تھا۔ اپنے قبیلے کے آٹھ ہزار آدمیوں کو اپنے ہمراہ لے کر ایرانیوں کے مقابلے پر صف آرا ہو گئے۔ لیکن ایرانی فوج کی کثرت کے سبب وہ جب اُن کا مقابلہ کرنے میں ناکام رہے تو سیدنا ابو بکر صدیق رضؓ نے اُن کی مدد کے لیے حضرت خالدؓ بن ولید کو بھیج دیا۔ اور حضرت مثنیٰ بن حارث کو اُن کی ماتحتی میں لڑنے کا حکم دیا۔ یہ عراق کی مہم کہی جاتی ہے، جس پر حضرت خالدؓ بن ولید سپہ سالار مقرر کیے گئے۔

مہم پر جانے سے پہلے حضرت خالدؓ بن ولید نے اتمام حجت کے طور پر اُبلہ کے سرحدی حاکم ہرمز کو ایک خط بھیجا جس میں لکھا تھا کہ اگر آپ لوگ سلامتی چاہتے ہیں تو اسلام لے آئیں اور اگر یہ قبول نہیں کرتے تو جزیہ دیں اور اگر یہ بھی منظور نہیں تو سمجھ لیں تمہارے مقابلے میں ایک ایسی قوم آ رہی ہے جو موت سے اتنا ہی پیار کرتی ہے جتنا تم زندگی سے پیار کرتے ہو مگر سرحدی حاکم نے اس خط کا کوئی اثر قبول نہ کیا۔ چنانچہ حضرت خالدؓ بن ولید دس ہزار مجاہدین اسلام کو ساتھ لے کر مہم پر چل دیے۔ عراق پہنچ کر حضرت مثنیٰؓ بن حارثہ سے ملے تو آٹھ ہزار مجاہدینِ اسلام اور مل گئے۔ غرض دشمن کے قریب پہنچ کر حضرت خالد بنؓ ولید نے لشکرِ اسلام کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصے کا سپہ سالار مثنیٰؓ بن حارثہ کو دوسرے حصے کا عدیؓ بن حاتم (یعنی مشہورِ عالم فیاض و سخی حاتم طائی کے بیٹے) کو بنایا اور تیسرے حصے کو اپنی سپہ سالاری میں رکھا۔ اور تینوں حصوں کے لشکروں کے ایک جگہ اکٹھا ہونے کا مقام حفیر مقرر ہوا۔ چنانچہ اب طے شدہ منصوبے کے مطابق لشکرِ اسلام کے تینوں حصے الگ الگ راستوں سے ایک دن کی مسافت کا فاصلہ دے کر حفیر کی طرف بڑھنے شروع ہوئے۔

اسی دوران میں جب ہرمز کو حضرت خالد بن ولید کے آنے کا پتہ چلا تو اُس نے فوراً شہنشاہ ایران اردشیر کو مدد کے لیے لکھ بھیجا اور خود ایک لشکرِ جرار لے کر حفیر کی طرف روانہ ہوا۔ حفیر کا مقام بصرے سے چار میل کے فاصلے پر ہے۔ ہرمز نے حفیر کے مقام پر اپنے لشکر کو ترتیب دیا جس میں سے لشکر کے ایک حصے نے اپنے آپ کو زنجیروں سے جکڑ لیا تاکہ وہ میدانِ جنگ میں جم کر لڑ سکے۔ اس

اثنا میں خالد بن ولیدؓ بھی حفیر کے مقام پر پہنچ گئے اور اُن کے آتے ہی لڑائی شروع ہو گئی۔

لڑائی پورے زور شور سے جاری تھی۔ دونوں طرف کے لوگ بڑھ چڑھ کر بہادری کے جوہر دکھا رہے تھے کہ اتنے میں ہرمز نے اپنے لشکر سے باہر نکل کر حضرت خالدؓ بن ولید کو مبارزت کی دعوت دی جسے خالدؓ بن ولید نے فوراً قبول کر لیا چنانچہ دونوں میں دست بدست لڑائی کا آغاز ہو گیا۔ ہرمز کی نیت یہ تھی کہ حضرت خالد بن ولید جونہی اپنے لشکر سے نکلیں۔ ایرانی بہادروں کی مدد سے گھیرے میں لے کر شہید کر دیے جائیں چنانچہ ہرمز نے اپنے آدمیوں کو اس مقصد کی تاکید بھی کر دی تھی لیکن حضرت خالد بن ولید نے اس سے پہلے کہ ایرانی سورما انھیں گھیرے میں لینے کی کوشش کریں، تلوار کے ایک ہی وار میں ہرمز کا کام تمام کر دیا اور پھر اس کے سورماؤں کو موقع دیے بغیر کہ وہ حملہ کریں کمال جستی اور دانائی سے لشکر میں واپس آ گئے۔

ہرمز کے مارے جانے کے بعد ایرانی فوج کے حوصلے بالکل پست ہو گئے۔ یہاں تک کہ وہ میدان جنگ سے بھاگ نکلے۔ حضرت خالد بن ولیدؓ نے ان کے تعاقب میں مثنیٰ بن حارثہ کو روانہ کیا اور معقل بن مقرن کو ابلہ بھیجا۔ جہاں انھوں نے غنیمت کا مال سمیٹا اور قیدی اکٹھے کیے۔ حضرت خالد بن ولید نے مال غنیمت کا پانچواں حصہ فتح کی خوشخبری کے ساتھ سیدنا ابوبکر صدیقؓ کی خدمت میں بھیج دیا۔ اور ہرمز کی وہ ٹوپی بھی بھجوا دی جس کی قیمت ایک لاکھ تھی اور جواہرات سے مزین بھی مگر سیدنا ابوبکر صدیق نے یہ ٹوپی حضرت خالد بن ولید ہی کو مرحمت

زادی۔

حنیر کے بعد پھر ایرانیوں اور مسلمانوں کے درمیان دلجہ کے مقام پر جنگ ہوئی۔ اس مرتبہ مسلمانوں کی پیش قدمی روکنے کے لیے ایران سے بڑے بڑے سرداروں پر مشتمل ایک لشکر جرار بھیجا گیا تھا جس کی کمان اندرزغر کے ہاتھ میں تھی۔ حضرت خالد بن ولید کو جب ایرانی لشکر کے آنے کا پتہ چلا تو وہ بھی لشکر لے کر دلجہ کی جانب چل دیے۔ ایرانی لشکر کے قریب پہنچ کر انھوں نے اپنے لشکر کے تین حصے کیے۔ ایک حصے کو تو دشمن کے مقابلے کے لیے رکھا اور دو حصے قریب ہی نشیبی زمین میں چھپا دیے تاکہ ضرورت کے موقع پر ان سے خاطر خواہ کام لیا جا سکے اور ان دو حصوں کی کمان بسر بن ابی رہم اور سعید بن مرہ کو سونپی گئی۔

اب دونوں لشکر صف آرا ہو گئے اور لڑائی شروع ہو گئی۔ گھمسان کا رن پڑا۔ کافی دیر تک لڑائی ہوتی رہی۔ جب خالد بن ولید کو اندازہ ہوا کہ ایرانی فوج مضمحل ہو رہی ہے تو آپ نے کمین گاہوں میں چھپی ہوئی فوج کو فوراً باہر نکل کر حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ تازہ دم فوج نے اس زور شور سے ایرانیوں پر حملہ کیا کہ وہ بوکھلا اٹھے اور ایرانیوں کی ہمت جواب دے گئی۔ اب حضرت خالدؓ بن ولید کے فوجی دستے نے آگے سے اور بسر بن ابی رہم اور سعید بن مرہ کے دستوں نے پیچھے سے ایرانیوں کو گھیر گھیر کر قتل کرنا شروع کر دیا۔ اور ان کی لاشوں کے انبار لگا دیے۔ غرض ایرانیوں نے شکست فاش کھائی۔ فتح کے بعد حضرت خالد بن ولید نے

اس علاقے کے کاشتکاروں سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ اُن سے محض جزیے کا مطالبہ کیا جس کے ادا کرنے کا انھوں نے اقرار کر لیا۔

جزیہ حقیقت میں ایک طرح کا ٹیکس ہے جو غیر مسلموں پر اُن کے مال وجان کی پوری پوری حفاظت کرنے کے بدلے میں لگایا جاتا ہے۔ تاریخ اسلام میں یہ پہلا جزیہ ہے جو غیر مسلموں پر لگایا گیا۔ اس کے ادا کرنے کے بعد غیر مسلموں کو فوج میں شرکت نہ کرنے کی رعایت دے دی جاتی تھی۔ علاوہ ازیں جزیے کے تمام قاعدے اور ضابطے بے حد نرم رکھے گئے۔ مثلاً بیس سے کم اور پچاس سے اُوپر کی عمر کے لوگوں سے جزیہ نہیں لیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اُن لوگوں سے بھی جزیہ نہیں لیا جاتا تھا جو کسی لمبی اور پرانی بیماری میں مبتلا ہوں۔

ہر چند مسلمانوں سے جزیہ نہیں لیا جاتا تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کسی قسم کا بھی کوئی ٹیکس ادا نہیں کرتے تھے۔ وہ فوج میں بھی شریک ہوتے تھے اور جزیہ سے بھی زیادہ زکوٰۃ کی صورت میں ایک رقم بھی ادا کرتے تھے۔ اور اس کا ادا کرنا قانونی اعتبار سے اُن پر لازم تھا۔ بصورت دیگر سزا کے مستحق ہوتے تھے۔

اس جنگ میں چونکہ قبیلہ بکر بن وائل کے بھی کئی ایک عربی نسل کے عیسائی مارے گئے تھے اس لیے انھوں نے مسلمانوں کے خلاف ایران کے دربار میں فریاد کی اور شہنشاہ ایران اردشیر نے بہمن جادویہ ایک نامی گرامی ایرانی سورما کو اُن کی مدد کے لیے ایک لشکر گراں دے کر روانہ کیا۔ جادویہ

نے الیس کے مقام پر پہنچ کر وہاں کے حاکم جابان کو ایرانی فوج سونپ دی اور خود شہنشاہ سے ایران سے مشورہ کرنے کے لیے مدائن چلا گیا۔

ادھر جب خالد بن ولید کو ایرانیوں کے نئے حملے کی تیاریوں کا پتہ چلا تو وہ بھی لشکر لے کر مقابلے کو چل دیے۔ اور الیس کے مقام پر پہنچتے ہی لڑائی شروع کر دی۔ اور اس سے پہلے کہ بہمن جادویہ واپس آئے مسلمانوں نے موقع غنیمت جان کر نہایت جوش و خروش کے ساتھ بھرپور حملہ کر دیا جس سے عیسائیوں کے قدم اکھڑ گئے اور وہ بری طرح پسپا ہوئے۔ اس لڑائی میں پورے ستر ہزار ایرانی اور عیسائی گاجر مولی کی طرح کاٹ کر پھینک دیے گئے۔

الیس کی مہم سر کرنے کے بعد اب حضرت خالد بن ولید امیشیا کی طرف بڑھے لیکن یہاں کے باشندے حضرت خالدؓ بن ولید کے صرف آنے ہی کی اطلاع پا کر بدحواس ہو گئے اور گھربار چھوڑ کر بھاگ نکلے حتیٰ کہ شہر بالکل خالی ہو گیا۔ مسلمانوں کو یہاں سے اس قدر مالِ غنیمت ہاتھ آیا کہ اتنا جنگ ذات السلاسل کے بعد بھی حاصل نہیں ہوا تھا۔ مال غنیمت میں ہر سوار کو پندرہ سو درہم ملے۔ دیگر مجاہدین کو جو رقمیں ملیں وہ اس کے علاوہ ہیں۔

جب حضرت خالد بن ولید نے مال غنیمت کا پانچواں حصہ فتح کی خوشخبری کے ساتھ سیدنا ابوبکر صدیقؓ کی خدمت میں بھجوایا تو آپ بے حد خوش ہوئے اور فرمایا کہ اے معشر قریش تمہارے شیر نے ایک شیر پر حملہ کر دیا اور اس کے بھٹ میں گھس کر اسے مغلوب کر لیا۔ عورتیں خالد ایسا بہادر پیدا کرنے سے عاجز ہیں۔

امیشیا کی فتح کے بعد اب حضرت خالد بن ولید نے حیرہ کا رخ کیا۔

یہ ایک ایسی عیسائی ریاست کا دارالحکومت تھا جو ایران کے زیرِ اثر تھی۔ حیرہ کا شہر کوفہ سے تین میل کے فاصلے پر تھا۔ حضرت خالد بن ولید نے آتے ہی اس کا محاصرہ کر لیا۔ حیرہ کے حاکم ارذابہ نے جب دیکھا کہ خالد بن ولید کے ہاتھوں جنگ کے ذریعے رستگاری نہیں مل سکتی۔ اور الیس اور امیشیا کی عظیم الشان فتوحات اُس کے سامنے تھیں تو اُس نے اپنے بیٹے کو حکم دیا کہ وہ دریائے فرات پر بند باندھ کر اُس کا پانی روک لے اور سارا پانی دریا سے نکلنے والی نہروں میں چھوڑ دے۔ چنانچہ اُس نے ایسا ہی کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کی تمام کشتیاں دلدل اور کیچڑ میں پھنس کر رہ گئیں۔

حضرت خالد بن ولید اب یہ صورت حال دیکھ کر ارذابہ کی طرف لپکے اور ناگہانی طور پر مسلمان اُس کی فوج پر اس طرح حملہ آور ہوئے کہ اُن کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ مسلمان اپنی کشتیوں کو دلدل میں چھوڑ کر بجلی کی طرح اُس کی فوج تک پہنچ جائیں گے۔ مسلمانوں نے اس پامردی سے اُن کا مقابلہ کیا کہ اُن کا ایک فرد بھی زندہ بچ کر نہ جا سکا۔ سب کے سب فنا کے گھاٹ اُتار دیے گئے۔ اسی دوران میں شہنشاہِ ایران اردشیر مر گیا۔ ارذابہ کو اپنے بیٹے کے قتل اور اردشیر کے مرنے کی خبر ایک ساتھ ملی۔ اُس نے اب عافیت اسی میں خیال کی کہ چپکے سے بھاگ نکلے۔

ارذابہ کے راہِ فرار اختیار کرنے کے بعد حیرہ کے لوگ اپنے محلوں اور قلعوں میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ حضرت خالد بن ولید نے اُن کا سختی سے محاصرہ کر لیا جب یہ لوگ کسی طرح باہر نکلنے پر آمادہ نہ ہوئے تو حضرت خالد بن ولید نے

انھیں کہلا بھیجا کہ اگر تم لوگوں نے ایک دن کے اندر اندر اپنے آپ کو مسلمانوں کے حوالے نہ کیا تو تمھارے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔ لیکن انھوں نے تعمیل کی بجائے مجاہدینِ اسلام پر پتھر برسانے شروع کر دیے۔ آخر کار مسلمانوں کو بھی جوابی کارروائی کرنی پڑی جس سے ایرانیوں کے بے شمار آدمی مارے گئے۔ اب مسلمانوں کے تیروں کا مینہ برستا دیکھ کر ایرانیوں کے سرداروں سے، شہر کے پادریوں اور اُس کے راہبوں نے فریاد کی کہ مسلمانوں پر پتھر برسانا بند کر دو۔ اس تمام خوں ریزی کے ذمے دار تم ہو۔ اور ادھر مسلمان سپہ سالاروں سے گڑگڑا کر فریاد کی کہ تیر چلانے بند کر دیں۔ ہم تمھاری صرف ایک شرط ماننے کو تیار ہیں۔ چنانچہ جوابی کارروائی روک دی گئی۔ حیرہ کے عیسائی معززین شہر حضرت خالد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وہ ان معززین کی وساطت سے ہر قلعے کے لوگوں سے ایک ایک کر کے ملے اور کہا۔ افسوس ہے تم پر اے لوگو! تم نے اپنے آپ کو کیا سمجھ رکھا ہے۔ اگر تم عرب ہو تو کیا تمھیں زیب دیتا ہے کہ تم اپنے ہی ہم قوم لوگوں کا مقابلہ کرو۔ آخر وہ کیا شے ہے جس نے تمھیں اس پر اُبھارا ہے اور اگر تم عجمی ہو تو کیا تم سمجھتے ہو کہ ہمارے مقابلے میں جیت جاؤ گے؟

اس کے بعد حضرت خالد بن ولید نے فرمایا۔ ہم تمھارے سامنے تین چیزیں رکھتے ہیں۔ اوّل یہ کہ تم اسلام قبول کر لو۔ دوم یہ کہ مسلمان ہونا منظور نہ ہو تو جزیہ دو۔ سوم یہ کہ اگر تمھیں یہ بھی منظور نہ ہو تو آؤ میدانِ جنگ میں نکل کر اپنی قسمت کا فیصلہ کر لو مگر یاد رکھو تمھارے مقابلے میں ایک ایسی قوم ہے

جیسے موت اتنی ہی عزیز ہے جتنی تمہیں زندگی عزیز ہے۔ عیسائیوں نے یک زبان ہو کر کہا ہم صلح کی درخواست پیش کرتے ہیں اور ایک لاکھ نوّے ہزار درہم سالانہ ادا کرنے کا اقرار کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت خالد بن ولید نے اُسے بہ طیب خاطر قبول کر لیا اور بڑے بڑے عیسائی سرداروں نے صلح نامہ لکھ کر اُن کے حوالے کیا۔ اہلِ حیرہ نے جزیہ کے علاوہ حضرت خالد بن ولید کی خدمت میں کچھ تحفے بھی پیش کیے۔ جو آپ نے مالِ غنیمت کے ساتھ سیدنا ابوبکر صدیق رضؓ کی خدمت میں بھجوا دیے۔ آپ نے حضرت خالد بن ولید سے جواباً فرمایا کہ اگر یہ تحفے، جزیے میں شامل ہیں تو بہتر ہے بصورت دیگر انھیں جزیے کی رقم میں شمار کر کے باقی رقم حیرہ کے لوگوں کو واپس کر دو۔ چنانچہ حضرت خالد بن ولید نے ایسا ہی کیا۔

اہلِ حیرہ سے صلح کے بعد دیر ناطف کے پادری کے ایک نمائندہ صلوبا ابن نسطونا نے حضرت خالد کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ سے بانقیا اور باروسما کے قصبوں کے بارے میں مصالحت کی اور ان قصبوں کی تمام اراضی کا لگان ادا کرنے کی ذمہ داری قبول کر لی۔ جو دریائے فرات کے کنارے پر واقع تھی۔ کسریٰ کے موتیوں کے علاوہ اُس نے اپنی ذات، خاندان اور قوم کی طرف سے دس ہزار دینار دینے کا بھی وعدہ کیا اور معاہدے کی تحریر خدمت میں پیش کر دی۔

اس کے بعد عراق کے زمیندار آئے۔ مصالحت کی درخواست پیش کی۔ چنانچہ فلالیج سے ہرمزنات کے علاقے کے لیے بیس لاکھ درہم پر صلح ہو

گئی۔ اس کے علاوہ یہ بھی طے پایا کہ آلِ کسریٰ کی تمام املاک مسلمانوں کی ملکیت ہو گی۔ نیز وہ لوگ جو وطن چھوڑ کر چلے گئے۔ وہ اس مصالحت سے خارج ہوں گے اور ان کی املاک بھی مسلمانوں کی ملکیت ہو گی۔

مختصراً یہ کہ اب حضرت خالد بن ولید نے عراق کا ایک بہت بڑا حصّہ فتح کر لیا اور انھوں نے دریائے فرات کے تمام مغربی ساحل کو دشمن کے وجود سے بالکل پاک کر دیا۔ حیرہ کو اسلامی مفتوحہ علاقوں کا دارالحکومت بنایا۔ اب لازم تھا کہ مفتوحہ علاقوں کا جو نظام جنگ کے دنوں میں تباہ و برباد ہوا۔ اُسے پھر سے قائم کیا جائے۔ چنانچہ حضرت خالد بن ولید نے اس غرض کے لیے مختلف امراء مقرر کیے۔ خراج کا وصول کرنا، شہر کا نظم و نسق درست رکھنا اور سرحدوں کی دیکھ بھال کرنا اُن کا فرض منصبی ٹھہرایا۔

مفتوحہ علاقوں کے انتظامات سے فراغت پانے کے بعد حضرت خالد بن ولید حیرہ سے چل کر فلوجہ پہنچ گئے۔ اور پھر وہاں سے انبار پہنچ گئے، جو بغداد کے مغرب میں دس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اہلِ انبار کو جب حضرت خالد بن ولید کے آنے کا پتہ چلا تو انھوں نے شہر کے اردگرد خندقیں کھود کر قلعے کے دروازے بند کر لیے اور اس طرح اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے ہوئے قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔

حضرت خالد بن ولید کا قاعدہ تھا کہ انھیں جہاں کہیں جنگ کی صورت نظر آتی، بلا تامل جنگ کر دیتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے شہر کے اردگرد ایک چکر لگایا اور پھر اس بات کا اندازہ کر کے کہ اُن کے مقابلے میں جو لوگ

مقرر ہیں وہ اصول جنگ سے ناواقف ہیں۔ انھوں نے جنگ کا آغاز کر دیا۔ اور مجاہدین کو حکم ملا کہ دشمن کے پہرے دار سپاہیوں کو تاک تاک کر ان کی آنکھوں کا نشانہ بناؤ۔ چنانچہ مجاہدین نے ایسا ہی کیا جس سے تھوڑی ہی دیر میں دشمن کے ایک ہزار آدمی اپنی آنکھوں سے ہاتھ دھو بیٹھے اور ہر طرف شور و غل سے قیامت برپا ہو گئی کہ پہرے داروں کی آنکھیں جاتی رہیں۔ بالآخر اہل انبار کے سپہ سالار شیر زاد نے موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے صلح کی بات چیت شروع کی مگر اس نے شرطیں کچھ ایسی رکھیں، جو حضرت خالد بن ولید منظور نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا بات چیت ناکام ہو گئی۔

اس کے بعد حضرت خالد بن ولید کے حکم سے مجاہدین نے اونٹوں کو ذبح کر کے اُن کی لاشوں سے خندق کو پاٹ دیا اور اس سے پُل کا کام لیتے ہوئے خندق کے پار ہو گئے۔ اب جونہی مجاہدین آگے بڑھے دشمن کے سپاہی پسپا ہونے لگے۔ اس موقع پر شیر زاد نے دوسری مرتبہ پھر صلح کی درخواست پیش کی اور کہا کہ اگر جاں بخشی کر دی جائے تو وہ سواروں کے غیر مسلح اور خالی دستے کے ساتھ شہر سے باہر نکل جائے گا۔ حضرت خالد بن ولید نے اس کی درخواست قبول کر لی اور شیر زاد اپنے دعدے کے مطابق وہاں سے چلا گیا۔

انبار کو فتح کرنے کے بعد اب خالد بن ولید عین التمر کی طرف بڑھے جو کوفے کے مغرب میں انبار کے قریب واقع ہے۔ یہاں غیر عربی نسل کے عیسائیوں کی بھاری اکثریت تھی۔ یہ لوگ مسلمان عربوں کو بہت

حقیر سمجھتے تھے۔ اور خیال کرتے تھے کہ بحیثیت عرب عیسائی ہونے کے وہ بھی عرب مسلمانوں کے برابر کی قوت رکھتے ہیں۔ مگر جب حضرت خالد بن ولید نے آتے ہی عرب عیسائیوں کی فوج پر بھرپور حملہ کیا اور ان کے سپہ سالار عسقہ پر نہایت پھرتی سے کمند ڈال کر اسے اپنے لشکر میں گھسیٹ لائے۔ تو یہ حال دیکھ کر عرب عیسائیوں کے چھکے چھوٹ گئے اور میدانِ جنگ سے راہ فرار اختیار کی۔ مجاہدینِ اسلام نے ان کا پیچھا کیا اور سینکڑوں گرفتار کر لیے گئے۔

ادھر جب مہران بن بہرام چوبین کو عقہ کی شکست کا حال معلوم ہوا تو وہ قلعہ چھوڑ کر بھاگ نکلا، لیکن عقہ کی فوج کے وہ سپاہی جو مسلمانوں کے ہاتھ نہ آسکے وہ بھاگ کر قلعے میں پہنچ گئے اور دروازے بند کر کے بیٹھ گئے۔ حضرت خالد بن ولید نے اُن لوگوں کو پکڑنے کے لیے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ بالآخر محصورین جب تنگ آ گئے۔ اور دیکھا کہ اُن کو مال و دولت کے لالچ دینے سے بھی کام نہیں چلتا اور حضرت خالد بن ولید انھیں کسی قیمت پر بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تو مجبور ہو کر دروازے کھول دیے اور حضرت خالد بن ولید نے انھیں گرفتار کر کے مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔ پھر چند روز بعد حالات کی سنگینی کے پیش نظر عقہ سمیت تمام قیدی قتل کر دیے گئے اور قلعے کے تمام مال و اسباب پر قبضہ کر لیا گیا۔ اس قلعے میں کچھ نو عمر لڑکے بھی رہتے تھے۔ جنھیں کلیسا کے لیے وقف کیا ہوا تھا اور وہ اس کی طرف سے انجیل کی تعلیم پاتے تھے۔ خالد بن ولید نے انھیں مجاہدینِ اسلام میں

تقسیم کر دیا۔ ان لڑکوں میں خاص کر سیرین۔ ابو محمد بن سیرین۔ عثمان کے غلام عمران و نصیر (ابو موسیٰ بن نصیر) اسلامی سلطنت کے استحکام کے لیے گراں قدر خدمات انجام دینے کے باعث بڑی شہرت کے مالک ہوئے۔

تمرین کی فتح کے بعد حضرت خالد بن ولید نے مال غنیمت کا پانچواں حصہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی کی خدمت میں بھجوا دیا۔ اور اب دومتہ الجندل کی طرف بڑھ گئے۔ دومتہ الجندل کا قصبہ دمشق اور مدینہ کے درمیان سات منزل کے فاصلے پر واقع ہے۔ جب دومتہ الجندل کے باشندوں کو حضرت خالد بن ولید کے آنے کا پتہ چلا۔ تو انھوں نے چند ایک قبیلوں سے مدد طلب کی اور مقابلے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس اثناء میں جب حضرت خالد بن ولید ان کے قریب پہنچے تو اُن کے سردار اکیدر نے انھیں مشورہ دیا کہ جو قوم خالد سے جنگ کرتی ہے وہ زیادہ ہو یا کم بہرصورت ہار جاتی ہے۔ میں خالد بن ولید کو اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ فنونِ جنگ میں کوئی اُس کے مرتبے کا آدمی نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ تم صلح کی درخواست پیش کر دو۔ مگر اہل دومتہ الجندل نے اُن کی تجویز سے اتفاق نہیں کیا۔ اس پر اکیدر اُن سے الگ ہو کر چلا گیا۔

اکیدر چونکہ پیغمبرِ اسلام کے زمانے میں خالد بن ولید کے ہاتھ گرفتار ہو کر حضور کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور اطاعت کا اقرار کر کے جان بچائی تھی مگر اس کے بعد اس نے پھر سرکشی اور بغاوت اختیار کی اور عہد کو توڑ دیا تھا۔ اس لیے حضرت خالد بن ولید نے اُسے دوبارہ گرفتار کر کے سرکشی اور

بدعہدی کے جرم میں اُس کی گردن اُڑا دی۔ پھر آگے بڑھ کر انھوں نے دومۃ الجندل کی فوج کو گھیرے میں لے لیا۔ جو لوگ اُن کا مقابلہ کرنے کے لیے قلعے کے باہر موجود تھے پہلے انھیں قتل کیا۔ اس کے بعد قلعے کے دروازے اکھڑوا کر محصورین کی خبر لی اور ان میں سے ایک فرد کو بھی زندہ نہ چھوڑا۔

دومۃ الجندل کی فتح کے بعد حضرت خالد بن ولید چند روز کے لیے ٹھہر گئے۔ اس اثنا میں انھیں معلوم ہوا کہ عیسائیوں کی طرف سے عقہ کا انتقام لینے کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور دشمن ہر طرف سے لوگوں کو اکٹھا کر رہا ہے۔ لیکن اس سے قبل کہ آپ دشمن کے مقابلے کو پہنچیں آپ کے مقرر کردہ نائبین نے اُنھیں شکست فاش دے دی اور دشمن کی فوج کے ایک بہت بڑے حصہ کا صفایا کر دیا اور بے شمار مال غنیمت ہاتھ آیا۔ مقتولین میں اُن کے سپہ سالار زرمہر اور روزبہ بھی شامل تھے۔ جو لوگ کسی طرح جان بچانے میں کامیاب ہو گئے وہ خنافس کی طرف بھاگ نکلے۔ خنافس میں جو دشمن کا لشکر جمع ہو رہا تھا اس کے مقابلے کے لیے ابو لیلیٰ روانہ ہوئے اور انھوں نے آتے ہی سب کو مار بھگایا اور مسلمان بآسانی خنافس پر قابض ہو گئے۔

خنافس سے بھاگنے والا دشمن کا لشکر جب مصیخ پہنچ گیا اور پھر جنگ و جدل کی تیاریاں کرنے لگا تو حضرت خالدؓ بن ولید نے اُس کے استیصال کے لیے قعقاع بن عمرو، ابو لیلیٰ، اعبد اور عروہ کو روانہ کیا اور اس کے بعد

پھر خود بھی مصیخ کی طرف چل دیے جب مقرر کیے ہوئے وقت کے مطابق تمام سرداران لشکر اسلام منزلِ مقصود پر پہنچ گئے تو انھوں نے آتے ہی تین اطراف سے ہذیل کی فوج پر حملہ کر دیا، جو رات کی تاریکی میں بے خبر پڑی سو رہی تھی۔ لاشوں سے میدان پٹ گیا، لیکن ہذیل اپنے چند ساتھیوں سمیت بھاگ جانے میں کامیاب ہو گیا۔

مصیخ کے فتح کرنے کے بعد اب حضرت خالد بن ولید نے ثنی کا منصوبہ قائم کیا اور اس کے لیے بھی وہی طریقہ اختیار کیا جو مصیخ کے لیے کیا تھا یعنی پہلے سرداران لشکر اسلام کو روانہ کر دیا اور پھر اُن کے پیچھے خود بھی روانہ ہو گئے۔ رات کی تاریکی میں پھر سب ایک ساتھ تین اطراف سے دشمن پر حملہ آور ہوئے اور اس قدر کامیاب رہے کہ دشمن کا ایک فرد بھی زندہ بچ کر نہ جا سکا۔ عورتیں گرفتار کر لی گئیں اور مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ مدینے میں بھجوا دیا گیا۔

الثنی کی مہم سے فارغ ہو کر اب حضرت خالد بن ولید الزمیل کی جانب روانہ ہوئے، جہاں اُن کے مقابلے میں دشمنِ اسلام عتاب ابنِ فلاں ایک لشکرِ جرار لیے پہلے سے موجود تھا۔ اور چاہتا تھا کہ اپنے مقتولین کا انتقام لے۔ ہذیل بھی جو مصیخ سے جان بچا کر بھاگ نکلا تھا اس کے ہمراہ تھا۔ حضرت خالد بن ولید نے زمیل پہنچ کر تین اطراف سے حملہ کیا۔ اور دشمن کے اس قدر سپاہی قتل کیے کہ اس سے پہلے کسی جنگ میں نہ کیے تھے۔ بالآخر زمیل بھی فتح ہو گیا، جو مالِ غنیمت ہاتھ آیا اُسے فوج میں تقسیم کر دیا اور پانچواں حصہ سیدنا ابوبکر صدیق رض کی خدمت میں بھجوا دیا۔

الزمیل سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک بستی الرضاب تھی، حضرت خالد بن ولید

نے زمیل کی فتح کے بعد اس کی جانب رُخ کیا تو اُس کا حاکم بلال بن عقہ ان کے آنے کی خبر سنتے ہی وہاں سے نکل بھاگا اور الرضاب پر بغیر لڑے بھڑے مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ اب حضرت خالد بن ولید تمام عراق فتح کر چکے تھے۔ اور الجزیرہ کے غیر مسلم عربوں پر بھی فتح پا چکے تھے۔ چاہتے تھے کہ سرزمین ایران کو بھی فتح کر ڈالیں۔ چنانچہ مذکورہ بالا لڑائیوں کے بعد الفراض کو روانہ ہوئے، جو شام۔ عراق اور الجزیرہ کی سرحدوں کے قریب تھا۔

الفراض میں جب لشکر اسلام پہنچا تو رومیوں نے ایرانی چوکیوں سے فریاد کی اور فوجی مدد فراہم کر لی۔ اب دریائے فرات کے کنارے پر ایرانیوں، رومیوں اور غیر مسلم عربوں کا ایک لشکر جرار اکٹھا ہو گیا اور اُس نے مسلمانوں کی طرف کہلوا بھیجا کہ دریا کو پار کر کے تم ہماری طرف آؤ گے یا ہم تمہاری طرف آئیں۔ حضرت خالد بن ولید نے کہا ہمیں پہل کرنا پسند نہیں۔ نچلی جانب سے دریا پار کر کے تم ہی آ جاؤ۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ دریا عبور کرنے کے دوران تمھیں کچھ نہیں کہیں گے۔ چنانچہ رومیوں کا لشکر دریا کے پار اُتر گیا۔ اور علیحدہ علیحدہ گروہوں کی شکل میں تقسیم ہو کر لڑائی شروع کر دی۔ جب دشمن کے تمام گروہوں میں شکست کے آثار پیدا ہونے لگے تو حضرت خالدؓ بن ولید نے مجاہدین کو حکم دیا کہ ان کو ہرگز دم نہ لینے دو، اُن کا برابر پیچھا کرو۔ غرض اس کی تعمیل ہوئی اور فراض کی جنگ میں دشمن کے ایک لاکھ آدمی موت کے گھاٹ اُتر گئے۔

عراق میں خالد بن ولید کی یہ آخری جنگ تھی۔ اب پورے عراق کو فتح کرنے کے بعد حضرت خالدؓ بن ولید نے حج کا فریضہ ادا کیا۔ اس دوران مدینۃ النبی

سے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انھیں خط لکھا کہ وہ شام کو فتح کرنے کے لیے یرموک کی مہم پر چلے جائیں، جہاں رومیوں کی سرکوبی کے لیے ایک لشکرِ اسلام کے ساتھ شرجیل بن حسنہ، ابوعبیدہ بن الجراح اور عمرو بن عاص پہلے سے موجود تھے۔ اور انھیں مقابلہ سخت ہونے کے باعث مدد کی اشد ضرورت تھی۔ چنانچہ فتح عراق کے بعد حضرت خالد بن ولید شام کی طرف روانہ ہو گئے اور سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات سے بائیس پچیس روز پہلے ۱۳ھ میں اجنادین کو فتح کر لیا۔

طریق کار

حضرت خالد بن ولید کا طریقہ یہ تھا کہ وہ جب کسی شہر کو فتح کرتے تو اس کی حفاظت اور نظم و نسق کے بحال رکھنے کے لیے اسلامی فوج کا ایک دستہ مقرر کر دیتے۔ کاشتکاروں کو ہر طرح سہولتیں بہم پہنچاتے، رعیت کو امن و امان دیتے اور بدکردار حکام سے نجات دلا کر اُس کا دل موہ لیتے، پھر آگے بڑھتے۔

حضرت خالد بن ولید عراق میں ایک سال دو مہینے تک رہے۔ اس تھوڑی سی مدت میں انھوں نے رومیوں اور ایرانیوں کے نئے نئے ساز و سامان جنگ سے لیس لشکروں سے پندرہ[۱۵] لڑائیاں لڑیں۔ اور باوجود سامانِ جنگ اور مجاہدین کی قلت ہونے کے سب لڑائیوں میں مظفر و منصور ہوئے۔ اُن کے مقابلے میں دشمنوں کو ہمیشہ منہ کی کھانی پڑی اور وہ بری طرح پسپا ہوئے۔ سچ تو یہ ہے کہ حضرت خالد بن ولید کا تنہا وجود غنیم کو پوری فوج پر بھاری نظر آتا تھا۔ اور اکثر بڑے بڑے سورما تو اُن کا نام سنتے ہی بھاگ کھڑے ہوتے۔

جب حضرت خالد بن ولید شام کی مہم کے سلسلے میں یرموک پہنچے تو اُس وقت رومیوں کا لشکر دو لاکھ چھیالیس ہزار سپاہ پر مشتمل تھا اور مجاہدین اسلام صرف چھتیس ہزار تھے۔ آپ کے آتے ہی لڑائی کا آغاز ہو گیا اور آپ نے تلوار کے وہ جوہر دکھائے کہ دشمن کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ راہبوں اور پادریوں نے شکست خوردہ لشکر کے مذہبی جذبات کو بھر کچھ اس طریقے سے اُبھارا کہ اُن کا جوش و خروش دیکھ کر تھوڑی دیر کے لیئے مجاہدینِ اسلام بھی سہم گئے۔ اس مرتبہ رومیوں کا لشکر پورے ڈھائی لاکھ سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ اب حضرت خالد بن ولید نے گروہوں کی صورت میں تقسیم ہو کر جنگ کرنے کے طریقے کو بدل دیا اور تمام مجاہدین کو حکم دیا کہ وہ ایک ہی کمان کے تحت پوری تنظیم کے ساتھ حملہ کریں، ورنہ رومیوں کا پلہ بھاری رہے گا۔ اور مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچے گا۔ چنانچہ تمام مجاہدینِ اسلام حضرت خالد بن ولید کی کمان کے تحت آ گئے۔ آپ نے قلیل فوج کو دشمن کی کثیر فوج کے مقابلے میں زیادہ تعداد میں ظاہر کرنے کے لئے اڑتیس ۳۸ دستوں میں تقسیم کر دیا تاکہ دشمن دھوکے میں رہے اور اُسے مسلمانوں کے لشکر و سپاہ کی صحیح تعداد معلوم نہ ہونے پائے۔ قلب میں آپ نے اٹھارہ دستے رکھے۔ ابو عبیدہ ابن الجراح کو ان کا سردار بنایا۔ ان دستوں میں حضرت عکرمہ بن ابو جہل اور قعقاع بن عمرو بھی شریک تھے۔ یمنہ پر آپ نے دس دستے مقرر کیے۔ ان کا سردار عمرو بن عاص کو بنایا، ان میں شرجیل بن حسنہ بھی شامل تھے۔ میسرہ پر آپ نے دس دستے مقرر کیے ان کا سردار امیر معاویہ کے بڑے بھائی حضرت یزید بن ابو سفیان کو مقرر کیا۔ اس کے علاوہ ہر دستے کا علیحدہ سردار بھی تھا، جو میمنہ، میسرہ اور قلب کے سرداروں سے احکام

حاصل کرتا تھا۔ ان میں ایک سردار حضرت خالد بن ولید کے بیٹے عبدالرحمٰن بن خالد بھی تھے، جن کی عمر اُس وقت صرف اُٹھارہ برس کی تھی۔

اس ترتیب کے علاوہ آپ نے لشکر کا ہراول دستہ بھی قائم کیا، جس کے سردار قیاث بن اشیم مقرر ہوئے، قاضی کی خدمت ابوالوفا کے سپرد ہوئی۔ قاری لشکر حضرت مقداد تھے، جو سورۂ انفال جس میں جہاد کا ذکر ہے پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ سامان کے افسر حضرت عبداللہ بن مسعود تھے۔ واعظ ابوسفیان تھے۔ جو لشکر میں گشت کرتے رہتے اور ہر دستے کے سامنے ٹھہر کر کہتے: تم عرب کے حامی اور اسلام کے مددگار ہو۔ تمہارے مقابلے میں جو لوگ آج آئے ہیں، وہ روم کے حامی اور شرک کے مددگار ہیں۔ اے اللہ! آج کی جنگ صرف تیرے نام کے لیے ہے۔ اے اللہ! اپنے بندوں پر اپنی نصرت نازل فرما۔

غرض ان تمام انتظامات کے مکمل کرنے کے بعد آپ نے حصۂ قلب کے سردار عکرمہ بن ابی جہل اور قعقاع بن عمرو کو حکم دیا کہ وہ آگے بڑھ کر دشمن پر حملہ کریں۔ چنانچہ وہ دونوں رجزیہ اشعار پڑھتے ہوئے آگے بڑھے اور جنگ شروع کر دی۔ عین اُس وقت تک جب لڑائی زوروں پر تھی، رومی ثابت قدمی سے لڑ رہے تھے۔ رومیوں کا سردار جرجیر اپنے لشکر کے قلب سے نکلا اور ضمیر کے بیدار ہو جانے سے خالد بن ولید کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا۔ اس کے بعد خالد بن ولید اور جرجیر اس بے جگری سے لڑے کہ رومیوں کی صفوں کی صفیں پلٹ دیں۔ جرجیر صبح سے شام تک برابر لڑتے رہے۔ بالآخر وہ رومیوں سے لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ جرجیر اُن دو رکعتوں کے سوا، جو اسلام لانے کے بعد

ادا کی گئیں، کوئی اور نماز ادا نہیں کر سکے۔ ہر چند مسلمانوں نے بھی جنگ کی شرکت کے سبب جماعت کے ساتھ نمازیں ادا نہیں کیں تاہم انھوں نے ظہر اور عصر کی نمازیں میدانِ جنگ میں اشاروں کے ساتھ ضرور ادا کر لیں۔

اب لڑتے لڑتے رومی تھک چکے تھے اور اُن کے پاؤں اکھڑ رہے تھے۔ کہ حضرت خالد بن ولید اُن کے لشکر کے قلب میں گھس گئے۔ رومیوں نے یہ دیکھ کر کہ حضرت خالد بن ولید کے آگے بڑھنے سے گھوڑوں کو بھاگنے کا راستہ مل گیا۔ بے وہ بے تحاشا صحرا کی طرف بھاگ نکلے۔ مسلمانوں نے مصلحت چونکہ اسی میں سمجھی، لہٰذا بھاگنے والوں کا تعاقب نہ کیا۔

اب سوار فوج کے بھاگ نکلنے کے بعد صرف دشمن کی پیدل فوج رہ گئی تھی، جسے حضرت خالدؓ بن ولید نے گاجر مولی کی طرح کاٹ کاٹ کر پھینکنا شروع کر دیا۔ رومی سپاہ جان بچانے کے لیے اِدھر اُدھر خندق میں گھس گئی، مگر حضرت خالد بن ولید وہاں بھی جا پہنچے۔ اس کے علاوہ رومیوں کی بہت بڑی تعداد اپنے پاؤں میں زنجیریں ڈالے ہوئے تھی تاکہ وہ میدانِ جنگ میں ثابت قدم رہے۔ اب وہ بھی خالد بن ولید کے حملے کی تاب نہ لا کر دھڑا دھڑ ایک گھاٹی میں گرنے لگی۔ اگر ایک شخص گرتا تو اُس کے ساتھ دس آدمی اور گر جاتے۔ اس کے علاوہ رات کی تاریکی پھیل رہی تھی۔ اس لیے جب کوئی رومی راہِ فرار اختیار کرتا ہوا اِدھر سے گزرتا تو اچانک، وہ بھی اسی میں آ کر گر جاتا۔ غرض بقول طبری کے ایک لاکھ بیس ہزار رومی سپاہ اس گھاٹی میں گر کے لقمۂ اجل ہو گئے۔ اس میں سے اسی ہزار سپاہی تو وہ تھے جنھوں

نے ثابت قدم ہو کر لڑنے کے لیے اپنے آپ کو زنجیروں سے جکڑ رکھا تھا۔
مختصراً یہ کہ حضرت خالد بن ولید تمام دن اور رات رومیوں سے مسلسل جنگ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ رومیوں کے سالارِ اعظم کے خیمے تک پہنچ گئے اور یرموک کو فتح کر لیا۔ یہ جنگ سیدنا عمر فاروق کے مسندِ خلافت پر بیٹھنے کے بعد اُن کے زمانے کی پہلی جنگ ہے جو سیدنا ابوبکر صدیق رضؓ کی وفات کے بیس روز بعد وقوع میں آئی۔ اس جنگ میں مسلمان مردوں کے ساتھ ساتھ مسلم خواتین نے بھی حصّہ لیا۔ وہ میدانِ جنگ میں زخمیوں کو پانی پلاتی، زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی اور اپنے مردوں کو جہاد پر اُبھارتی تھیں۔ اس جنگ میں جو مسلمان شہید ہوئے اُن میں ایک ہزار صحابہؓ تھے اور دو ہزار عام مسلمان۔ اسی دوران میں سیدنا عمر فاروق رضؓ کی طرف سے خالد بن ولید کو ان کی سپہ سالاری سے معزولی اور سیدنا ابوبکر صدیق رضؓ کے انتقال کی اطلاع ملی۔ قاصد نے حضرت خالد بن ولید کو لشکر سے الگ لے جا کر تنہائی میں صورتِ حال سے مطلع کر دیا اور کہا کہ اب آپ کی جگہ ابو عبیدہ ابن الجراح کو شام کی مہم پر سپہ سالار مقرر کیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت خالد بن ولید نے بہ طیبِ خاطر فرمانِ خلافت قبول کر کے ابو عبیدہ ابن الجراح کی ماتحتی اختیار کر لی۔ اور ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے سیدنا عمر فاروق رضؓ کے کسی حکم کی کبھی ذرا سی بھی سرتابی نہیں کی۔ حالانکہ ایسے عالم میں تنزل کی بجائے ایک بہادر انسان اپنے عظیم الشان کارناموں کی بدولت انعام و اکرام کا مستحق ٹھہرتا ہے مگر حضرت خالد بن ولید ایسے نامور سپہ سالار کو جنھیں ذاتِ رسالتمآب کی

بارگاہ نبوت سے سیف اللہ کا لقب حاصل ہوا۔ سیدنا عمر فاروقؓ کی طرف سے معرکہ یرموک کے اختتام پر دمشق کے محاصرے کے دوران سپہ سالاری کے عہدے سے معزول کیے جانے کا حکم مل گیا اور آپ نے اسے بے چون و چرا تسلیم کر لیا اور بال برابر بھی دل میں کوئی فرق نہیں آنے پایا۔ وہ پہلے جس جوش و خروش کے ساتھ ایک سپہ سالار کی حیثیت سے دادِ شجاعت دیتے رہے، اب بھی اسی طرح سے حکم کی تعمیل کرتے ہوتے ایک سچے مسلمان سپاہی کی طرح دشمن سے نبرد آزما رہے۔ یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ حضرت خالد بن ولید معزولی سے انتقال تک ایک سچے مسلمان سپاہی کی حیثیت سے برابر اسلام اور مسلمانوں کی خدمت اور حفاظت کرتے رہے۔ آپ کے دل میں سپہ سالاری سے معزول کیے جانے کا قطعاً کبھی کوئی ملال پیدا نہیں ہوا۔ یہ بات جہاں حضرت خالد بن ولید کے اطاعت گزار ہونے کا بے نظیر نمونہ ہے وہاں اُن کے عالی ظرف اور فراخ حوصلہ رکھنے کی لاثانی مثال بھی ہے۔ چونکہ حضرت خالد بن ولید کی معزولی صرف اخلاص نیت پر مبنی تھی۔ اس میں سیدنا عمر فاروقؓ کی ذاتی عداوت یا کوئی دنیاوی غرض نہیں تھی۔ اس لیے جب حضرت خالد بن ولید نے وفات پائی تو سیدنا عمر فاروقؓ بے حد ملول اور غمزدہ ہوئے اور فرمایا کہ آج خالد کے انتقال سے اسلام کی فصیل میں ایک ایسی دراڑ پڑ گئی ہے جو کبھی پُر نہ ہو سکے گی۔ کاش اللہ تعالیٰ اُن کی عمر اور لمبی کر دیتا۔

اصل میں بات اتنی تھی کہ خالد بن ولید کا طریقۂ جنگ کچھ اتنا سخت

تھا کہ اُسے سیدنا عمر فاروقؓ پسند نہیں کرتے تھے اور ایک دو مرتبہ اُن سے کچھ بے احتیاطی بھی ہو گئی۔ مثلاً مالک بن نویرہ کا قتل جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ وہ مسلمان ہو گئے تھے۔ جب حضرت خالد بن ولید کے ایک حکم کا غلط مطلب لینے کے باعث ضرار بن ازور نے انھیں قتل کر دیا۔ اس کے علاوہ ایک شاعر کو آپ نے ایک ہزار دینار عطا کر دیے تھے۔ سیدنا عمر فاروقؓ کو جب اس واقعہ کا پتہ چلا تو انھوں نے خیال کیا کہ رقم کہیں مسلمانوں کے مال سے نہ دی گئی ہو جو سب مسلمانوں کی امانت ہے۔ چنانچہ انھوں نے حضرت خالد بن ولید سے وضاحت طلب کی لیکن جب اُن کی طرف سے تاخیر ہوئی تو انھوں نے معزولی کا پروانہ جاری کر دیا۔ پھر جب حضرت بلالؓ نے انہی کے عمامہ سے اُن کے ہاتھ باندھ دیے تو حضرت خالد بن ولید نے سیدنا عمر فاروقؓ سے کہا کہ میں نے وہ رقم صرف اپنی جیب خاص سے دی ہے۔ اس پر اُن کا عذر تسلیم کر کے اُن کے ہاتھ کھول دیے گئے۔

جس طرح اوّلاً سیدنا عمر فاروقؓ نے بعض واقعات کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت خالد بن ولید کے بارے میں ایک رائے قائم کی اور پھر انھیں اسی رائے کے سبب معزول کرنے کے بعد پشیمان ہوئے۔ اسی طرح بعد میں حضرت خالد بن ولیدؓ نے بھی نہایت کھلے دل سے اعتراف کر لیا کہ حضرت عمرؓ نے جو کچھ کیا صرف اللہ کی خوشنودی اور مسلمانوں کے مفاد کی خاطر کیا۔ مجھے خیال تھا کہ وہ میرے قریبی رشتہ دار ہیں۔ اس لیے میرا کچھ لحاظ کریں گے۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ وہ دینی اور دنیوی امور

میں قریبی اور غیر قریبی کسی شخص کی پرواہ نہیں کرتے اور کسی ملامت گر کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔ لہٰذا جب یہ باتیں میرے دل میں آئیں، تمام رنج و غم میرے دل سے مٹ گیا۔

وفات

حضرت خالد بن ولید کے انتقال کے بارے میں اختلاف ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ سنہ ۲۱ھ میں مدینے میں فوت ہوئے۔ اور اکثر کہتے ہیں کہ حضرت خالد بن ولید اپنی معزولی کے بعد حضرت عمر فاروقؓ سے ملنے مدینے آئے اور پھر ان سے مل کر شام چلے گئے، جہاں حمص میں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی تو سنہ ۲۱ھ میں آپ کا یہیں انتقال ہوا۔

حضرت خالد بن ولید کی کئی بیویاں تھیں، جن سے کثیر اولاد پیدا ہوئی۔ ان میں سے آپ کے ایک بیٹے سلیمان تھے، جن کے نام پر آپ کی کنیت ابو سلیمان تھی اور ایک بیٹے عبداللہ تھے، جو عراق میں شہید ہوئے اور دو بیٹے عبدالرحمان اور مہاجر تھے، جنھیں بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ جب سیدنا علی ابن ابی طالب اور امیر معاویہ کے درمیان اختلاف پیدا ہوا تو عبدالرحمان نے امیر معاویہ کا ساتھ دیا اور مہاجر نے سیدنا علیؓ ابن ابی طالب کی رفاقت اختیار کی۔ بعض کہتے ہیں مہاجر جنگ صفین میں شہید ہوئے۔ ان کے علاوہ حضرت خالد بن ولید کے اور بھی کئی ایک بیٹے اور پوتے شام میں موجود تھے لیکن وہ سب کے سب طاعون کی بیماری میں فوت ہو گئے اور حضرت

خالد بن ولید کی نسل کے آگے چلنے کا سلسلہ قطعی ٹوٹ گیا۔ مؤلف کتاب نہایۃ الارب نے لکھا ہے کہ حضرت خالد بن ولید کی اولاد بالکل ختم ہو گئی۔ مشرق و مغرب میں ایک بھی شخص اُن کی اولاد کا باقی نہیں رہا۔ اگر کوئی دعویٰ کرے کہ وہ حضرت خالد بن ولید کی اولاد سے ہے تو وہ صریحاً جھوٹا ہے۔ مؤلف کتاب اسد الغابۃ اور مؤلف کتاب۔ نہایۃ الارب کے قول کے مطابق حضرت خالد بن ولید کے اور اُن کے بیٹوں کے گھروں کے مالک اور جائیداد کے جناب ایوب بن سلمہ بن عبداللہ بن ولید بن ولید بن مغیرہ مدینے میں وارث ہوئے۔

ابو عبیدہ ابن الجرّاح

نام و نسب

ابو عبیدہ عامر ابن عبداللہ بن الجرّاح، قبیلہ قریش سے تھے۔ پانچویں پشت میں آپ کے نسب کا سلسلہ فہر بن مالک پر آکر حضورؐ پیغمبر اسلام سے مل جاتا ہے۔ آپ کی کنیت ابو عبیدہ تھی اور لقب امین الامت تھا، جو حضور علیہ السلام کا عطا کیا ہوا تھا۔ آپ بجائے باپ کے اپنے دادا کے نام سے مشہور ہیں اور اسی لیے ابو عبیدہ ابن الجرّاح کہلاتے ہیں۔

آپ ۵۸۱ء میں پیدا ہوئے۔ اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کی وساطت سے حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوتے اور دین و دنیا کا حقیقی سرمایہ سمجھ کر اسلام قبول کیا اور پھر اسلام اور مسلمانوں کی اس انداز سے خدمت کی کہ حضورؐ کی بارگاہِ رسالت سے امین الامت کا لقب حاصل کیا۔ یہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایسا نازک دور تھا کہ کفار مکہ ان کے مٹانے پر تلے ہوئے تھے اور اُن کے ظلم و ستم نے مسلمانوں کو مکہ سے ہجرت کر جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ چنانچہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حکم پر مکے کے مسلمان سب سے پہلے ہجرت کر کے حبشہ کی طرف گئے۔ انہی مہاجرین میں حضرت ابو عبیدہ ابن الجرّاح بھی شامل تھے۔ لیکن تھوڑی مدت کے بعد ابن الجرّاح مکہ واپس آگئے اور پھر دوسری مرتبہ آپ نے حضور علیہ السلام

کے حکم پر مدینہ کی طرف ہجرت کی۔

جنگ بدر جس میں کفار نے اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے کی بھرپور کوشش کی اور وہ اسلام کی پہلی جنگ تھی، جو اسلام اور مسلمانوں پر کفار کے حملہ آور ہونے سے اُن کے خلاف دفاعی طور پر مجبوراً لڑی گئی تھی۔ اس میں جہاں بھائی بھائی کے مقابلے میں آیا، وہاں بھتیجے اپنے چچاؤں کے مقابلے میں۔ اور باپ اپنے بیٹوں کے اور بیٹے اپنے باپ کے مقابلے میں بھی آئے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اپنے بیٹے کے خلاف نکلے تو حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح اپنے باپ کے مقابلے میں نکلے۔ جو بڑا ہی عجیب وغریب منظر تھا اور اہلِ دنیا کے سامنے پہلی مرتبہ آیا اور اس سے قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ اسلام کی راہ میں کوئی جسمانی تعلق اور خونی رشتہ رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ ہر چند حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح نے باپ کو دیکھ کر پہلے پہل بُری طرح شکست دینے کی کوشش نہ کی۔ باپ اُن پر جھپٹ کر حملہ کرتا اور وہ نہایت پھرتی سے بچ کر اُس کی زد سے نکل جاتے۔ اگر وہ اس میں کامیاب نہ ہوتے تو باپ کی تلوار اُن کے سر پر اتنی شدت سے پڑتی کہ ان کی کمر کو توڑتی ہوئی ان کے دو ٹکڑے کر کے باہر نکل جاتی۔ بالآخر باپ جب اپنے ارادے سے باز نہ آیا اور وہ تہیہ کیے ہوئے تھا کہ اسلام اور مسلمانوں کو دنیا سے حرفِ غلط کی طرح مٹا ڈالے تو حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح خون کے جسمانی رشتے کو توڑ کر مردانہ وار آگے بڑھے اور تلوار کے ایک ہی بھرپور ہاتھ سے باپ کی گردن تن سے جدا کر ڈالی۔

کفارِ مکہ نے جنگِ بدر کی شکست کا انتقام لینے کے لیے دوسرے موقع پر جب پھر میدان کارزار گرم کیا اور اُحد کے مقام پر مسلمانوں اور کافروں

کے درمیان معرکہ آرائی ہوئی تو اس جنگ میں بھی حضرت ابو عبیدہ ابن الجراح شریک تھے۔ اور جب مسلمانوں کی ایک نادانستہ غلطی کے باعث کافروں کی شکست اُن کی فتح سے بدل گئی یہاں تک کہ مسلمانوں کے بڑے بڑے سپہ سالار شہید ہو گئے اور خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی زخمی ہوئے اور زرہ کی دو کڑیاں آپ کے جسم مبارک میں گھس گئیں تو اس موقع پر یہ سعادت بھی حضرت ابو عبیدہ ابن الجراح ہی کو نصیب ہوئی کہ آپ نے کڑیوں کو اپنے دانتوں سے پکڑا اور اس زور سے کھینچ کر انھیں باہر نکالا کہ آپ کے آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ لیکن آپ نے اس کی ذرا بھی پرواہ نہ کی، بلکہ خوش تھے کہ اُن سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کچھ تھوڑی بہت خدمت بن پڑی۔ یہ اللہ کا احسان ہے۔

جنگ بدر اور جنگ احد کے علاوہ آپ غزوہ خندق اور بنی قریظہ کی جنگ میں بھی شریک ہوئے۔ حضور ختمی مرتبت رسالت مآب محمد رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سب سے پہلے لڑائی میں آپ کو سپہ سالار بنا کر بھیجا تھا۔ وہ سریہ بنو ثعلبہ ہے۔ پھر اس کے بعد ۸ھ میں جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قبیلہ قضاعہ کی تادیب کے لیے حضرت عمرو بن عاص کو تین سو مجاہدوں کے ساتھ روانہ کیا تو بعد میں ان کی مدد کے لیے حضرت ابو عبیدہ ابن الجراح کو بھی سپہ سالار بنا کر بھیج دیا۔

حضرت ابو عبیدہ ابن الجراح کی شان اور اُن کی فضیلت کے بارے میں اتنا کہنا بس ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت ابو بکر صدیقؓ اور

حضرت عمر فاروقؓ ایسے اصحاب اس مہم پر ان کی ماتحتی میں بھیجے گئے۔ جہاں حضرت عمرو بن عاص پہلے سے موجود تھے۔ یہاں پہنچ کر انھیں ایک مشکل پیش آئی وہ یہ کہ آپ حضرت عمرو بن عاص کی مدد کے لیے بھیجے گئے تھے۔ اب سپہ سالاری کے عہدے پر حضرت ابو عبیدہ ابن الجراح کو متصور کیا جائے یا عمرو بن عاص کو۔ پھر جب ذرا بات بڑھنے لگی اور فیصلہ کا ہونا مشکل ہو گیا تو حضرت ابو عبیدہ ابن الجراحؓ نے کمال عجز و انکسار سے حضرت عمرو بن عاص کی بات مان لی اور اُن کے ماتحت ہو گئے اور اس کے بعد اسلام کے دشمنوں سے اس بے جگری سے لڑے کہ انھیں شکست دے کر میدانِ جنگ سے مار بھگایا۔ واپسی پر جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس واقعہ کا پتہ چلا تو آپ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ ابو عبیدہ پر اپنی رحمت نازل فرمائے۔

دوسری مہم جس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت ابو عبیدہ ابن الجراح کو سپہ سالار بنا کر بھیجا تھا۔ سریہ سیف البحر ہے، جس کی غرض یہ تھی کہ کفارِ مکہ کی نقل و حرکت کا مسلمانوں کو علم ہوتا رہے تاکہ وہ کفار کے حملے سے بچنے کے لیے دفاعی انتظامات مکمل کر لیں۔ اس مہم میں تین سو آدمی بھیجے گئے، جن کا سامانِ رسد جلد ختم ہونے کے باعث حال نہایت پتلا ہو گیا اور انھیں بھوک کی آگ بجھانے کے لئے درختوں کے پتے کھانے پڑے، جن سے اُن کے منہ میں چھالے پڑ گئے۔

پھر جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام فتح مکہ کے لیے روانہ ہوتے تو اس مبارک موقع پر بھی حضرت ابو عبیدہ ابن الجراح ہمراہ تھے۔ اس کے علاوہ جنگِ حنین

اور جنگ طائف میں بھی آپ حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے ہمرکاب تھے جنگوں میں شمولیت کے علاوہ آپ اہلِ نجران کی طرف اُن کی خواہش کے مطابق اسلام کے مُبلّغ بنا کر بھی بھیجے گئے۔ اور آپ نے اہلِ نجران کو اسلامی اخلاق و آداب کے مطابق خاطر خواہ تعلیم و تربیت دی۔ نیز ایک مرتبہ آپ کو اہلِ بحرین سے جزیے کی رقم لانے کے لیے بھی بھیجا گیا تھا اور اُن سے آپ نے بڑی بھاری رقم وصول کی اور بحفاظت تمام لا کر حضورؐ کی خدمت میں پیش کی جسے حضورؐ نے مستحقین میں سب کا سب تقسیم کر دیا۔

مختصراً یہ کہ حضرت ابوعبیدہ ابن الجرّاح تاحیات اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے لیے پیش پیش رہے۔ اور جب تک حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام حیات رہے ہر موقع پر اُن کے ساتھ رہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر بھی آپ حضورؐ کے ہمراہ تھے۔ آپ حقیقت میں اُن صحابہ کی طرح تھے، جو پروانوں کی طرح شمع رسالت کے گرد برابر چکر لگاتے رہتے تھے اور کبھی جدا نہ ہوتے تھے۔

حضور محمد رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے ملاءِ اعلیٰ کو تشریف لے جانے کے بعد جب مدینہ کے بدباطن یہودیوں نے ایک نامعلوم طریقے سے مسلمانوں میں حضورؐ کی جانشینی کا مسئلہ پیدا کر دیا۔ اور بڑھتے بڑھتے وہ پھر اتنا پیچیدہ ہو گیا کہ زبردست کشت و خون ہونے کے اندیشے تک نوبت پہنچ گئی تو اس نازک موقع پر حضرت ابوعبیدہ ابن الجرّاح نے کمال تدبّر و فراست سے کام لیتے ہوئے مصالحت کی کوشش کی، جو آخر کار اُن کے مخلصانہ جذبات کی بدولت کامیاب ہوئی۔ آپ نے جھگڑے کو بڑھتا ہوا دیکھ کر مدینے کے

انصار سے کہا، اے مسلمانو تم ہی وہ جماعت ہو جس نے سب سے پہلے اسلام کی مدد کی۔ پس اب ایسے نہ بنو کہ تمہارے سبب مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہو جائے۔ حضرت ابو عبیدہ ابن الجراح کی اس تقریر کا یہ اثر ہوا کہ انصار کے دل مطمئن ہو گئے اور بڑھتا ہوا جھگڑا ختم ہو گیا۔

فتوحات

سیّدنا ابوبکر صدیقؓ کو بارِ خلافت اُٹھانے کے بعد جب عرب کے مرتدینِ اسلام اور منکرینِ زکوٰۃ اور جھوٹے نبیوں سے پالا پڑا، تو اس مہم کے سر کرنے میں آپ نے باوجود بڑھاپے کے ایسی جوانمردی اور اولوالعزمی سے کام لیا کہ ایک دنیا حیرت میں پڑ گئی۔ پھر جب اندرونی دشمنوں کی اس مہم سے فراغت کے بعد آپ نے بیرونی دشمنوں یعنی رومیوں اور ایرانیوں کی طرف توجّہ کی جو غیر مسلم عربوں کو مسلمانوں کے خلاف آئے دن اکساتے اور جنگ و جدل کرنے پر اُبھارتے رہتے تھے۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ سیّدنا ابوبکر صدیقؓ نے ۱۳ھ میں شہنشاہِ ایران اور قیصرِ روم کا سرِ غرور توڑنے کے لیے فوجیں روانہ کیں۔ چنانچہ ابوعبیدہ ابن الجراح حمص پر۔ حضرت عمرو بن عاص فلسطین پر۔ حضرت شرجیل بن حسنہ اردن پر اور حضرت یزید بن ابوسفیان دمشق پر حملہ کرنے کے لیے روانہ ہوئے اور ان تمام سپہ سالاروں کو ہدایت فرمائی کہ اگر یہ تمام فوجیں ایک مقام پر اکٹھی ہو جائیں تو ابوعبیدہ ابن الجراح سپہ سالار ہوں گے۔ اس کے بعد چاروں لشکر اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح جب مدینے سے چل کر عمان کے ایک شہر آب پہنچے تو وہاں کا حاکم قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا اور بجائے میدان میں نکل کر مقابلہ کرنے کے مسلمانوں پر تیر اور پتھر برسانے لگا۔ حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح نے کمال حکمت اور شجاعت سے اُس پر جلد ہی قابو پا لیا۔

اب تمام شہر کے لوگوں نے گڑگڑا کر عجز و انکسار کے ساتھ صلح کی درخواست پیش کی اور جزیہ دینا قبول کیا۔
یہ تھا شام کا شہر تھا جس پر مسلمانوں نے فتح پائی اس کے بعد جابیہ پہنچے
یہاں پہنچ کر ابو عبیدہ ابن الجراح کو معلوم ہوا کہ قیصر روم نے مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے بے شمار لاؤ لشکر اکٹھا کیا ہوا ہے۔ اور شام کے تمام شہروں کے عیسائی غیض و غضب سے دانت پیس رہے ہیں۔ اور مسلمانوں کے خلاف میدانِ جنگ میں صف بستہ کھڑے ہو گئے ہیں۔ حضرت ابو عبیدہ ابن الجراح نے اس حال کی صورت سے حضرت ابو بکر صدیق رضؓ کو مطلع کیا جس کے جواب میں انھوں نے حضرت خالد بن ولید کو فوراً حضرت ابو عبیدہ ابن الجراح کی مدد کے لیے بھیج دیا۔

راستے میں جو چھوٹے موٹے مقامات آئے۔ حضرت خالد بن ولید انھیں فتح کرتے ہوئے حضرت ابو عبیدہ ابن الجراح کے پاس پہنچ گئے اور اسلامی فوجوں کی کمان سنبھال کر دشمنوں سے معرکہ آرائی میں مصروف ہو گئے۔ اس دوران میں ابو بکر صدیق رضؓ انتقال کر گئے اور حضرت عمر فاروق رضؓ کی خلافت قائم ہو گئی۔ ہر چند انھوں نے اس نازک موقع پر خلیفہ ہوتے ہی حضرت خالد بن ولید کو سپہ سالاری کے عہدے سے الگ کر دیا اور اُن کی جگہ حضرت ابو عبیدہ ابن الجراح تمام اسلامی فوجوں کے سپہ سالار ہوئے، تاہم حضرت خالد بن ولید اپنے دل میں کوئی میل لائے بغیر نہایت اخلاص کے ساتھ جہاد میں مصروف رہے اور انھوں نے حضرت ابو عبیدہ ابن الجراح کا ادب احترام بالکل اسی طرح قائم رکھا جیسا کہ وہ پہلے قائم رکھتے تھے۔ آخر کار حضرت

خالد بن ولید نے دمشق کو فتح کر لیا اور حضرت ابو عبیدہ ابن الجراح نے سپہ سالار کی حیثیت سے حضرت عمر فاروق کو اس کی اطلاع دی۔ اس لڑائی میں شہر کے لوگوں سے جس رواداری کا برتاؤ اور حسنِ سلوک کیا گیا فاتحین عالم میں ڈھونڈے سے اس کی ایک بھی مثال نہیں مل سکتی۔ اس میں نہ تو مفتوحین کا مالِ غنیمت لیا گیا نہ اُن کے افراد ہی کو لونڈی اور غلام بنایا گیا بلکہ اہلِ دمشق نے جس الحاح اور گریہ وزاری سے حضرت ابو عبیدہ کی خدمت میں صلح کی درخواست پیش کی تھی۔ اسی کے پیشِ نظر اُن کے ساتھ یہ مشفقانہ سلوک روا رکھا گیا۔

لیکن بایں ہمہ دمشق کی شکست نے قیصر روم کو مسلمانوں کے خلاف بے حد برانگیختہ کیا اور اس نے شکست کا بدلہ لینے کے لیے اب پہلے سے بھی کہیں زیادہ عیسائی لشکر جمع کرنے شروع کر دیے۔ اب دمشق کی فتح کے بعد چونکہ لشکرِ اسلام کا رُخ اُردن کی طرف تھا لہٰذا قیصرِ روم کی فوجیں اردن ہی کے ایک صوبہ "بیسان" آ کر خیمہ زن ہو گئیں۔ اور ادھر اسلامی فوجوں نے بھی آگے بڑھ کر "فحل" کے مقام پر ڈیرے ڈال دیے جس کے بالکل سامنے "بیسان" واقع تھا۔ اس سے پہلے کہ لڑائی کا آغاز ہو رومیوں نے صلح کی بات چیت کے لیے حضرت ابو عبیدہ سے کہلا بھیجا کہ اپنا کوئی آدمی بھیجیں جو قابل اور لائق ہو تاکہ اُس شخص سے بات چیت کی جا سکے۔ حضرت ابو عبیدہ ابن الجراح نے حضرت معاذ بن جبل کو روانہ کیا۔ رومیوں نے اُن سے بہت سے سوال کیے جن میں ایک یہ بھی تھا کہ تمہارا بادشاہ کیسا

ہے؟ اس کے جواب میں حضرت معاذ بن جبل نے فرمایا تمھیں اس پر ناز ہے کہ تم ایسے شہنشاہ کی رعایا ہو جسے تمھاری جان و مال کا اختیار ہے۔ لیکن ہم نے جسے بادشاہ بنا رکھا ہے وہ کسی بات میں بھی اپنے آپ کو ترجیح نہیں دے سکتا۔ وہ اگر زنا کرے تو اُسے دُرے لگائے جائیں۔ وہ اگر چوری کرے، تو اس کے ہاتھ کاٹے جائیں۔ وہ پردے میں نہیں بیٹھتا۔ اپنے آپ کو ہم سے بڑا نہیں سمجھتا۔ مال و دولت میں اُسے ہم پر کوئی ترجیح نہیں۔ لیکن شاہ پرست رومیوں کے درمیان یہ بات چیت ناکام ہو گئی، کیونکہ اسلام قبول کرنے یا جزیہ دینے بصورتِ دیگر میدانِ جنگ میں نکلنے وغیرہ ایسی شرطیں رومیوں کو منظور نہیں تھیں۔ ہر چند وہ مسلمانوں سے ڈرتے تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ لڑائی نہ ہو لیکن اپنا جھوٹا وقار اور بھرم رکھنے کے لیے انھوں نے اپنے ایک افسر کو حضرت ابو عبیدہ ابن الجراح کے پاس براہِ راست بھیج کر مصالحت کی ایک بار پھر کوشش کی۔

رومی افسر حضرت ابو عبیدہ ابن الجراح کے پاس پہنچا، مگر یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ حضرت ابو عبیدہ ابن الجراح ایک سپہ سالارِ اعظم کی حیثیت سے بھی نہایت سادہ اور معمولی کپڑے پہنے ہوئے ہیں اور فرشِ خاک پر بیٹھ کر اپنے لشکر کے مجاہدوں سے بلا تکلف ہنس ہنس کر باتیں کر رہے ہیں۔ رومی افسر نے جب ان سے گفتگو کی تو مصالحت کی دیگر باتوں کے اپنی دانست میں بڑی فیاضی کے ساتھ ایک پیش کش یہ بھی کی تھی کہ اگر لشکرِ اسلام رومیوں کے ملک سے واپس چلے جانے پر آمادہ ہو تو

قیصر روم کی طرف سے اسلام کے لشکر کے ہر مجاہد کو دو دینار اور لشکر اسلام کے سپہ سالار (حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح) کو ایک ہزار دینار انعام کے طور پر دیے جائیں گے۔ حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح نے رومی افسر کی باتیں نہایت صبر و تحمل کے ساتھ سنیں۔ جب وہ سب کچھ کہہ چکا تو آپ نے فرمایا، تم لوگ (رومی) ہمیں اتنا ذلیل اور کم حیثیت خیال کرتے ہو کہ گویا ہم تمھارے دو دو دینار پا کر اسے بڑی دولت سمجھیں گے اور مالا مال ہو جائیں گے۔ میں تم سے بالکل صاف صاف کہے دیتا ہوں کہ ہم نہ مال دولت کے لالچ میں یہاں آئے ہیں نہ ہمیں اس کی کوئی پرواہ ہے۔ تم اگر ہمیں ایک لاکھ دینار بھی پیش کرو تو بھی ہم اس مطالبے سے الگ نہیں ہو سکتے کہ اسلام قبول کرو اور اگر یہ منظور نہیں تو جزیہ دو اور اگر یہ بھی ناگوار خاطر ہو تو آؤ ہم تم میدانِ جنگ میں نکل کر تلوار سے فیصلہ کیے لیتے ہیں۔ اور اس کے بعد تمھیں خود معلوم ہو جائے گا کہ ذلیل اور کم حیثیت کون ہے۔ تم کہ ہم؟

اب رومی افسر ناکام ہو کر چلا گیا اور دوسرے دن لڑائی شروع ہو گئی رومیوں نے آس پاس کی تمام نہروں کے بند توڑ دیے جس سے لشکر اسلام کی راہیں دلدل، کیچڑ اور پانی سے رک گئیں لیکن خدا کے فضل و کرم سے مسلمانوں کے عزم و استقلال کے سامنے اس کی کچھ حیثیت نہ تھی اور ان کا سیلاب کسی کے روکے سے رکنے والا نہ تھا۔ وہ نہایت ثابت قدمی سے لڑتے رہے اس موقع پر رومیوں نے اپنے لشکر کے تین حصے کیے، جن میں سے ایک حصہ فوج انھوں نے حضرت خالد بن ولید کی طرف بھیجا۔ حضرت خالد بن ولید نے

قیس بن ہبیرہ کو اس کے مقابلے کا اشارہ کیا جنھوں نے آگے بڑھ کر سخت حملہ کیا۔ اور بڑی خونریزی ہوئی۔ اسی دوران میں رومیوں کا دوسرا دستہ بھی آپہنچا۔ حضرت خالد بن ولید نے اس کے مقابلے میں علیسرہ بن مسروق کو بھیجا اور وہ آتے ہی دشمن رومیوں پر ٹوٹ پڑے۔ خونریزی ابھی جاری تھی کہ تیسرا دستہ بھی پہنچ گیا۔ اب رومیوں کے تینوں دستے ایک ساتھ مل کر لڑ رہے تھے کہ حضرت خالد بن ولید نے سب کو ایک ہی مرتبہ جالیا اور اس شدت سے حملہ آور ہوئے کہ رومی اُن کے حملے کی تاب نہ لاکر سب کے سب پیچھے ہٹتے چلے گئے۔ اب رومی منتظر تھے کہ اُن کی امداد کے لیے مزید رومی فوج آجائے۔ مگر حضرت خالد بن ولید کی تجربے کار اور دُوررس نگاہوں نے ان کی کمزوری کو بھانپ لیا اور حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ سے کہا کہ اب رومی فوج ہم سے مرعوب ہو چکی ہے۔ اس سے پہلے کہ انھیں کمک ملے، ان پر بھرپور حملہ کر دیا جائے۔ چنانچہ حضرت ابوعبیدہؓ ابن الجراح نے ان کی اس مناسب رائے سے اتفاق کرتے ہوئے دوسرے دن بھرپور حملہ کرنے کی تیاری شروع کر دی۔

حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح نے دوسرے دن لشکرِ اسلام کو اس طرح سے ترتیب دیا کہ معاذ بن جبل کو میمنہ پر مقرر کیا۔ ہاشم بن علتبہ کو میسرہ پر اور پیدل فوج پر سعید بن زید مقرر کیے گئے اس کے بعد سوار فوج حضرت خالد بن ولید کے ماتحت کر دی گئی۔

اس لڑائی میں رومی سپاہ کی تعداد پانچ ہزار تھی وہ بڑے ساز و سامان کے ساتھ نقّارے بجاتی ہوئی میدانِ جنگ میں آئی۔ اور جنگی نقطۂ نظر سے پانچ صفوں

میں تقسیم ہو کر لڑنے لگی۔ لشکرِ اسلام میں چونکہ سب سے آگے حضرت خالد بن ولید کا دستہ تھا چنانچہ سب سے پہلے انہی سے مقابلہ ہوا۔ رومیوں نے ان پر اس قدر تیر برسائے کہ مجاہدین پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ صورت دیکھ کر حضرت خالد بن ولید نے اپنی جگہ بدل کر رومیوں کے میمنہ پر حملہ کیا۔ اگرچہ مسلمانوں کی تھوڑی دیر کی ناکامی سے رومیوں کے حوصلے بڑھ گئے اور وہ اتنے دلیر ہو گئے تھے کہ ان کے میمنہ کی فوج نے باقی فوج سے الگ ہو کر حضرت خالد بن ولید کے دستے پر نہایت پُر زور حملہ کیا اور حضرت خالد بن ولید کا دستہ مصلحت سے پیچھے ہی پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ تاہم جب رومیوں کی فوج کا یہ دستہ حضرت خالد بن ولید کے دستے کو پیچھے دھکیلتا ہوا اپنی فوج سے بہت دُور نکل آیا تو حضرت خالد بن ولید اُن پر شیر کی طرح جھپٹے۔ یہاں تک کہ رومی فوج کا میمنہ سب کا سب گاجر مولی کی طرح کاٹ کے رکھ دیا۔

دوسری جانب قیس بن ہبیرہ مصروفِ جہاد تھے اور اُنھوں نے رومیوں پر سخت حملہ کر کے اُن کے میسرہ کو بے حد کمزور کر دیا۔ ابھی صرف قطب کی فوج مضبوطی کے ساتھ اپنی جگہ پر قائم تھی کہ یہ دیکھ کر اُن کی طرف ہاشم بن عتبہ بڑھے اور علم لے کر کہا کہ خدا کی قسم جب تک اسے رومیوں کے قطب میں نہ گاڑ آؤں واپس نہ آؤں گا۔ چنانچہ وہ گھوڑے سے کُود پڑے اور تلوار لے کر رومیوں کی فوج میں جا گھسے اور ایسی بے جگری سے لڑے کہ میدان جنگ کو رومی کافروں کے ناپاک خون سے لالہ زار بنا دیا۔ بالآخر رومیوں کے پاؤں اُکھڑ گئے اور وہ بدحواس ہو کر بھاگ نکلے اور میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔

فحل فتح کرنے کے بعد حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح نے فتح کی خوشخبری حضرت عمر فاروق کی خدمت میں بھجوائی اور لکھا کہ اب فحل کے باشندوں سے کیا سلوک کیا جائے۔ حضرت عمر فاروق رضؓ نے جواب میں لکھا کہ باشندوں کو "ذمی" قرار دیا جائے اور زمین بدستور کھیتی باڑی کرنے والوں کے پاس رہنے دی جائے۔ مختصراً یہ کہ فحل کی مہم سر ہو جانے کے بعد اُردن کے تمام شہر اور مقامات ایک ایک کر کے مسلمانوں نے آسانی سے فتح کر لیے۔ ان فتوحات میں جو اہم شرطیں غیر مسلم رعایا کے بارے میں طے کی گئیں وہ یہ تھیں کہ غیر مسلموں کی جان و مال اور ان کی عزت و آبرو، زمین، مکانات اور عبادت گاہوں کی پوری پوری حفاظت کی جائے گی۔

اب اردن کی فتح کے بعد شام کے تین بڑے اضلاع اور شہر حمص، بیت المقدس اور انطاکیہ وغیرہ باقی رہ گئے تھے۔ جن کی فتح گویا سارے شام کی فتح کرنے کے مترادف تھی۔ چنانچہ اُردن کی تسخیر کے بعد اب حمص کی باری آئی۔ حضرت ابوعبیدہ ابن الجراحؓ راستے میں چھوٹے موٹے جتنے ایک شہر آتے گئے یکے بعد دیگرے ان سب کو فتح کرتے ہوئے بالآخر حمص پہنچ گئے اور آتے ہی شہر کا محاصرہ کر لیا۔

حضرت ابوعبیدہ ابن الجراحؓ اور حضرت خالد بن ولید کے حمص پہنچنے سے پہلے ایک روز ایک صحابی جنھوں نے حمص کی جنگ میں بے مثال شجاعت اور جانبازی کے جوہر دکھائے تھے، تنہا حمص کی طرف چل نکلے۔ وہ جب شہر کے قریب پہنچے تو راستے ہی میں انھیں رومیوں کے ایک دستے نے گھیر لیا۔ صحابی نے بڑی جرأت سے رومیوں کا مقابلہ کیا اور اُن کے سات سواروں کو خاک و خون میں ملا کر

سارے دستہ پر تنہا غالب آ گئے۔ رومی یہ صورت دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے اور "دیر مسحل" نام ایک گرجا میں پہنچ کر چھپ گئے وہ صحابی اُن کا تعاقب کرتے ہوئے وہاں بھی پہنچ گئے اور خوب ڈٹ کر اُن کا مقابلہ کیا۔ لیکن یہاں گرجے میں چونکہ پہلے سے اور بھی کافی رومی افراد موجود تھے اس لیے ان سب نے مل کر ان پر حملے کیے۔ یہاں تک کہ وہ زخموں سے چُور چُور ہو کر گرے اور شہید ہو گئے۔ اب رومیوں کی ذہنیت دیکھیے کہ جب وہ ایک اکیلے بہادر کو سب مل کر شہید کرنے میں کامیاب ہو گئے تو بزعم خود اپنے آپ کو مسلمانوں کے مقابلے میں دلیر خیال کرنے لگے چنانچہ حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح اور حضرت خالد بن ولید جب حمص پہنچے تو رومیوں نے بڑی سرکشی دکھائی اور قیصر روم کی طرف سے امداد پہنچنے کے انتظار میں قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔

اگرچہ قیصر روم ہرقل نے اہلِ حمص کی امداد کے لیے ایک فوج روانہ کر دی تھی تاہم حضرت سعد بن وقاص نے جو اس وقت عراق کی مہم پر تھے، اپنی فوج کا ایک دستہ بھیج کر اُس کا راستہ روک لیا اور اس طرح اہلِ حمص نے ہرقل کی مدد سے محروم ہو جانے کے سبب آخر کار نہایت عجز و انکسار کے ساتھ اپنے آپ کو مسلمانوں کے حوالے کر دیا اور شہر کے دروازے کھول دیے۔ حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح اہلِ شہر سے بڑی مروّت کے ساتھ پیش آئے اور اُن پر حضرت عبادہ ابن صامت کو ناظم مقرر کر کے پھر آگے بڑھ گئے۔ راستے میں شیرز، حماۃ اور معرۃ النعمان کو فتح کرتے ہوئے آخر میں لاذقیہ پہنچ گئے اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ لاذقیہ کا قلعہ بہت مضبوط اور مستحکم تھا، اس لیے آسانی سے فتح نہیں ہو سکتا۔ حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح نے حکمتِ عملی سے کام لیتے ہوئے دشمن سے

چپکے چپکے اُس کے چاروں طرف غار کھدوا دیے۔ پھر جب یہ کام مکمل ہو گیا اور دشمن رومی اس عرصے میں تمام کارروائی سے قطعی بے خبر رہے تو انھیں دھوکے میں ڈالنے کے لیے محاصرہ اُٹھا کر حمص کی طرف چل دیے۔ رومیوں نے جو دیکھا کہ لشکرِ اسلام تنگ آنے سے اُٹھ کر چل دیا تو اُسے اپنے حق میں تائیدِ غیبی خیال کیا اور شہر پناہ سے باہر نکل آئے اور اپنے اپنے کام کاج میں لگ گئے۔ اِدھر لشکرِ اسلام جو تھوڑی دُور جا کر رات کے اندھیرے میں واپس آ گیا تھا اور غار میں چُھپ کر بیٹھ گیا تھا۔ دشمن رومیوں کو غافل پا کر صبح ہوتے ہی اُن پر ٹوٹ پڑا۔ رومی اس غیر متوقع حملے سے بوکھلا اُٹھے اور ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہو گئے۔

لاذقیہ کی فتح کے بعد اب حضرت ابوعبیدہؓ ابن الجراحؓ نے قیصرِ روم ہرقل کے پایۂ تخت انطاکیہ کا ارادہ کیا۔ لیکن حضرت عمر فاروقؓ نے بعض مصلحتوں کو سامنے رکھتے ہوئے حکم دیا کہ اس سال مزید آگے بڑھنے کا ارادہ نہ کیا جائے۔ چنانچہ اسلامی لشکر جہاں تہاں تھا وہیں رُک گیا اور بڑے بڑے مفتوحہ شہروں میں نظم و نسق کے قائم رکھنے کے لیے افسروں کو مقرر کر دیا گیا۔ مثلاً حضرت خالد بن ولید دمشق پر۔ حضرت ابوعبیدہ ابن الجراحؓ حمص پر اور حضرت عمرو بن عاص حمص پر منتظم و نگراں مقرر ہوئے۔

اس دوران میں دمشق، اردن اور حمص وغیرہ کے متعصب عیسائی بھاگ بھاگ کر انطاکیہ آ رہے تھے اور قیصر سے فریاد کرنے لگے کہ مسلمانوں نے سارے شام کو زیر و زبر کر ڈالا۔ اگر تم نے ان کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو آگے بڑھ کر نہ روکا تو سمجھ لو کہ پھر تمھارا دارالسلطنت بھی اس کی نذر ہو جائے گا۔ خیریت چاہتے

ہو تو مسلمانوں کے مقابلے کی تیاریاں کرو۔ قیصر نے کہا تم جانتے ہو کہ مسلمانوں کی تعداد کتنی ہے اور طاقت کے لحاظ سے بھی وہ تم سے کتنے کم ہیں لیکن اس کے باوجود سمجھ میں نہیں آتا کہ تم ان لوگوں کے مقابلے میں کیوں منہ کی کھاتے ہو۔ ایک تجربے کار بڈھے رومی نے آگے بڑھ کر کہا۔ اس کا سبب میری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ مسلمانوں کا اخلاق اچھا اور کردار عمدہ ہے۔ وہ رات کو عبادت کرتے ہیں، دن میں روزہ رکھتے ہیں۔ شراب کو ہرگز منہ نہیں لگاتے۔ آپس میں برابری اور بھائی چارگی کا سلوک کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کی فوج کا سپہ سالار بھی اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا نہیں سمجھتا نہ اپنے آپ کو دوسروں پر کوئی ترجیح اور فوقیت دیتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارا حال یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہیں۔ بدکاریوں میں گرفتار ہیں اور اپنے قول و قرار کا کوئی پاس اور لحاظ نہیں کرتے۔ نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ مسلمانوں کے ہاں جو عدیم المثال جوش اور استقلال پایا جاتا ہے وہ ہم میں نہیں ملتا۔

ہر چند پے در پے شکست و ناکامی نے قیصر روم ہرقل کو شکستہ دل کر دیا اور وہ چاہتا تھا کہ ملک شام کو خیر آباد کہہ کر قسطنطنیہ چلا جائے لیکن جب ملک کے طول و عرض سے لوگ اُس کے پاس فریاد لے لے کر پہنچے اور مسلمانوں کے خلاف اُس کے انتقامی جذبات کو اُبھارتے تو آخر کار وہ مجبور ہو گیا اور اُس نے مسلمانوں سے ایک آخری اور فیصلہ کن جنگ لڑنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اب اُس نے شام کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی اور مختلف حصوں میں بٹی ہوئی رومی فوج کو انطاکیہ میں ایک جگہ اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ اس کے علاوہ اپنے ماتحت

تمام حکمرانوں اور افسروں کو بھی لکھ بھیجا کہ وہ اپنے اپنے علاقے سے جتنی جلدی ہو سکے فوج لے کر انطاکیہ پہنچ جائیں۔ غرض تھوڑی ہی مدت میں رومیوں کا ایک لشکرِ جرار انطاکیہ میں اکٹھا ہو گیا۔ عالم یہ تھا کہ جدھر نگاہ اُٹھتی تھی رومیوں کا ٹڈی دل دکھائی دیتا تھا۔ مؤرخین کہتے ہیں کہ اُس وقت کم و بیش دو لاکھ رومی سپاہ مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے انطاکیہ میں تیار ہو چکی تھی۔

اِدھر جب مسلمانوں کو ان حالات کا پتہ چلا تو حضرت ابو عبیدہ ابن الجراح نے نئی صورتِ حال سے حضرت عمر فاروقؓ کو مطلع کیا اور مقابلے کے لیے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس وقت سب سے زیادہ اہم اور نازک مسئلہ اُن بکثرت مسلم خواتین کا تھا جو مسلمانوں کے ہمراہ تھیں اور میدانِ جنگ میں مجاہدین کی مرہم پٹی، خاطر تواضع اور پانی وغیرہ پلانے کے امدادی کام انجام دیتی تھیں۔ حضرت یزید بن ابو سفیان نے تجویز کیا کہ خواتین کو لاذقیہ میں چھوڑ دیں اور خود ایک جگہ اکٹھے ہو کر دشمن رومیوں کا مقابلہ کریں۔ لیکن حضرت شرحبیل بن حسنہ نے اس تجویز کی مخالفت کی اور کہا کہ شہر کے باشندے عیسائی ہیں اس لیے اُن پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے وہ تعصب سے ان مُسلم خواتین کو دشمنوں کے حوالے کر دیں یا پھر خود ہی انھیں مار ڈالیں۔ اس پر حضرت ابو عبیدہ ابن الجراح نے کہا یہ مشکل اس طرح سے آسان ہو سکتی ہے کہ ہم شہر کو عیسائیوں سے خالی کرا لیں اور اسلامی فوج کا ایک دستہ خواتین کی حفاظت کے لیے یہاں مقرر کر دیا جائے۔ حضرت شرحبیل بولے یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں (عیسائیوں) کو ہم پناہ دے چکے ہیں اُنھیں یہاں

سے نکال باہر کریں۔ اب انھیں شہر سے نکلنے کا ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا۔ بالآخر حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح نے بہ طیبِ خاطر اپنی اس غلطی کو تسلیم کیا اور طے پایا کہ خواتین بھی مجاہدین اسلام ہی کے ساتھ رہیں۔

اب دوسرا مسئلہ یہ درپیش تھا کہ مجاہدینِ اسلام جو تعداد کے اعتبار سے بہت تھوڑے ہیں وہ قیصرِ روم کی اُن عظیم الشان فوجوں کا مقابلہ کس طریقے سے کریں جو مجاہدینِ اسلام سے کئی گنا زیادہ ہیں۔ عام خیال یہ تھا کہ حمص میں ٹھہر کر امدادی فوجوں کا انتظار کیا جائے۔ لیکن حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح نے کہا کہ اب دشمن رومی سپاہ اس قدر قریب آچکی ہے کہ امدادی فوج کی انتظار میں رہنا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ آخر میں کافی بحث وتمحیص کے بعد بات یہ طے پائی کہ اُن تمام اسلامی فوجوں کو جو مختلف محاذوں پر دشمنوں سے مصروفِ پیکار ہیں واپس بُلا کر ایک جگہ اکٹھا کر لیا جائے اور اس کے علاوہ تمام ایسی فوجیں بھی واپس بُلا لی جائیں جو مختلف مفتوحہ مقامات پر اُن کے نظم ونسق کے بحال اور نگرانی کرنے کے لیے مقرر ہیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ حضرت خالد بن ولید کو حمص سے اور حضرت عمرو بن عاص کو اُردن سے واپس بُلا لیا گیا۔ اور یہ تمام حضرات دمشق میں حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح کے پاس اپنی اپنی فوجیں لے کر اکٹھے ہو گئے۔

اس موقع پر جزیے سے متعلق حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح نے یہ بات سپہ سالاروں کو خاص طور پر ذہن نشین کرائی کہ جب وہ اپنے اپنے مقام سے اسلامی فوج لے کر چلیں تو جزیے کی وہ تمام رقمیں وہاں کے باشندوں

کو واپس کر دیں جو مال و جان کی حفاظت کے بدلے میں اُن سے وصول کی ہیں۔ کیونکہ جب ہم اس نازک موقع پر اُن کی حفاظت ہی نہیں کر سکتے تو اُن سے جزیے کی رقم کیونکر لے سکتے ہیں جو اصل میں اُن کی حفاظت کرنے کا معاوضہ ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہمارے اور اُن کے درمیان تعلقات بدستور وہی رہیں گے۔ لیکن ایسے حالات میں جزیہ وصول کرنا سر دست ہمارے لیے جائز نہیں۔ چنانچہ حضرت ابوعبیدہ ابن الجراحؓ کے حکم کی تعمیل میں جزیے کی تمام رقمیں جو کئی لاکھ تک پہنچتی تھیں سب کی سب مفتوحین کو واپس کر دی گئیں اور تمام اسلامی فوجیں دمشق میں جمع ہو گئیں۔

اب دمشق میں تمام اسلامی فوجوں کے اجتماع کے بعد حضرت ابوعبیدہ ابن الجراحؓ انھیں لے کر یرموک کے مقام پر پہنچ گئے۔ اتنے میں رومی فوجیں بھی آ پہنچیں اور دونوں نے آمنے سامنے ڈیرے ڈال دیے۔ ہر چند رومی لڑنے کو نکلے تھے لیکن دل سے یہی چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی تیغ خارا شگاف سے انھیں پالا نہ پڑے۔ چنانچہ اس سے پہلے کہ لڑائی چھڑے انھوں نے مصالحت کے لیے رومی سپہ سالار باہان نے ایک شخص جارج کو حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح کے پاس بھیجا۔

جس وقت جارج مسلمانوں کے لشکر میں پہنچا وہ نماز مغرب کی تیاری کر رہے تھے۔ اور تھوڑی ہی دیر میں وہ نماز میں مصروف ہو گئے۔ جارج نے جب مسلمانوں کی یہ تنظیم اور خضوع و خشوع کو پہلی مرتبہ دیکھا اور مسلمانوں کو نماز میں بڑی محویت اور استغراق کے عالم میں پایا تو اُس کا دل آپ سے آپ

پکار اُٹھا کہ یہ لوگ ضرور حق پرست ہیں۔ چنانچہ مسلمان جب نماز سے فارغ ہوئے تو اس نے حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح سے چند ایک سوالات کیے۔ اور شافی جوابات پا کر پھر وہ بہ طیب خاطر مسلمان ہو گیا۔ اب وہ اپنے لشکر واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح نے کہا کہ اس وقت تو تمہارا واپس جانا ہی مناسب ہے اور جب دوسری مرتبہ تمہارا دل چاہے تو آ جانا اور پھر ہمارے ہی پاس رہنا۔

دوسرے دن تنہا حضرت خالد بن ولید گفتگو کے لیے رومیوں کے لشکر میں گئے، لیکن رومی اُن کی کوئی شرط ماننے پر تیار نہیں ہوئے۔ لہٰذا بات چیت ناکام ہو گئی اور حضرت خالد بن ولید واپس آ گئے اور آپ نے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس موقع پر حضرت خالد بن ولید نے ایک جنگی نقطہ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح سے کہا کہ آپ اگر مناسب سمجھیں تو فوج کا سارا انتظام میرے سپرد کر دیں اور تمام افسروں کو ہدایت فرما دیں کہ وہ مجھ سے تعاون کریں۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں فتح و نصرت سے ضرور سرفراز فرمائے گا۔ حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح نے بہ طیب خاطر تمام فوجوں کی کمان حضرت خالد بن ولید کو سونپ دی اور حضرت خالد بن ولید نے بڑی قابلیت اور عمدہ صلاحیت کے ساتھ اسلامی فوجوں کو نئے سرے سے مرتب کیا اور ایک عمدہ قرینے اور سلیقے سے انھیں لا کر رومی فوجوں کے بالمقابل کھڑا کر دیا۔ اس موقع پر مجاہدینِ اسلام کی تعداد صرف تیس ہزار تھی۔ اس کے برعکس رومیوں کا لشکر چار لاکھ تھا

اب جنگ شروع ہوئی گھمسان کا رن پڑا۔ دونوں طرف سے بہادروں نے دادِ شجاعت دینا شروع کیا اور بہت بڑھ بڑھ کر ایک دوسرے پر وار کیے۔ آج ابوسفیان ابنِ حرب۔ یزید ابن ابوسفیان امیر معاویہ ابن ابی سفیان اور ہندہ زوجہ ابوسفیان غرض اُموی قریشیوں کا سارا مقتدر گھرانا شام کے محاذ میں شریک ہو کر دشمن اسلام رومیوں سے مصروفِ پیکار تھا۔ اللہ اکبر! ایک زمانہ وہ بھی تھا جب ابوسفیان کو یہ بدگمانی تھی کہ محمدؐ رسول اللہ، ہاشمی قریشیوں کو برسرِ اقتدار لانے اور اموی قریشیوں کی سیادت مکہ کو مٹانے کے لیے یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ چنانچہ پورے بیس برس تک اسلام کی مخالفت کی۔ پھر جب دیدہ آنکھوں نے دیکھ لیا اور دل میں سچا یقین اور ایمان پیدا ہو گیا کہ محمدؐ رسول اللہ کی تمام تر کوششوں کا ماحصل صرف رسالت کے فریضہ کو ادا کرنا ہے۔ کوئی ہاشمی ریاست قائم کرنا مقصود بالذات نہیں تو اسلام کی ترقی کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ ابوسفیان کی ایک آنکھ تو جنگ طائف میں غذائے جنگ ہو چکی تھی اور اب دوسری آنکھ اس جنگ میں تلف ہو گئی۔ لیکن اس کے باوجود اپنے بیٹوں کو برابر تلقین اور ہدایت کی۔ یزید بن ابوسفیان سے کہا۔ اے بیٹا! آج تیرے امتحان کا دن ہے، دیکھنا کمزوری نہ دکھانا تو قریش کے سردار کا فرزند ہے تجھے چاہیے کہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ بہادری اور شجاعت کے جوہر دکھائے۔

وہ ہندہ زوجہ ابوسفیان جس پر ایام جاہلیت میں پیغمبرِ اسلام کے محبوب چچا سیدالشہداء حضرت حمزہ بن عبدالمطلب کا کلیجہ چبانے کا الزام ہے۔ رحمۃ اللعالمین کی بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئی اور اسلام قبول کرنے کا شرف

حاصل ہوا تاہم آج شاید تلافی مافات کے لیے وہ بھی میدانِ جنگ میں تلوار لیے موجود تھی۔ اور مجاہدینِ اسلام کے حوصلے بڑھا رہی تھی اور یہ بھی کہتی جا رہی تھی کہ دیکھو اے مسلمانو تم میں سے جو شخص رومیوں کے مقابلے سے بھاگے گا میں اسی تلوار سے اُس کی گردن اُڑا دوں گی۔

آج مشہور دشمنِ اسلام ابوجہل کا بیٹا عکرمہ بھی مصروفِ جہاد تھا۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ اپنے باپ کے دوش بدوش اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے کی کوششیں کرتا رہا اور فوجیں لے لے کر کئی مرتبہ حضورؐ پیغمبرِ اسلام پر بھی حملے کیے۔ لیکن پھر جب اُسے اپنی رضا و رغبت سے اسلام قبول کرنے کا شرف حاصل ہوا اور دل و دماغ نے ایمان و یقین کے نُور سے جلا پائی تو اسلام اور مسلمانوں کی خدمت اور حفاظت کے لیے جہاد میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لینے کے لیے وہ بھی آج میدانِ جنگ میں موجود تھا۔

اب عکرمہ میدانِ جنگ میں آئے تو بولے، اے رومیو! میں وہ ہوں جس نے محمدؐ کا مقابلہ کیا ہے۔ کیا آج میں تمھارے مقابلے سے ہٹ جاؤں گا ہرگز نہیں پھر یہ کہہ کر عکرمہؓ نے اپنے دستے کی طرف رُخ کیا اور کہا کہ آج اسلام پر مرنے کے لیے کون میرے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے۔ یہ سن کر چار سو مجاہد جن میں ضرار بن ازور بھی تھے۔ عکرمہ کے ساتھ ہو لیے۔ ہر چند حضرت عکرمہ بن ابوجہل مردانہ وار لڑتے لڑتے شہید ہو گئے تاہم شہادت سے پہلے انھوں نے بھی کئی ہزار دشمنِ اسلام رومیوں کا صفایا کر ڈالا۔

اگرچہ لڑائی اب تک فیصلہ کُن مرحلے میں داخل نہیں ہوئی تاہم مجاہدینِ اسلام جس انداز سے دادِ شجاعت دے رہے تھے وہ نظارہ بدعت پسند اور لیمان فروز

تھا۔ قباث بن اشیم کا حال یہ تھا کہ اُن کے ہاتھ سے تلواریں اور نیزے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے جاتے تھے اور وہ یہ کہتے جاتے تھے کہ کوئی ہے جو اس شخص کو نیزہ یا تلوار دے جس نے خدا سے اقرار کیا ہے کہ میدانِ جنگ سے ہٹے گا تو مر کر ہٹے گا۔ مسلمان فوراً تلوار یا نیزہ لا کر انھیں دے دیتے۔ ابوالاعور ایک مجاہد گھوڑے سے کود پڑے اور اپنے دستے کے مجاہدوں سے کہا۔ صبر و استقلال دنیا میں عزت اور آخرت میں رحمت کا موجب ہے۔ دیکھنا یہ دولت و نعمت ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ ایک مجاہد سعید بن زید تھے کہ شیر کی طرح جھپٹ جھپٹ کر حملے کر رہے تھے اور ان کے ہاتھ سے رومیوں کے مقدمہ لشکر کا افسر واصلِ جہنم ہوا۔ یزید بن ابی سفیان بھی نہایت ثابت قدمی سے لڑتے رہے۔ شرجیل بن حسنہ کی حالت یہ تھی کہ وہ رومیوں کے گھیرے میں آجانے کے باوجود پہاڑ کی طرح ثابت قدم تھے اور یہ کہتے جاتے تھے کہ خدا کے ساتھ سودا کرنے والے اور خدا کے ہمسایہ بننے والے کہاں ہیں۔ یہ آواز جس کے کان میں پہنچتی وہ بے اختیار پلٹ کر حملہ کرتا حتیٰ کہ رومیوں کا زور ٹوٹ گیا۔

ابھی تک رومیوں کا پلہ بھاری دکھائی دیتا تھا۔ لیکن قیس بن ہبیرہ جو تھوڑے سے مجاہدوں کے ساتھ میسرہ کی پشت پر تھے۔ وہ جونہی عقب سے نکلے اور جوش و خروش سے رومیوں پر حملہ آور ہوئے تو رومیوں کے قدم اکھڑ گئے اگرچہ رومی افسروں نے اپنی فوج کو سنبھالنے کی بڑی کوشش کی تاہم شکست خوردہ فوج پھر کسی طرح نہ سنبھل سکی۔ آخر کار جب سعید بن زید نے بھی قلب سے نکل کر سخت حملہ کیا تو رومی سپاہ میں بھگدڑ مچ گئی اور وہ بے شمار لاشوں

اور زخمیوں کو چھوڑ کر میدان جنگ سے بھاگ نکلے۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ اس لڑائی میں جو یرموک کے مقام پر لڑنے کے سبب جنگِ یرموک کے نام سے مشہور ہے رومیوں کے ایک لاکھ سے زیادہ سپاہی قتل ہوئے اور مسلمانوں کے تین ہزار مجاہدوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔

اس شکست کے بعد قیصرِ روم بڑی حسرت و یاس کے ساتھ شام کو الوداع کہہ کر قسطنطنیہ چلا گیا۔ اور شام اور اس کے دوسرے بہت سے شہر اور مقامات ایک ایک کر کے سب کے سب مسلمانوں کے زیرِ نگیں ہو گئے۔ مثلاً قنسرین، حلب اور انطاکیہ وغیرہ پھر جب مسلمانوں کا قبضہ ہوا تو ان علاقوں کے باشندوں میں سے کچھ لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ لیکن ان کی اکثریت اپنے ہی مذہب پر قائم رہی اور جزیہ ادا کرنے کا اقرار کیا۔ اس کے علاوہ بعض علاقوں کے باشندوں نے اسلام قبول کیا۔ نہ جزیہ ادا کرنے کا اقرار کیا بلکہ صرف اس شرط پر مسلمانوں کے ساتھ صلح کی کہ وہ جنگ کی صورت میں اپنی فوجی خدمات پیش کریں گے۔

اب یرموک کی مہم سے فراغت پا کر حضرت ابوعبیدہ ابن الجرّاح نے بیت المقدس کا رُخ کیا اور آتے ہی شہر کا محاصرہ کر لیا۔ اہلِ شہر نے کچھ دنوں تو مسلمانوں کا مقابلہ کیا۔ لیکن پھر جب انھوں نے اسلحہ کی کمی اور عسکری طاقت کی قلت پائی اور یہ بھی دیکھا کہ اب اُن کی مدد کو پہنچنے والا کوئی اور سورما نہیں رہا۔ ایک قیصرِ روم ہرقل سے توقع کی جا سکتی تھی لیکن اب مسلمانوں کے خوف سے وہ بھی فرار ہو کر قسطنطنیہ جا بیٹھا تو اہلِ شہر نے جلد ہی ہتھیار ڈال دیے۔ اور بیت المقدس کا حاکم ارطبون اپنے ساتھ چند سپاہی لے کر مصر کی طرف بھاگ نکلا۔

چونکہ بیت المقدس بنی اسرائیل کے تمام رسولوں اور نبیوں کا مرکز اور گہوارہ رہ چکا تھا اس لیے بنی اسرائیل کی طرح مسلمانوں کے دلوں میں بھی اس شہر کی خاص عزت اور احترام تھا۔ چنانچہ اہلِ شہر نے بیت المقدس کی تقدیس و تعظیم کی راہ سے حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح سے کہلا بھیجا کہ تمھیں تو نہیں، ہاں اگر تمھارے خلیفہ حضرت عمر خود تشریف لائیں تو شہر کی کنجیاں ہم فردِ واحد کے حوالے کرنے کو تیار ہیں۔ چنانچہ حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح نے مدینے خط لکھا اور حضرت عمر فاروق رضؓ تمام حالات سے باخبر ہوئے۔ حضرت عمر رضؓ نے حضرت علی ابنِ ابی طالب کو اپنا قائم مقام کیا اور ایک غلام کو ساتھ لے کر بیت المقدس کی طرف روانہ ہو گئے۔ تمام عرب و فارس اور شام کے یہ عظیم الشان خلیفہ حضرت عمر فاروق رضؓ جنھوں نے روم و ایران ایسی باجبروت حکومتوں کے تختے الٹ دیے تھے۔ جس شان سے بیت المقدس کے سفر پر چلے اس کی کیفیت سننے سے تعلق رکھتی ہے چاہیے تو یہ تھا کہ ایک لشکر جرار ان کے جلو میں اور اعیان و خدام پابہ رکاب ہوتے لیکن یہاں اُن کے سفر کی حالت ہی اس کے بالکل برعکس تھی۔ زادِ راہ کے لیے ستوؤں کے سوا کچھ نہ تھا اور سواری میں صرف ایک اونٹ تھا جس پر کبھی آقا (حضرت عمر فاروق رضؓ) سوار ہوتے اور کبھی غلام۔ جابیہ کے مقام پر حضرت خالد بن ولید اور دوسرے سپہ سالاروں نے ان کا استقبال کیا۔ حضرت عمر فاروق رضؓ نے مجاہدینِ اسلام کے قیمتی اور پُرتکلف لباس کی طرف دیکھا تو نہایت رنج کے ساتھ فرمایا۔ افسوس کہ تم نے اس قدر جلد عیسائیوں کی عادات اور اُن کے طور طریقے اختیار کر لیے۔ مگر جب مجاہدین نے

عرض کیا یہ چیزیں اس ملک میں اتنی ہی قیمت میں ملی ہیں کہ جتنی قیمت میں عام اشیاء عرب میں ملتی ہیں تو حضرت عمر فاروق رضؓ مطمئن ہو گئے۔

اب جابیہ سے چل کر حضرت عمر فاروقؓ وہی پھٹے پرانے کپڑے پہنے جو روزمرہ پہنتے بیت المقدس پہنچے۔ جب اہلِ شہر نے ان کی اس بے تکلفی اور سادگی کو دیکھا تو وہ دنگ رہ گئے اور پھر جب یہ بات بھی سامنے آئی کہ اپنی باری کے مطابق اونٹ پر غلام سوار ہے اور اس کی مہار پکڑے وہی آقا یعنی (حضرت عمر فاروق) چلے آ رہے ہیں جو آج اُن کے نزدیک دُنیا کے سب سے بڑے طاقتور اور باجبروت شہنشاہ ہیں تو اُن کی حیرت اس سے بھی سوا ہو گئی انھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ لیکن آخر کار انھیں یقین کرنا ہی پڑا۔ حضرت عمر فاروق نہایت نرمی اور ملاطفت کے ساتھ اُن سے پیش آئے اور امن و آشتی کا پروانہ لکھ کر انھیں عطا کیا۔

بیت المقدس کی فتح کے بعد اب جزیرہ اور آرمینیا کے لوگوں کو بیحد فکر پڑ گئی۔ اُن کا خیال تھا کہ اب مسلمانوں کی طرف سے اُن پر بھی حملہ ہوگا چنانچہ اُنھوں نے جلد ہی قیصر روم کو لکھا کہ اگر تم نے مسلمانوں پر فوج کشی کی تو نہایت معقول طریقے پر ہم تمھاری مدد کرنے کو تیار ہیں۔ قیصر نے سوچا کہ شاید اہلِ آرمینیا کی امداد ہی سے میری بگڑی ہوئی تقدیر سنور جائے چنانچہ اُس نے فوراً ایک لشکر تیار کر کے مسلمانوں سے آخری بازی کے طور پر ایک مرتبہ پھر لڑنے کی ٹھان لی اِدھر وعدے کے مطابق اہلِ آرمینیا نے بھی تیس ہزار سپاہ اس کی مدد کے لیے بھیج دیے اور حمص کے میدان میں یہ سب فوجیں اکٹھی ہو گئیں۔

حضرت ابو عبیدہ ابن الجراحؓ نے ان تازہ حالات سے حضرت عمر فاروقؓ کو خط لکھ کر فوراً مطلع کیا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے سلطنت اسلامیہ کے آٹھ بڑے بڑے شہروں میں فوجی چھاؤنیاں مقرر کی ہوئی تھیں۔ اُنھوں نے سب جگہ لکھ بھیجا کہ جس قدر سپاہی جا سکیں فوراً ابو عبیدہؓ کی مدد کے لیے پہنچ جائیں۔ چنانچہ حضرت ابو عبیدہ ابن الجراحؓ کو خاصی کمک بر وقت پہنچ گئی اور اس کے بعد وہ لشکرِ اسلام کو لے کر مصروفِ جہاد ہو گئے۔

اگرچہ رومی فوج تھوڑی دیر تو جم کر لڑتی رہی لیکن آخر میں مسلمانوں کی تیغ خارا شگاف کے جوہر دیکھ کر اُن کے حوصلے جاتے رہے اور میدانِ جنگ میں کئی ہزار لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلے اور اس معرکے کے بعد پھر اُن میں کبھی اتنی جرأت نہ پیدا ہو سکی کہ وہ اس علاقے میں مسلمانوں سے جنگ کر سکیں۔ اس کے علاوہ حضرت ابو عبیدہ نے خیال کیا کہ اس فتنے کے اصل بانی مبانی جزیرہ اور آرمینیا والے ہیں۔ اگر ساتھ کے ساتھ ان کی بھی مزاج پرسی نہ کی گئی تو ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ کل پھر کوئی فتنہ کھڑا کر دیں۔ چنانچہ اس مہم سے فراغت پا کر ان کی طرف بھی توجہ کی گئی۔ غرض آرمینیا اور اس کے تمام شہر اور الجزیرہ اور اس کے تمام علاقے ایک ایک کر کے فتح کر کے انھیں اسلام کی سلطنت میں شامل کر دیا۔

وفات

سنہ ۱۸ھ میں ملک شام میں ایک ایسا خوفناک طاعون پھوٹ پڑا، جو

۱۸ھ تک مسلسل قائم رہا اور اس کے اثرات بڑھتے بڑھتے عراق تک پھیل گئے۔ اس مرض ناگہانی اور بلائے آسمانی کی روک تھام کے لیے حضرت عمر فاروقؓ نے بہ نفسِ نفیس شام کا سفر کیا اور وہاں پہنچ کر بڑے بڑے صحابہ سے صلاح و مشورے کیے۔ اور حضرت ابو عبیدہ ابن الجراح کو حکم دیا کہ وہ مجاہدین اسلام کو نشیبی علاقوں سے نکال کر بالائی (پہاڑی) علاقوں میں پھیلا دیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ حضرت ابو عبیدہ ابن الجراحؓ حکم کی تعمیل کر سکیں۔ اُن پر طاعون اثر کر چکا تھا وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

حضرت ابو عبیدہ ابن الجراحؓ کے جنازے کی نماز اُن کے قائم مقام حضرت معاذ بن جبل نے پڑھائی اور وہ پھر خود بھی طاعون ہی میں مبتلا ہو کر جاں بحق تسلیم ہوئے ——— اگرچہ حضرت ابو عبیدہ ابن الجراحؓ کے انتقال کے بعد حضرت عمرو بن عاص نے اسلامی لشکر کو نشیبی علاقے سے بالائی علاقے میں پہنچا دیا۔ تاہم ان تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود بھی پچیس ہزار مسلمان طاعون کے مرض میں شہید ہو گئے۔

1·4 -

عمروؓ بن عاص

نام و نسب

عمرو بن عاص بن وائل بن ہشام بن سعد بن عمرو بن ہصیص بن کعب قریشی۔
آپ قریش کے ایک مشہور قبیلہ سہم سے تھے۔ یہ قبیلہ کعب پر آکر پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نسب سے جا ملتا ہے۔ شعر و ادب اور سخاوت و مہمان نوازی اس قبیلے کا امتیازی وصف ہے۔ قیس بن علی بن حارث بن سعید اور عمرو بن عاص کے والد عاص بن وائل بنی سہم کے ایک ایسے دو ممتاز فرد تھے جن کی سیادت و عظمت قریش کے تمام قبیلوں میں مسلّم تھی۔

ظہور اسلام پر اس قبیلے میں سے جو لوگ سب سے پہلے مسلمان ہوئے ان میں سے حذافہ سہمی کے دو بیٹے قیس اور عبداللہ بھی تھے۔ عبداللہ کو حضورؐ پیغمبر اسلام نے اپنا سفیر خاص مقرر کر کے شاہ ایران کے دربار میں اسلام کا دعوت نامہ دے کر بھیجا تھا۔ نیز ان دونوں بھائیوں نے حضورؐ کے حکم کے مطابق حبشہ کی طرف ہجرت بھی کی تھی۔ علاوہ ازیں عمرو بن عاص کے چھوٹے بھائی ہشام اور بڑے بیٹے عبداللہ بھی ابتدائے اسلام ہی میں ایمان لے آئے تھے۔

ولادت

عمرو بن عاص کی ولادت واقعہ فیل سے چھ سال بعد اور سیدنا عمر فاروق کی ولادت سے سات برس پہلے مکہ میں ہوئی۔ آپ کے والد عاص کی دو بیویاں تھیں۔ ایک سلمہ دوسری ہرملہ مگر اسلام کی سعادت صرف سلمیٰ ہی کے اس بیٹے عمرو بن عاص کو نصیب ہوئی۔ فتوحات اسلامی میں جن کا نام خاص طور پر نمایاں ہے۔

عمرو بن عاص کی کنیت ابو عبداللہ اور ابو محمد تھی۔ آپ کا خاندان اہل قریش میں بڑی عزت اور احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ جس کی تجارت کا سلسلہ عرب و یمن تک پھیلا ہوا تھا۔ اخلاقی فضائل کے اعتبار سے علم و کرم بھی اس خاندان کی خاص علامت تھی۔

اگرچہ اس زمانے میں لکھنے پڑھنے کا کوئی خاص رواج نہ تھا۔ تاہم عمرو بن عاص نے باقاعدہ طور پر لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا اور اس میں کافی حد تک مہارت بھی پیدا کر لی تھی نیز معاملہ فہمی، دور اندیشی، عزم و استقلال، ہمت اور اولوالعزمی تو انھیں ورثے میں ملی تھی۔

عمرو بن عاص جب جوان ہوئے تو انھوں نے شام اور حبشہ کے کئی ایک سفر کیے۔ جن میں انھیں مختلف قوموں سے ملنے کا موقع ملا اور ان سے مل کر ان کی معلومات بڑھیں، ان کے ذہنی رجحانات اور خیالات کو جلا ملی اس کے علاوہ

مختلف قوموں کے رسم و رواج اور ان کے طور طریقوں کا پتہ بھی چلا۔

چونکہ اُس زمانے میں قریش مکہ کے تمام بڑے بڑے سردار تجارت کیا کرتے تھے اور اس پیشے کو نہایت معزز جانتے تھے۔ اس لیے عمرو بن عاص کے والد عاص بن وائل کا پیشہ بھی دیگر سرداران قریش کی طرح تجارت تھا۔ ان دنوں عراق و شام، مصر و فلسطین اور یمن و حبش وغیرہ ممالک تجارتی مراکز شمار کیے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ تہذیب و تمدن کے لحاظ سے بھی یہ ممالک اُس وقت ساری دنیا میں ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ عمرو بن عاص بھی تجارتی سفر میں ایک ایک کر کے ان تمام ملکوں میں ہو آئے جس سے وہ ایک طرف تو ان ملکوں کی تہذیب و تمدن سے متاثر ہوئے۔ دوسری طرف ان ملکوں کے تمام بڑے بڑے آدمیوں سے ان کی رسم و راہ پیدا ہو گئی۔ اور ان کے تعلقات مختلف ملکوں کے رئیسوں سے استوار ہو گئے۔

عداوت

اسلام سے عداوت اور دشمنی قریش کے دوسرے قبیلوں کی طرح بنی سہم کو بھی خاص طور سے تھی۔ عاص بن وائل اور خود عمرو بن عاص کا نام جہالت کے ایام میں اسلام کے دشمنوں کی فہرست میں تھا حتّٰی کہ عمرو بن عاص نے اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے میں کوئی کسر نہیں اٹھائی۔ لیکن جب خدا نے ان کے دل کو صداقت کی طرف پھیر دیا اور اُن کے قلب و نظر نے اسلام کے سچا ہونے کی گواہی دی تو صادق دل سے اسلام لے آئے۔

اسلام قبول کرنے کے واقعے کو عمرو بن عاص نے ایک مرتبہ خود ہی بیان کیا کہنے لگے ایام جہالت میں جب وہ اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے کی سعی میں پیش پیش تھے اور مکہ کے اُن بے کس اور بے سہارا مہاجروں کو مزید ستانے کے لیے حبشہ پہنچے جنھیں حبشہ کے بادشاہ نے اپنی پناہ میں لے کر کافروں کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تھا تو اسلام کی صداقت اور حقانیت نے ان کے دل پر کچھ اثر تو اس وقت پیدا کیا جب انھیں اپنے مذموم مقصد میں ناکامی ہوئی اور وہ حبشہ کے بادشاہ نجاشی کو مسلمانوں سے برگشتہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ دوسری مرتبہ وہ اس وقت متاثر ہوئے جب انھوں نے پیغمبرِ اسلام کے سفیر عمرو بن امیۃ الضمری کو نجاشی کے دربار سے واپس آتے دیکھا۔ جونہی عمرو بن امیۃ الضمری دربار سے نکلے عمرو بن عاص فوراً وہاں پہنچ گئے اور کہنے لگے، اے بادشاہ! جو شخص ابھی ابھی آپ کے دربار سے نکل کر گیا ہے وہ شخص ہمارے دشمن کا ایلچی ہے اور ہمارے بزرگوں کا قاتل ہے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہو گی اگر اس شخص کو گرفتار کر کے میرے حوالے کر دیں تاکہ میں اس سے اپنے بزرگوں کے خون کا انتقام لے لوں۔ بادشاہ نے عمرو بن عاص کی یہ بات سن کر غصّے کے ساتھ اتنے زور سے ہاتھ کھینچ مارا کہ مجھے یوں لگا جیسے بادشاہ کی ناک ٹوٹ گئی۔ میں اس واقعے سے بے حد نادم ہوا۔ اور عرض کیا، جہاں پناہ! اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ بات آپ کو سخت ناگوار گزرے گی تو کبھی آپ سے نہ کہتا۔

نجاشی نے کہا اے عمرو بن عاص کیا تو چاہتا ہے کہ میں اس شخص کو تیرے حوالے کر دوں، جو سفیر ہے۔ اس پاکیزہ شخصیت کا جس کے پاس جبریل وحی لے کر

آتا ہے جو موسیٰ کے پاس بھی آتا تھا۔ اس کے بعد نجاشی نے کہا اے عمرو! تم پر افسوس ہے۔ تم اگر میری مانو تو خدا کی قسم وہ سچے ہیں اور حق پر ہیں۔ میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ جس طرح حضرت موسیٰ کو فرعون پر غلبہ حاصل ہوا بالکل اسی طرح پیغمبر اسلام بھی اپنے دشمنوں پر ایک دن ضرور غالب آجائیں گے۔

ابھی نجاشی کی بات ختم نہ ہونے پائی تھی کہ اسلام کی تقریر صداقت ان کے دل پر اثر کر گئی اور وہ نجاشی کی باتیں سُن کر بے تابانہ بول اُٹھے۔ اے بادشاہ! کیا آپ مجھ سے اسلام کی بیعت لے سکتے ہیں۔ لائیے اپنا ہاتھ بڑھائیے میں آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کرتا ہوں۔ چنانچہ نجاشی نے انھیں مشرف بہ اسلام کر لیا اور وہ سچے مسلمان بن گئے۔ لیکن وقت کی مصلحت کو سامنے رکھتے ہوئے عمرو بن عاص نے اس واقعے کو اپنے ساتھیوں سے چھپائے رکھا۔

سفر سے واپسی پر وہ سیدھے بارگاہِ رسالت میں چل دیے۔ راستے میں انھیں خالد بن ولید مل گئے وہ بھی اسی ارادے سے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو رہے تھے۔ کہ پیغمبر اسلام کے قدموں میں سر رکھ کر اسلام قبول کر لیں اور سچے دل سے مسلمان ہو جائیں۔ چنانچہ عمرو بن عاص اور خالد بن ولید دونوں حضور پیغمبر اسلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پہلے جناب خالد بن ولید نے اسلام قبول کیا۔ ان کے بعد عمرو بن عاص مشرف بہ اسلام ہوئے۔ عمرو بن عاص نے کہا کہ اس موقع پر میں نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا۔ یارسولؐ اللہ میں اس شرط پر آپ کی بیعت کرتا ہوں کہ میرے تمام پچھلے گناہ معاف ہو جائیں۔ حضورؐ نے فرمایا۔ اسلام پچھلے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے اور اسی طرح ہجرت بھی گناہوں کے تمام داغ مٹا دیتی ہے۔

چنانچہ حضورؐ کی زبان ترجمان قرآن سے یہ بات سن کر عمرو بن عاص پھُولے نہ سماتے تھے اور نہایت مسرت و شادمانی کے ساتھ کلمۂ توحید پڑھ کر سچے دل سے مُسلمان ہو گئے۔

اسلام یعنی صداقت قبول کرنے کے بعد اب ان کی عداوت اور دشمنی کا رُخ کفر یعنی کذب کے مٹانے کی طرف پھر گیا۔ انھوں نے اسلام کی قوت بازو سے قیصر و کسریٰ ایسے عظیم الشان شہنشاہوں کے تاج اپنے قدموں میں روند ڈالے جو کفر و بت پرستی کے مرکز و قبلہ تھے۔ اور انھوں نے اس بات کا عہد کیا کہ اب اس کے بعد میری تمام ذہنی اور جسمانی صلاحیت اسلام ہی کی خدمت اور مسلمانوں ہی کی ترقی اور حفاظت میں صرف ہو گی۔

جہاد

یہ بات عمرو بن عاص کے اسلامی جذبات ہی کا نتیجہ تھی کہ انھیں حضورؐ پیغمبرِ اسلام نے بعض اہم غزوات و سرایا کی امارت سپرد فرمائی۔ صحیح بخاری میں لکھا ہے کہ یہ بات خود عمرو بن عاص ہی نے بیان کی کہ ایک مرتبہ پیغمبرِ اسلام حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کہلا بھیجا کہ میں فوج کی وردی اور ہتھیار پہن کر ان کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں۔ چنانچہ میں نے اس حکم کی تعمیل کی۔ جب حضورؐ کی بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا تو فرمایا۔ اے عمرو بن عاص! میں چاہتا ہوں کہ تمھیں اسلام کے ایک لشکر کا سردار بنا کر بھیجوں۔ اللہ تعالیٰ تمھیں غنیمت کے مال سے سربلند کرے گا اور ہر طرح سے تمھاری حفاظت کرے گا۔ ابن العاص نے بیان کیا کہ اس بات پر میں نے رسالتمآب حضور محمدؐ رسول اللہ کی خدمتِ اقدس میں عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول میں نے مال و دولت کے لالچ میں اسلام قبول نہیں کیا۔ اس پر حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ صالح مرد کو صالح مال میسّر آتا ہے۔

ابنِ سعد نے طبقات میں لکھا ہے کہ رسول اکرمؐ نے سریہ ذات السلاسل کی امارت کے لیے عمرو بن عاص کو منتخب فرمایا اور انھیں اپنے دست مبارک سے ایک سفید علم بھی عنایت کیا۔ حضرت حارثؓ بن یزید کہتے ہیں کہ میں جب

اپنے قصبے سے مدینے آیا تو دیکھا کہ مسجد نبوی میں ایک انبوہ کثیر ہے تل دھرنے کی جگہ نہیں اور سیاہ جھنڈیاں لہرا رہی ہیں اور حضرت بلال، حضورؐ کے سامنے تلوار لگائے مؤدب کھڑے ہیں۔ میں نے ماجرا پوچھا۔ معلوم ہوا کہ حضور ایک مہم پر عمرو بن عاص کو روانہ فرما رہے ہیں۔

غرض اس شان اور تزک و احتشام سے لشکر اسلام حضرت عمرو بن عاص کی امارت میں جہاد کے لیے روانہ ہوا۔ جب اسلام کا لشکر سرزمین جذام کے چشمے "سلاسل" پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ معرکہ سخت اور دشمنوں کی فوج اسلام کے لشکر کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ حضرت عمرو بن عاص نے اس کی اطلاع حضورؐ کی خدمت میں بھجوائی اور حضورؐ نے اسی وقت دو سو بڑے بڑے صحابیوں کو جن میں سیدنا ابوبکر صدیقؓ، سیدنا عمر فاروقؓ اور حضرت ابوعبیدہ ابن الجراحؓ ایسے جلیل القدر صحابہ بھی شامل تھے۔ ان سب کو بطور کمک بھیج دیا۔ اور نصیحت فرمائی کہ سب مل جل کر رہنا، کسی سے کوئی اختلاف اور جھگڑا نہ کرنا۔

روایت ہے کہ جب یہ صحابہ سلاسل کے مقام پر پہنچے تو اس وقت ظہر کی نماز ہوا چاہتی تھی۔ جب عمرو بن عاص نماز پڑھانے کے لیے آگے بڑھے۔ تو ابوعبیدہ بن الجراحؓ نے انھیں ٹوک دیا اور کہا کہ وہ اپنے دستے کے امیر ہیں اس لیے نماز وہی پڑھائیں گے۔ اس پر حضرت عمرو بن عاص بولے۔ ہم سب جہاد کے لیے گھر سے نکلے ہیں۔ لہٰذا یہاں مراتب کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر دوسرے یہ کہ آپ لوگ میری مدد کو آئے ہیں اور مجھے چونکہ حضورؐ ہی نے اسلام کے لشکر کی امارت تفویض فرمائی۔ لہٰذا یہ حق مجھی کو

پہنچتا ہے کہ میں ایک امیر کی حیثیت سے نماز پڑھاؤں۔ ابوعبیدہ ابن الجرّاح کو اس موقع پر حضور کی نصیحت جو نکہ فوراً یاد آگئی۔ اس لیے انھوں نے اب کوئی مزید اعتراض نہیں اُٹھایا اور اجتہادی غلطی سے جو ایک اعتراض پیدا ہوا تھا۔ وہ اس طرح مٹ گیا اور سب کے سب عمرو بن عاص کی بات پر متفق ہو گئے۔

بلاذری نے لکھا ہے کہ قضاعہ کے علاقے میں پہنچ کر حضرت عمرو بن عاص نے ایسی شجاعت اور بے جگری سے حملہ کیا کہ دشمن جسے اپنی فوج کے زیادہ اور طاقتور ہونے پر بڑا ناز اور گھمنڈ تھا بری طرح پسپا ہوا۔ ہزاروں آدمی مارے گئے اور بے شمار مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ اس لڑائی میں عمرو بن عاص نے لشکر اسلام کو ہدایت کی تھی کہ وہ آگ نہ جلائے۔ چونکہ سردی کی شدت تھی اس لیے سیّدنا عمر فاروق کو اس بات پر بے حد غصہ آیا۔ انھوں نے سیّدنا ابوبکر صدیق سے مشورہ کیا۔ انھوں نے کہا عمرو بن عاص جو کچھ کرتا ہے کرنے دو۔ آخر حضور نے اس کی جنگی مہارت دیکھ کر ہی تو اسے لشکر اسلام کی امارت سونپی ہے۔

قضاعہ کی شکست کے بعد جب دشمن کے سپاہی بھاگ رہے تھے۔ مسلمانوں نے ان کا پیچھا کرنا چاہا مگر اس موقع پر بھی حضرت عمرو بن عاص نے رُک جانے کا جو حکم دیا تھا وہ مسلمانوں کو پسند نہ آیا۔ اس کے علاوہ مال غنیمت لُوٹنے کی۔ یہ کہہ کر جو ممانعت کی کہ اے مسلمانو! تمھارے لیے دشمنوں کے وہ سرکا فی ہیں جو داری میں بکھرے پڑے ہیں تو مسلمانوں کو یہ بات بھی نہایت بری لگی۔

غرض یہ تینوں باتیں مسلمانوں کو بے حد ناگوار گزریں چنانچہ انھوں نے

مدینے میں آتے ہی عمرو بن العاص کے خلاف حضور اکرمؐ سے شکایت کی حضورؐ نے عمرو بن عاص کو وجہ بیان کرنے کا حکم دیا۔ اس پر انھوں نے عرض کیا ، یا رسول اللہ! دشمنوں کے مقابلے میں تعداد کے لحاظ سے ہم بہت تھوڑے تھے ۔ ڈر تھا کہیں ایسا نہ ہو انھیں ہماری تعداد کا پتہ چل جائے اور وہ پلٹ کر ہم پر حملہ کر دیں۔ لہٰذا میں نے مسلمانوں کو بھاگتے ہوئے دشمنوں کا پیچھا کرنے سے روک دیا۔ اس کے علاوہ آگ نہ جلانے میں بھی یہی مصلحت تھی کہ اس کی روشنی سے دشمن ہماری تعداد کا صحیح اندازہ نہ کر لے ۔ اگرچہ آگ جلا کر ہاتھ پاؤں گرم کرنے کو میری طبیعت بھی چاہتی تھی۔ تاہم میں نے مسلمانوں کے مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے ایسا نہیں ہونے دیا۔ اب رہی تیسری بات وہ بھی اسی نقطہ نظر سے کہی گئی کہ جب تک دشمن سے میدان جنگ پورے طور پر خالی نہ ہو جائے۔ میدان جنگ میں اسلام کے لشکر کا جو سپاہی جہاں تہاں ہے مستعد رہے، تاکہ دشمن ہمارے شیرازے کو منتشر پا کر ہم پر پھر سے حملہ نہ کر دے ۔

حضور پیغمبر اسلام عمرو بن عاص کی یہ باتیں سن کر بہت خوش ہوئے۔ اور آپ نے عمرو بن عاص کی جنگی مہارت اور لشکر کی قیادت اور امارت کا ایک صحیح اندازہ کرتے ہوئے فرمایا: اے عمرو بن عاص! اب تم نئی فتوحات کے لیے تیار ہو جاؤ۔ پھر آپ نے فرمایا اے عمرو بن عاص! تم نے جو کچھ بھی کیا وہ بالکل صحیح کیا۔ بے شک اس موقع پر انہی باتوں کی ضرورت تھی ۔

اس مہم سے فراغت پانے کے بعد اب عمرو بن عاص ایک اور مہم پر

بھیجے گئے ۔ یہ سریہ سواع تھا، جو بنی ہذیل کے مشہور بت خانے سے متعلق ہے
یہ بُت ، جو ایک عورت کی شکل پر تھا مکہ سے تین میل کے فاصلے پر قائم تھا۔
قبیلہ ہذیل کے لوگ اسے خدا سمجھتے تھے۔ اور سخت شرک و کفر میں مبتلا تھے۔
حضورؐ نے اس بُت کو ڈھانے کے لیے عمرو بن عاص کو مقرر فرمایا۔ عمرو بن
عاص جب اس بُت کو ڈھانے لگے تو اس بت خانے کے مجاور نے ٹوکا۔
اور بولا۔ تم اس بُت کو نہیں ڈھاؤ یہ تو ہمارا خدا ہے اور اگر تم نے اسے ڈھا
دیا تو وہ تمھیں ضرور ہلاک کر ڈالے گا۔ عمرو بن عاص نے کہا۔ اگر یہ بات ہے
تو پھر اسے لازماً ڈھا دوں گا۔ چنانچہ انھوں نے ہاتھ میں ایک تیشہ لیا اور
اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ پھر اس کے بعد مجاور سے پوچھا۔ کہو بھاں
کیا ہوا دیکھ لیا تم نے اپنے خدا کا انجام ؟ مجاور بولا۔ بے شک آج مجھ پر
حقیقت کھل گئی۔ میں سخت اندھیرے میں تھا۔ اس کے بعد اُس نے کلمہ
توحید پڑھا اور سچے دل سے مسلمان ہو گیا۔

اس مہم کے بعد پھر عمرو بن عاص کو کئی ایک قبیلوں سے خراج
وصول کرنے کی مہم پر مقرر فرمایا گیا، جن میں بحرین، سعد، ہذیم، عذرہ، جذام۔
حارس اور خزارہ ایسے قبیلے شامل تھے۔ جنھوں نے خراج دینے سے انکار کر
دیا تھا۔ حضرت عمرو بن عاص ان قبائل کے پاس گئے اور ان سے رقمیں
وصول کیں اور پائی پائی لا کر نہایت دیانتداری کے ساتھ حضور پیغمبر اسلام
کی خدمت اقدس میں پیش کر دی۔

سفارت

حضرت عمرو بن عاص تنہا شجاعت اور تلوار ہی کے دھنی نہ تھے۔ فہم و فراست، تدبیر و سیاست میں بھی قدرت سے وافر حصہ پایا تھا۔ چنانچہ حضورؐ نے ان کی جنگی مہارت اور سیاسی بصیرت کو دیکھتے ہوئے اہلیت اور صلاحیت کی بنیاد پر انھیں اسلامی سفارت کا عہدہ بھی تفویض فرمایا۔

چنانچہ سب سے پہلے وہ سفیر کے طور پر عمان کے حاکم جیفر کے پاس بھیجے گئے۔ جانے سے پہلے حضورؐ نے انھیں چند باتیں نصیحت کے طور پر ارشاد کیں۔ فرمایا۔ تم عمان کے رئیسوں کو اسلام کی دعوت دینا۔ اگر وہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت قبول کر لیں تو انھیں قرآن و سنت کی تعلیم دے کر اُن کی رہنمائی کرنا اور اسلام کے دین کی تبلیغ کا فریضہ انجام دینا۔

حضرت عمرو بن عاص جب جیفر کے دربار میں پہنچے تو اُن کی سب سے پہلے جیفر کے بھائی عباد سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اُسے اسلام کی دعوت دی۔ عباد نہایت خوش اخلاق اور بھلا مانس تھا اس نے اسلام کی تعلیمات دریافت کیں۔ حضرت عمرو بن عاص نے کہا، خدا ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس لیے ہم سب کو اس کی بندگی اور فرمانبرداری کرنی چاہیے اور آپس میں صلہ رحمی سے کام لینا چاہیے۔ شراب نہیں پینی چاہیے، زنا نہیں کرنا چاہیے

اور بت پرستی سے بھی توبہ کرنی چاہیے۔ عیاد نے کہا، خوب، بہت خوب۔ اے کاش میرا بھائی بھی ان باتوں کو سنتا اور ان پر عمل کرتا تو ہم دونوں بھائی اسلام قبول کر لیتے۔ لیکن اس کا کیا کیجیے کہ وہ بادشاہت کے لالچ میں مبتلا ہے۔

عمرو بن عاص نے کہا اے عیاد! اگر بھائی مسلمان ہو جاتے تو حضور پیغمبرِ اسلام اس کی بادشاہت اسے واپس کر دیں گے۔ لیکن ایک شرط ضرور ہو گی وہ یہ کہ تمھارے مال دار لوگوں سے زکوٰۃ وصول کی جائے گی جو تمھارے ہی غریب لوگوں میں تقسیم کر دی جائے گی۔ عیاد بولا، واہ یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔

ہر چند عیاد ان تمام باتوں کو جو اس کے اور حضرت عمرو بن عاص کے درمیان ہوئی تھیں اپنے بھائی تک پہنچا دیتا تھا۔ تاہم اس کے دل پر ان کا کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ بالآخر ایک دفعہ عمرو بن عاص نے جھلّا کر کہا، کان کھول کر سن لو جو لوگ اسلام سے محروم رہے وہ برباد ہو گئے۔ اب اگر تم لوگ بھی اس سے محروم رہے تو یقیناً تم بھی تباہ و برباد ہو جاؤ گے۔ جیفر بولا اگر میں اسلام قبول نہ کروں تو؟ حضرت عمرو بن عاص نے کہا تو پھر جزیہ دو۔ یا میدانِ جنگ میں نکل آؤ۔ یاد رکھو اگر تم اپنی ہی ہٹ پر قائم رہے تو ہمارے گھوڑے تمھاری حکومت کو اپنے ٹاپوؤں تلے روند ڈالیں گے۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمھارا علاقہ مسلمانوں کے نیزوں کی رسائی سے کچھ دور نہیں۔ اور نیزے بھی ایسے جن کے ڈر سے بڑے بڑے بہادر دشمنوں کے پِتّے پانی

ہو جاتے ہیں۔

عمرو بن عاص نے پھر کہا، اے عباد! میں جو کچھ کہتا ہوں، تمہاری بھلائی ہی کے لیے کہتا ہوں۔ تمہارے لیے اسلام لانے ہی میں بہتری ہے۔ تم اپنی قوم کے حاکم بھی رہ جاؤ گے اور تمہاری قوم جنگ و جدل میں پڑ کر تباہ و برباد ہونے سے بچ بھی جائے گی۔ آخر کار جیفر نے بات مان ہی لی اور دونوں بھائی بہ طیب خاطر مسلمان ہو گئے۔ اور اس طرح عمان میں گھر گھر اسلام پھیل گیا۔

حکومت

سفارتی فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے بعد جب حضرت عمرو بن عاص کے حسن لیاقت کی تفاصیل سامنے آئیں اور واضح ہوا کہ اس موقع پر نہ کسی کا خون بہا اور نہ کوئی لڑائی ہوئی بلکہ حضرت عمرو بن عاص کے ناخن تدبیر سے الجھی ہوئی گتھی بخوبی سلجھ گئی تو حضور اکرمؐ نے خوش ہو کر انھیں عمان کا گورنر بنا دیا اور فرمایا، اے عمرو بن عاص جب تم عمان سے واپس آؤ گے تو ہم تمھیں پھر اسی عہدے پر فائز کریں گے۔ بلاشبہ تم اسلام میں صاحب تدبیر ہو۔

حضرت عمرو بن عاص جب تک حضور پیغمبر اسلام حیات رہے عمان کے گورنر کی حیثیت سے قائم رہے اور اپنے فرائض کو نہایت اخلاص و دیانت کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ انھیں حضور سے بے پناہ محبت

تھی اور آپ کے لیے ہر شے قربان کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ جب حضورؐ کے ملاءِ اعلیٰ کو تشریف لے جانے کی اطلاع انھیں سیدنا ابوبکر صدیق کے ذریعے ملی تو ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ایک جھڑی لگ گئی اور طبیعت سے بے قابو ہو گئے۔

پھر ذرا طبیعت سنبھلی تو آپ نے لوگوں کو مسجد میں اکٹھا کیا اور انھیں حضور پیغمبرِ اسلام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رحلت فرمانے کی با دیدہ گریاں اطلاع پہنچائی۔ اسد الغابہ میں لکھا ہے کہ حضرت عمرو بن عاص حضورؐ کی حیات مبارکہ میں نہایت اخلاص و دیانت اور محبت کے ساتھ حضورؐ کے احکام کی بجا آوری کرتے رہے اور اسلام کی سربلندی اور فروغ اور اشاعت کے فریضے سے کبھی غافل نہیں ہوئے۔

فتوحات

حضور پیغمبر اسلام کی رحلت کے بعد سیدنا ابو بکر صدیق پہلے خلیفہ ہوئے تو یہ بے حد نازک وقت تھا جو لوگ نئے نئے مسلمان ہوئے تھے اور انھیں ذات رسالتمآبؐ کی بابرکت صحبت میسر نہ آسکی وہ اسلام کی تعلیمات کو پورے طور پر نہ سمجھنے کے باعث دین سے پھر گئے اور ان سب نے بیک زبان زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ ہر چند ان حالات نے سیدنا ابو بکر صدیقؓ کو بڑی مشکل میں ڈال دیا تاہم انھوں نے اپنے ایمان کی روحانی طاقت اور دینی بصیرت سے کام لیتے ہوئے نامساعد حالات کا مقابلہ کرنے کی پورے طور پر ٹھان لی۔

سیدنا ابو بکر صدیقؓ نے حضرت عمرو بن عاص کو بارگاہ خلافت میں طلب کیا اور وہ حکم کی تعمیل میں عمان سے مدینے کو چل کھڑے ہوئے۔ راستے میں بنو عامر کے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ اس قبیلے کا سردار قرہ بن ہبیرہ تھا وہ ان سے بڑے احترام و اکرام سے پیش آیا جب آپ وہاں سے چلنے لگے تو ایک طرف الگ لے جا کر کہنے لگا، اے عمرو! اگر عربوں سے زکوٰۃ وصول کی گئی تو سب کے سب باغی ہو جائیں گے اور کسی کی خلافت کو تسلیم نہیں کریں گے۔ حضرت عمرو بن عاص کا یہ سننا تھا کہ سخت غضبناک ہو گئے اور بولے کیا تو کافر ہو گیا جو مجھے عربوں سے ڈراتا ہے۔ خدا کی قسم یہ قطعی دین کا معاملہ ہے۔ ہم ایسے لوگوں کو اپنے

گھوڑوں کی ٹاپوں سے کچل ڈالیں گے یہاں تک کہ وہ سیدھی راہ پر آ جائیں۔ کان کھول کر سن لے ہم کسی ایک عرب کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے، جو فتنہ پرور ہو گا۔ اب عرب کے آسمان پر ایک ہی خدا اور عرب کی سرزمین پر ایک ہی رسولؐ ہو گا۔ جھوٹے خداؤں کی خدائی کے لیے اب عرب میں کوئی جگہ نہیں۔

جب آپ حکم کی تعمیل میں مدینے پہنچ گئے تو سیدنا ابو بکر صدیقؓ نے آپ کو سب سے پہلے بنی قضاعہ کی طرف بھیجا۔ یہ لوگ اسلام سے پھر گئے تھے اور زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ حضرت عمرو بن عاص سے ان کی زبردست مڈبھیڑ ہوئی۔ اور کافی عرصے تک ان کے درمیان میدان کارزار گرم رہا۔ بالآخر عمرو بن عاص اُن پر غالب آ گئے۔ فتح پانے کے بعد اُنھوں نے بنی قضاعہ سے زکوٰۃ کی پائی پائی وصول کی اور نئے سرے سے انھیں مسلمان کیا۔

زکوٰۃ کے منکروں کی سرکوبی کے بعد حضرت عمرو بن عاص مدینے سے ہو کر پھر عمان چلے گئے۔ لیکن سیدنا ابو بکر صدیقؓ کو جلد ہی پھر ان کی ضرورت پڑ گئی۔ اور انھیں آنے کو لکھ بھیجا۔ چنانچہ حضرت عمرو بن عاص حکم کی تعمیل میں پھر مدینے پہنچ گئے۔ یہ موقع شام کی مہم کا تھا۔ سیدنا ابو بکر صدیقؓ نے شام کی مہم پر جانے والے اسلامی لشکر کو چار حصّوں پر تقسیم کیا۔ ان میں سے ایک پر حضرت عمرو بن عاص کی امارت تھی، دوسرے پر ابو عبیدہ بن الجراح کی، تیسرے پر شرجیل بن حسنہ اور چوتھے پر یزید بن ابوسفیان کی۔

جب عمرو بن عاص اپنے لشکر کے نو ہزار سرفروش مجاہدوں کو لے کر مدینے سے چلنے لگے تو سیدنا ابو بکر صدیقؓ نے انھیں چند باتیں نصیحت کے طور پر

ارشاد فرمائیں۔ اور آخر میں فرمایا، اے عمرو بن عاص جاؤ، اللہ کی برکت اور اُس کی رحمت تمھارے ساتھ ہے۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ شام کی مہم کے سلسلے میں اسلام کا لشکر چار حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ اب ان کی تفصیل یوں ہے کہ ایک حصّے کو یزید بن ابوسفیان کی امارت میں اُردن کی طرف بھیجا گیا۔ دوسرے حصّے کو شرجیل بن حسنہ کی امارت میں شام کے وسطی اور زرخیز علاقے حوران کی طرف۔ تیسرے حصّے کو ابوعبیدہ بن جراح کی امارت میں شام کے صدر مقام دمشق کی طرف اور چوتھے حصّے کو عمرو بن عاص کی امارت میں فلسطین کی جانب روانہ کیا۔ جب عمرو بن عاص ایلیا کے راستے سے فلسطین میں داخل ہوئے تو انھیں پتہ چلا کہ دمشق کی فوج ستّر اسّی ہزار کے لگ بھگ ہے اور ان کے لشکر کے سپاہی کل آٹھ نو ہزار ہیں۔ بعضوں نے تو صرف تین چار ہزار کے قریب تعداد بتائی ہے۔ بہرکیف لشکر اسلام رومیوں کی فوج کے مقابلے میں تعداد کے لحاظ سے کہیں زیادہ کم تھا۔ جب والئ شام قیصر کو مسلمانوں کے یہاں پہنچنے کا علم ہوا تو وہ سخت غضبناک ہوا اور اُس نے اپنے بھائی تذارق کو ایک لشکر جرّار دے کر عمرو بن عاص کے مقابلے پر بھیج دیا۔ حضرت عمرو بن عاص نے کمال حکمتِ عملی سے اس کا مقابلہ کیا۔ انھوں نے حضرت عبداللہ بن عمر کو ایک ہزار سرفروش سپاہی دے کر سامنے سے اور خود ایک ہزار سپاہی لے کر پیچھے سے رومیوں کے لشکر جرّار پر حملہ کر دیا اور اس بے جگری سے لڑے کہ رومیوں کا لشکر جرّار لوکھلا اُٹھا۔ اتنے میں عمرو بن عاص رومیوں کے لشکر جرّار کو چیرتے ہوئے تذارق تک جا پہنچے اور اس پر ایسا نیزہ

مارا کہ وہ زمین پر گرتے ہی واصلِ جہنم ہوگیا۔ اب اس کے مرنے سے رومیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ ان کے بڑے بڑے سردار مارے گئے اور بہت سامالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ لیکن دوسرے دن تازہ دم ہو کر رومی پھر مقابلے پر آ گئے۔ اب ان کے دلوں میں تذارق کے خون کی آگ بھڑک رہی رہی تھی اور وہ اس مرتبہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ تعداد میں سپاہی لے کر آئے تھے۔ مورخین کہتے ہیں کہ اس مرتبہ رومیوں کا لشکر جرّار اسی ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ جبکہ پہلی بار صرف دس ہزار سپاہی تھے۔ حضرت عمرو بن عاص نے اس بار بھی اپنے لشکر کو کمال دانائی سے ترتیب دیا۔ حضرت ضحاک، حضرت سعید بن خالد اور حضرت ابودرداء وغیرہ صحابیوں کو مختلف سمتوں پر مقرر کیا۔ اور خود حضرت عمرو بن قلب میں جا کر کھڑے ہو گئے۔ اس کے علاوہ کچھ لوگ قرآنِ حکیم کی تلاوت پر بھی مقرر کیے گئے تاکہ وہ لوگوں کو جہاد کی ترغیب دلائیں۔

جب دونوں طرف سے فوجوں کی صف بندی ہو چکی اور ابتدائی انتظامات مکمل ہو گئے، تب جنگ کا آغاز ہوا۔ جونہی رومیوں نے مسلمانوں پر حملہ کیا وہ اُن کے حملے کا بڑھ بڑھ کر جواب دینے لگے۔ حتیٰ کہ لڑائی تمام دن جاری رہی آخر کار مسلمانوں نے رومیوں کو مار بھگایا۔ لیکن ابھی رومیوں کے بھاگتے ہوئے سپاہیوں کا پیچھا کیا جا رہا تھا کہ بھاگتے ہوئے سپاہیوں نے پوری قوت کے ساتھ مجتمع ہو کر پلٹ کے پیچھا کرنے والے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ اس حملے میں حضرت عمرو بن عاص کے سوتیلے بھائی حضرت سعید بن خالد شہید ہو گئے جن کے صدمہ سے آپ بے حد ملول ہوتے اور مسلمانوں کو للکارا کہ اے

بھائیو! سعید بن خالد بھی عالمِ بقا کو چل دیے اور اب میں بھی وہیں جانا چاہتا ہوں تم میں سے کون ایسا ہے جو میرا ساتھ دے۔ اس پر صحابہ کی ایک جماعت مستعد ہوئی اور ایسی بے جگری سے لڑی کہ ایک ہی حملے میں پندرہ ہزار سپاہیوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کے رکھ دیا۔ اور سرزمین فلسطین فتح کر لی۔ اس لڑائی میں جو مسلمان شہید ہوئے۔ مؤرخین ان کی تعداد صرف ایک سو تین بیان کرتے ہیں۔

جس وقت عمرو بن عاص فلسطین کی فتح میں لگے ہوئے تھے حمص کا حکمران "دردان" بصریٰ میں ایک لشکر جرار کے ساتھ شرجیل بن حسنہ سے معرکہ آرا تھا۔ ابوعبیدہ ابن جراح اور خالد بن ولید سے رومیوں کی معرکہ آرائی ہو رہی تھی اور یزید بن ابوسفیان سے بلقا میں رومیوں کا جنگ وجدل برپا تھا۔ اس پر طرفہ یہ کہ عین اس عالم میں جبکہ چو طرفی لڑائی جاری تھی رومیوں کا ایک لشکر اجنادین میں آ پہنچا اور خیمے ڈال لیے۔ مسلمان یہ حالت دیکھ کر سخت گھبرائے۔ چنانچہ ابوعبیدہ ابن الجرّاح نے تمام سردارانِ لشکر اسلام کو اجنادین میں اکٹھے ہو جانے کا مشورہ دیا۔ اور حضرت عمرو بن عاص کو لکھ بھیجا کہ آپ خط کو دیکھتے ہی فوراً اجنادین پہنچ جائیں۔ چنانچہ عمرو بن عاص فوراً فوج لے کر اجنادین پہنچ گئے اور یہاں آتے ہی جنگ کا آغاز کر دیا۔ گھمسان کا رن پڑا۔ کئی دن تک لڑائی جاری رہی۔ عمرو بن عاص اس موقع پر دن میں جہاد کرتے اور اسلام کے دشمنوں سے لڑتے اور اپنی شہادت اور مسلمانوں کی فتح کے لیے رات کو دعائیں مانگتے۔ اس لڑائی

کئے آخر میں جب فیصلہ کن مرحلہ آیا تو حضرت عمرو بن عاص نے مسلمانوں کے سامنے ایک پُر جوش اور ولولہ انگیز تقریر کی جس سے مسلمانوں کے دلوں میں عزم و ہمت اور جرأت کا ایک جوش اُمنڈ پڑا۔ حضرت عمرو بن عاص کے بھائی حضرت ہشام بن عاص نہایت جوشیلے اور بے باکانہ انداز سے آگے بڑھے۔ اور چاہا کہ عقب سے حملہ کر کے رومیوں کو پسپا کر دیں لیکن رومیوں کو اُن کے ارادے کا پتہ چل جانے سے اپنے بچاؤ کی راہ مل گئی اور انھوں نے ہشام بن عاص کو ایک تنگ مقام پر گھیر لیا اور شہید کر دیا۔

مستدرک میں لکھا ہے کہ حضرت ہشام بن عاص کی شہادت کے بعد مسلمانوں کا لشکر بپھرے ہوئے شیر کی طرح رومیوں پر لپکا۔ لیکن راستے میں حضرت ہشام بن عاص کی لاش پڑی تھی اور تنگ راستہ تھا۔ اس لیے ادب کے باعث آگے نہ بڑھ سکا۔ حضرت عمرو بن عاص نے جب یہ صورت دیکھی تو انھوں نے سب سے پہلے اپنا گھوڑا بڑھایا۔ پھر ان کی دیکھا دیکھی مسلمانوں نے بھی اپنے اپنے گھوڑے بڑھائے اور میدان میں نکلتے ہی ایسا حملہ کیا کہ رومی بدحواس ہو کر اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ حتیٰ کہ پھر جسے جہاں کوئی راہ دکھائی دی بھاگ کھڑا ہوا۔

اس فتح کے بعد عمرو بن عاص نے اپنے بھائی ہشام کی لاش کے ٹکڑوں کو اکٹھا کیا جو گھوڑوں کی ٹاپوں کی زد میں آ کر پارہ پارہ ہو چکی تھی۔ اور بادیدۂ گریاں نہایت صبر و استقامت کے ساتھ انھیں ایک بورے میں ڈال کر دفن کر دیا۔

طبری اور ابنِ اثیر نے لکھا ہے کہ فلسطین کی فتح کے بعد عمرو بن عاص نے ابو عبیدہ ابن الجراح کو لکھا کہ اس وقت رومیوں سے الگ الگ مقابلہ کرنا مناسب نہیں۔ ہماری رائے ہے کہ سب مل کر دشمنوں کا مقابلہ کریں اور اس کے لیے یرموک کا میدان سب سے بہتر ہے۔ ابو عبیدہ ابن الجراح نے اس رائے کو پسند کیا۔ چنانچہ تمام مسلمانوں نے اردن کے نواح میں دریائے یرموک کے کنارے ایک وسیع میدان میں خیمے ڈال لیے۔ جہاں تین روز کے بعد رومیوں کا ایک لشکرِ جرار جو تین لاکھ رومیوں پر مشتمل تھا مسلمانوں کے مقابلے کو آ نکلا۔ اس لڑائی میں رومیوں کی خانقاہوں اور عبادت گاہوں کے راہب اور پادری صاحبان تک گوشہ نشینی سے نکل کر میدان میں آ چکے تھے مسلمانوں کی تعداد اس لڑائی میں صرف پینتیس ہزار تھی اور اس موقع پر لشکر کی امارت و قیادت حضرت خالد ولید کے ہاتھ میں تھی۔ جنھوں نے اسلام کی فوج کو ... طریقوں کے مطابق ترتیب دیتے ہوئے اڑتیس ۳۸ حصوں میں تقسیم کیا۔ جن میں سے ایک حصہ کی قیادت اور سپہ سالاری عمرو بن عاص کے ... تھی۔

ہر چند عرب کے مسلمان اس موقع پر کچھ پریشان سے ہوئے اور اتنا بڑا رومیوں کا لشکر جیسے انھوں نے اس معرکے سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ان کے لیے تھوڑی سی دیر تک خوف و ہراس کا باعث بنا۔ تاہم لشکرِ اسلام کے سرداروں نے اپنی ولولہ انگیز اور پُرجوش تقریروں سے مسلمانوں کے دلوں کو گرمایا اور ان کی رگوں میں گرم خون دوڑا دیا۔ اس سلسلے میں حضرت عمرو بن عاص خاص طور پر پیش پیش تھے اور وہ اپنے حصے کے لشکریوں میں ایک ...

ایک کے دل بڑھا رہے تھے اور ہر مسلمان کے پاس جا جا کر کہہ رہے تھے۔ اے اللہ کے بندے! اپنی نظروں کو نیچا رکھ۔ گھٹنوں کے بل جھک جا۔ نیزوں کو سینے پر تان لے۔ اپنی جگہ پر پہاڑ کی طرح اٹل رہ۔ پھر سب مسلمانوں سے مخاطب ہو کر بولے۔ اے اسلام کے مجاہدو! تم اپنی طرف سے لڑائی میں پہل نہ کرنا۔ جب دشمن خود تمہاری طرف بڑھے تب اُس کی طرف بڑھنا اور شیروں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑنا۔ بخدا تم نے اگر سچے دل سے حملہ کیا تو دشمن کی فوج اس طرح ہوا ہو جائے گی جس طرح کبوتروں کی ٹکڑی۔

ابتدا میں رومیوں کا پلہ بھاری رہا۔ لیکن جب رومیوں نے مسلمانوں کی شجاعت کا رنگ دیکھ کر یہ چال چلی کہ کھنڈروں اور غاروں میں اپنے آدمی چھپا دیے جو چھپ کر مسلمانوں کی آنکھوں کو تیروں کا نشانہ بنانے لگے تو اس وقت مسلمانوں میں سخت بھگدڑ مچ گئی اور سات سو مسلمان آنکھوں سے محروم ہو گئے۔ قریب تھا کہ رومی غالب آجائیں۔ حضرت عمرو بن عاص، ابو عبیدہ بن جراح۔ یزید بن ابوسفیان (امیر معاویہ کے بڑے بھائی) عبدالرحمٰن بن ابوبکر صدیقؓ اور خالدؓ بن ولید نے کمال شجاعت سے تیروں کی بارش میں آگے بڑھ کر اس شدت سے حملہ کیا کہ رومی بوکھلا اُٹھے۔ اُن کے قدم اُکھڑ گئے اور بھیڑ بکریوں کی طرح جان بچانے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ حتیٰ کہ اسی ہزار سپاہی اس خوف و ہراس کے باعث لقمۂ اجل ہو گئے۔

غرض ان بزرگوں اور سرداروں کی شجاعت سے بالدے ہوئے مسلمانوں کی ہمت بندھ گئی اور انھوں نے ایک نئے جوش اور ولولے کے

ساتھ دشمنوں سے پھر لڑنا شروع کیا اور اس قدر بہادری اور پامردی سے لڑے کہ پورے ملک شام سے سب سے بڑی دشمن طاقت کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ ایک صحیح اندازے کے مطابق اس لڑائی میں دشمن کے کل ایک لاکھ بیس ہزار سپاہی قتل ہوئے۔

ابھی یرموک کا معرکہ جاری تھا کہ سیدنا ابوبکر صدیقؓ وفات پا گئے اور سیدنا عمر فاروق مسندِ خلافت پر بٹھا دیے گئے۔ حضرت عمرو بن عاص اس وقت یرموک ہی میں تھے کہ سیدنا عمر فاروقؓ کی طرف سے انھیں حکم ملا کہ وہ اب دمشق کی مہم پر چلے جائیں۔ چنانچہ انھوں نے فوراً دربارِ خلافت کے فرمان کی تعمیل کی اور دمشق پہنچ گئے، جہاں حضرت ابوعبیدہ ابن الجراحؓ اور دوسرے معزز سردارانِ لشکرِ اسلام پہلے سے موجود تھے۔

پہلے پہل دمشق کے محاصرے کے دنوں میں چند چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہوئیں، جو بے نتیجہ رہیں۔ لیکن آخر میں جب محاصرے نے خاصا طول پکڑ لیا تو حضرت ابوعبیدہ ابن الجراحؓ اور حضرت خالد بن ولید نے ایک فیصلہ کن جنگ لڑنا طے کر لیا۔ چنانچہ اہم ترین مقامات پر فوجی نقطۂ نظر سے اسلامی فوج کے ڈیرے ڈالے گئے اور ان پر مختلف سپہ سالاروں کو مقرر کیا گیا۔ مثلاً حضرتِ عمرو بن عاص کو باب الفرادیس پر۔ شرحبیل بن حسنہ کو باب توما پر۔ قیس بن ہبیرہ کو باب الفرج پر۔ خالد بن ولید کو باب شرقی پر اور خود ابوعبیدہ ابن الجراح نے اپنا خیمہ باب الجابیہ پر نصب کیا۔ ان بزرگوں نے اسلام کے لشکر کی ترتیب کچھ ایسے طور سے کی تھی کہ رومیوں کو اسے دیکھ کر

ہی خوف آنے لگا اور روہ لشکر اسلام کی ہیبت سے تھر آنے لگے۔ چنانچہ رومیوں نے بغیر لڑے بھڑے ہی مسلمانوں سے صلح کر لی اور دمشق مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔

دمشق کی فتح کے بعد حضرت عمرو بن عاص اردن چلے گئے جہاں رومیوں کی امداد کے لیے ان کے بادشاہ قیصر نے ایک لشکر جرار حضرت عمرو بن عاص کے مقابلے کے لیے بھیج دیا۔ اس سے پہلے کہ رومی ان پر حملہ کرتے۔ کسی طرح حضرت ابو عبیدہ ابن الجراح کو بھی حالات کی نزاکت کا پتہ چل گیا اور فوراً حضرت عمرو بن عاص کی مدد کے لیے امیر معاویہ بن ابو سفیان، اور حضرت یزید بن ابو سفیان دونوں بھائیوں کو فوج دے کر بھیج دیا اور انھوں نے آتے ہی پوری طاقت کے ساتھ رومیوں پر حملہ کیا۔ اگرچہ معرکہ بڑا سخت رہا تاہم مسلمانوں کے مقابلے میں رومیوں کی فوج زیادہ روز نہ ٹھہر سکی اور آخر کار میدان چھوڑ کر بھاگ نکلی اور دمشق پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

دمشق کے فتح ہو جانے سے رومیوں میں سخت غم و غصے کی لہر دوڑ گئی اور انھوں نے فحل کے مقام پر جمع ہو کر قسم کھائی کہ جب تک مسلمانوں کو روم سے نکالنے میں کامیاب نہ ہوں گے چین سے نہیں بیٹھیں گے اس کے بعد انھوں نے روم کے قیصر ہرقل سے درخواست کی کہ وہ فوج سے ان کی مدد کرے۔ حضرت عمرو بن عاص کو جب اپنے سراغ رسانوں کے ذریعے ان باتوں کا پتہ چلا تو انھوں نے بھی حضرت ابو عبیدہ ابن الجراح کو مدد

کے لیے لکھا اور انھیں تمام حالات سے آگاہی دی۔ اور لکھا کہ اللہ تعالیٰ پر پورا پورا بھروسہ ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ کافروں پر مسلمانوں کو فتح نصیب ہوگی۔

حضرت ابو عبیدہ ابن الجراح نے اطلاع پاتے ہی حضرت عمرو بن عاص کی مدد کے لیے تین ہزار فوج حضرت شرجیل بن حسنہ کی قیادت میں روانہ کر دی اور ڈیڑھ ہزار فوج حضرت خالد بن ولید کی قیادت میں بھیج دی۔ شرجیل نے امداد پہنچتے ہی نہایت حسن تدبیر سے کام لیتے ہوئے لشکر کے سرے پر حضرت خالد بن ولید کو متعین کیا۔ سوار فوج پر حضرت ضرار بن اَزْوَر مقرر کیے گئے اور پیادہ فوج پر حضرت عیاض اور ابن عاص کو اور خود میمنہ پر مقرر ہوئے اور پھر اس جوش سے بھرپور حملہ کیا کہ فحل سے بیسان اور طبریہ تک کے تمام علاقے فتح کرتے چلے گئے۔ طبری نے لکھا ہے کہ اس لڑائی میں اسّی ہزار رومیوں کو مسلمانوں نے گاجر مولی کی طرح کاٹ کر پھینک دیا۔

ان فتوحات کے بعد حضرت عمرو بن عاص اپنے مرکزی مقام فلسطین چلے آئے اور ماتحت فوجی سرداروں کو مختلف غیر مفتوحہ علاقوں میں بھیجنا شروع کیا۔ چنانچہ علقمہ بن حکم کو بیت المقدس کے نواح میں اور ابو ایوب مالکی کو رملہ کے علاقے میں پہنچنے کا حکم دیا اور امیر معاویہ کو لکھا کہ تم قیساریہ کو چلے جاؤ۔ اس کے بعد اپنے چھوٹے بیٹے محمد کو علقمہ کی مدد کے لیے اور عمارہ بن امیہ کو ابو ایوب کی مدد کے لیے بھیج دیا۔ اسی

انتظامات بھی نہ ہونے پائے تھے یہ اطلاع ملی کہ رومیوں نے اجنادین پر دوبارہ قبضہ کر لیا ہے۔ یہ سنتے ہی حضرت عمرو بن عاص ان کی سرکوبی کے لیے خود چلے۔ قریب پہنچے تو پتہ چلا کہ رومیوں کا نہایت دانشور اور مدبر حکمران "ارطبون" ایک لشکر جرار کے ساتھ اجنادین کے قلعے پر قبضہ کیے ہوئے ہے۔ انھوں نے سیدنا عمر فاروق رضؓ کو خط لکھ کر صورت حال سے مطلع کیا اور امداد چاہی۔ سیدنا عمر فاروق نے جواب میں لکھا ہمارا عربی "ارطبون" (یعنی عمرو بن عاص) رومی ارطبون کے مقابلے میں پہنچا ہے۔ اب دیکھیے بازی کون لے جاتا ہے۔ مطلب اس سے یہ تھا کہ تم خود صاحب شمشیر و تدبیر ہو، تلوار کے جوہر دکھاؤ۔ یا ناخنِ تدبیر سے گتھی سلجھاؤ۔ غرض حضرت عمرو بن عاص نے ہمت نہ ہاری۔ اگرچہ ان کے پاس تھوڑی سی فوج تھی تاہم انھوں نے حوصلے سے کام لے کر قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ ارطبون نے جب ان کی یہ جرأت و شجاعت دیکھی تو ششدر رہ گیا اور اس میں مقابلے کو نکلنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ جب محاصرے کی مدت نے کافی طول پکڑ لیا تو حضرت عمرو بن عاص کو اب یہ خیال آیا کہ جیسے تیسے بھی بن پڑے قلعے میں داخل ہو جانا چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے قلعہ کے حالات کا بڑے غور و فکر سے جائزہ لیا اور طے کیا ایک قاصد کی حیثیت سے وہ خود ہی ارطبون کے پاس قلعے میں چلے جائیں۔ چنانچہ حضرت عمرو بن عاص قلعے میں ارطبون کے پاس گئے اور اس سے مصالحت کے سلسلے میں یوں بات چیت کی۔

ارطبون :- کیا عمرو بن عاص بہت عقلمند آدمی ہے ؟

عمرو بن عاص :- عمرو اللہ کے تیروں میں سے ایک تیر ہے وہ اچھی طرح یہ بات جانتا ہے کہ کسی مقام پر قدم رکھنا چاہیے اور کس جگہ پیچھے ہٹنا چاہیے۔ وہ کسی مشکل میں نہیں گھبراتا، کیسی ہی تکلیف اور مصیبت کیوں نہ آئے وہ اس سے بالکل صاف بچ کر نکل جاتا ہے۔

ارطبون :- تم لوگ خانہ بدوش بدو ہو پھر تم میں قیصر و کسریٰ ایسے بادشاہوں پر غالب آنے کا جنون کیونکر پیدا ہوا ؟

عمرو بن عاص :- ہم میں سے ہر شخص بہادر، جنگجو اور فن سپہ گری کا ماہر ہے صحراؤں میں رہ کر ہم تکلیفیں اُٹھانے اور مشقتیں برداشت کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص تلوار کا دھنی ہے۔ اسے نیزہ چلانا بھی خوب آتا ہے۔ ہماری تیغ آبدار کے جوہر ہمارے دشمنوں پر خوب کھل چکے ہیں اور یرموک کی جنگ اس کی زندہ مثال ہے۔

ارطبون :- میں اگر جنگ کے لیے تیار ہو جاؤں تو کیا تم گمان کرتے ہو کہ تم لوگ غالب آسکو گے ؟

عمرو بن عاص : کیا تم قیصرِ روم سے بھی بڑھ کر ہو وہ تلواریں جو ہرقل کے لشکر کو تباہ و برباد کر سکتی ہیں آج بھی ہر ایسے شخص کی ہلاکت کے لیے تیار ہیں جو عمرو بن عاص کے مقابلے میں نکلے۔ ہم امن اور سلامتی کی دعوت دیتے ہیں اور اسلام کی دعوت دیتے ہیں کہ یہی ہمارا دین ہے اور اسی کے لیے ہم جہاد کرتے ہیں۔ یہ حق ہے اور حق کا بول بالا کرنے کے لیے ہی

ہم میدان جنگ میں اُترتے ہیں۔

ارطبون بڑا شاطر و عیار آدمی تھا، اس نے جو باتیں عمرو بن عاص سے ایک قاصد سمجھ کر کیں اُس نے ان سے ایک صحیح اندازہ کر لیا کہ یہی عمرو بن عاص ہیں۔ چنانچہ اُن کے قتل کے لیے ارطبون نے ایک چال چلی وہ یہ کہ جونہی عمرو بن عاص دربار سے نکلیں اور تھوڑی دُور آگے بڑھیں۔ چھپے ہوئے سپاہی گھات سے نکل پڑیں اور انھیں دیکھتے ہی اُن پر ٹوٹ پڑیں اور تکا بوٹی کر ڈالیں۔ مگر عمرو بن عاص اس سے بھی زیادہ ہوشیار اور چالاک تھے۔ انھوں نے بھی اس کے ارادہ کو بھانپ لیا اور کہنے لگے۔ لو آج تو میں جا رہا ہوں، کل اپنے ہی جیسے دس آدمیوں کو لے کر پھر آؤں گا۔ خدا نے چاہا تو ہماری صلح ہو جائے گی۔ اور اس طرح وہ اپنی جان سلامت لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔

دوسرے دن جب حضرت عمرو بن عاص دربار میں پہنچے تب ارطبون کو اپنی غلطی کا پتہ چلا اور سر پیٹ لیا۔ اور کہا بے شک عمرو بن عاص بہت بڑا عقلمند آدمی ہے اور سیدنا عمر فاروقؓ کو جب اس واقع کی اطلاع ملی تو وہ بہت خوش ہوئے اور عمرو بن عاص کو لکھ بھیجا اے ابن العاص! شاباش خدا نے چاہا تو تم ضرور ارطبون پر غالب آؤ گے۔

حضرت عمرو بن عاص نے قلعے سے واپس آتے ہی اعلانِ جنگ کر دیا اور فصیل کے چاروں طرف سخت حملے کرنے شروع کر دیے۔ ارطبون بھی ایک لشکر جرار لے کر میدانِ جنگ میں نکل آیا۔ گھمسان کا رن پڑا۔ ہر طرف

لاشیں ہی لاشیں دکھائی دینے لگیں۔اجنادین کا میدانِ جنگ لالہ زار بن گیا۔جنگ کا نقشہ دیکھ کر حضرت عمرو بن عاص نے محسوس کیا کہ ہوسکتا ہے فتح میں دیر ہو جائے۔ انھوں نے اچانک پیچھے کے مسلمانوں کو آگے بڑھا دیا اس حکمتِ عملی کا نتیجہ یہ نکلا کہ رومی یہ سمجھ کر کہ مسلمانوں کی مدد کے لیے کوئی تازہ دم فوج آگئی بوکھلا گئے۔اور مال و اسباب چھوڑ کر بھاگ نکلے۔رومیوں کے دلوں پر حضرت عمرو بن عاص کی شجاعت کی دھاک بیٹھ چکی تھی جتنی کہ وہ اُن کے نام ہی سے تھرآنے لگتے۔چنانچہ یانا، عسقلان۔غزہ، رملہ، عکا، بیروت، جبیلہ اور بیت الجبرین وغیرہ قلعے نہایت آسانی سے فتح ہو گئے۔ ان میں سے بعض تو ایسے ہیں کہ دشمنوں نے خوف کے مارے بغیر لڑے بھڑے ہی مسلمانوں پر شہر کے دروازہ کھول دیے اب رومیوں کو جنھیں حضرت عمرو بن عاص کے ہاتھوں پے در پے شکست ہوئی۔اپنی شکست کا احساس بری طرح ستا رہا تھا۔اُنھوں نے حضرت عمرو بن عاص سے انتقام لینے کے لیے بیت المقدس میں اکٹھا ہونا شروع کر دیا۔اس کے علاوہ اردن میں بھی ہرقل نے عمرو بن عاص کے خلاف اپنے تین لاکھ آدمیوں کا ایک لشکر تیار کیا۔اِدھر جب حضرت عمرو بن عاص کو حالات کا پتہ چلا تو انھوں نے اردن کے رہنے والوں کو اس بات کی دھمکی دے ڈالی کہ اگر تم لوگوں نے بیت المقدس پر حملہ کرنے کی ٹھان لی تو یاد رکھو ہم لوگ اس وقت تک چین سے نہ بیٹھیں گے کہ جب تک باغیوں کو قتل نہ کر لیں اور ان کے بیوی بچوں یعنی اہل و عیال کو غلام نہ بنا لیں۔ہر ایسے شخص کے لیے میری تلوار بے نیام

ہوا چاہتی ہے، جو بغاوت پر آمادہ ہو۔ اس دھمکی کا لوگوں کے دلوں پر کچھ اتنا اثر ہوا کہ تین لاکھ رومی سپاہی جو اردن کے لوگوں کی مدد کو آ رہے تھے انھیں پست ہمت پا کر وہ راستے ہی میں لوٹ گئے۔

اس مہم کے سر کرنے کے بعد اطمینان پا کر حضرت عمرو بن عاص نے بیت المقدس کے رہنے والوں کے نام لکھا کہ ہم تمھیں آخری بار پھر مطلع کرتے ہیں کہ اسلام قبول کر لو ورنہ جزیہ دو اور اگر تمھیں منظور نہیں تو بخدا میں ایک ایسی فوج لے کر تم پر حملہ کروں گا جو صفحۂ ہستی سے تمھارا نام و نشان تک مٹا ڈالے گی اور تم میں سے ایک بھی فرد باقی نہ رہے گا۔ ارطبون جو اجنادین سے بھاگ کر بیت المقدس میں پناہ گزین تھا۔ اس نے اپنی شکست کا انتقام لینے کے لیے اہلِ بیت المقدس کو حضرت عمرو بن عاص کے خلاف پھر جنگ پر ابھارا۔ نیز ان کی شرطیں ماننے سے انکار کروا دیا۔ اب اس کے سوا کہ ان لوگوں کی سرکوبی کی جائے کوئی چارہ نہ تھا۔ چنانچہ حضرت عمرو بن عاص اٹھ کھڑے ہوئے اور آگے بڑھ کر بیت المقدس کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ اسی دوران میں حضرت ابو عبیدہ ابن الجراح اور حضرت خالد بن ولید بھی ان کی مدد کو پہنچ گئے۔

جب قلعے کا محاصرہ کیے چار مہینے گزر گئے اور فیصلہ کن جنگ کی کوئی نوبت نہ آئی تو حضرت ابو عبیدہ ابن الجرّاح نے اہلِ بیت المقدس کو لکھا کہ تم لوگ اگر اسلام قبول کر لو یا جزیہ دینا منظور کر لو تو بہتر ہے ورنہ ہماری فوجیں تمھیں تباہ و برباد کر کے ہی دم لیں گی۔ اس دھمکی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ارطبون

خوف کے مارے راتوں رات قلعہ چھوڑ کر مصر کی طرف بھاگ نکلا اور اہلِ بیت المقدس اس قدر خوفزدہ ہوئے کہ انھیں صلح کرنے کے سوا کوئی اور صورت دکھائی نہ دی جس سے ان کی جان بچ سکے۔

اہلِ بیت المقدس نے بادلِ نخواستہ صلح کا ہاتھ بڑھایا۔ لیکن اس پر بھی انھوں نے یہ شرط رکھی کہ امیرالمومنین (سیّدنا عمر فاروقؓ) خود یہاں تشریف لائیں اور اپنے ہاتھ سے امان نامہ لکھ کر دیں۔ حضرت ابوعبیدہ ابن الجرّاح نے دربارِ خلافت میں لکھا، چنانچہ سیّدنا عمر فاروقؓ بہ نفس نفیس تشریف لائے اور خود اپنے ہاتھ سے عہد نامہ لکھ کر دیا جس پر علاوہ دیگر زعمائے ملت کے حضرت عمرو بن عاص کے بھی دستخط تھے۔

بیت المقدس کی فتح کے بعد اب حضرت عمرو بن عاص اُن رومی فوجوں کے استیصال کی طرف متوجہ ہوئے جنھوں نے فلسطین کے مختلف مقامات پر ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ اور ایک ایک کر کے ان سب پر غالب آئے۔ اور سرکشی و بغاوت کا قطعی قلع قمع کیا۔ اب ان تمام مہمات سے فارغ ہونے کے بعد قیساریہ کی مہم رہ گئی، جہاں ہرقل کا بیٹا ایک لشکرِ جرار لیے خیمہ زن تھا۔ عمرو بن عاص اب اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اسی اثنا میں قسطنطین کو پتہ چلا کہ طبریہ پر حضرت عمرو بن عاص کا قبضہ ہو گیا اور میرا باپ انطاکیہ سے راہِ فرار اختیار کر کے قسطنطنیہ جا پہنچا۔ یہ وحشت اثر خبر اس کے دل کو جا کر کچھ ایسی لگی کہ وہ نیم پاگل سا ہو گیا اور اسے یوں محسوس ہونے لگا کہ جیسے عمرو بن عاص شہر کی فصیل توڑ کر شہر میں گھس آتے ہیں۔ آخر کار وہ خوف کے بڑھتے بڑھتے

اس حد تک جا پہنچا کہ رات کی تاریکی میں اپنے محل سے نکل بھاگا اور قسطنطنیہ پہنچ کر ہی دم لیا۔ جب صبح ہوئی اور شہر کے لوگوں کو پتہ چلا کہ اُن کے بادشاہ قسطنطین نے سخت بزدلی دکھائی تو اُن کے بھی حوصلے جاتے رہے۔ اب اس کے سوا کہ وہ مسلمانوں سے صلح کر لیں اور کوئی چارہ نہ تھا۔ غرض اس شہر پر بھی مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

قیساریہ کی فتح کے بعد شام میں طاعون کی وبا پھیل گئی۔ حضرت عمرو بن عاص نے چاہا کہ حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح وہاں سے چلے جائیں۔ لیکن انھوں نے جانا پسند نہیں کیا کہ لوگ کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ وہ مرنے سے ڈرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح نے اس مرض میں شہادت پائی۔ ان کے بعد حضرت یزید بن ابوسفیان اور حضرت معاذ بن جبل بھی اسی مرض میں مبتلا ہو کر چل بسے۔ اب ایک حضرت عمرو بن عاص رہ گئے تھے جو معاذ بن جبل کے جانشین ہوئے۔ اس سے پہلے حضرت معاذ بن جبل جانشین تھے۔ حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح کے اب حضرت معاذ بن جبل کی وصیت کے مطابق حضرت عمرو بن عاص اُن کے جانشین ہوئے اور انھوں نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ اسلام کے لشکر کو اس مقام سے جہاں پر طاعون کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ پہاڑی وادیوں میں منتقل کر دیا جس سے طاعون کی خوفناک وبا سے لشکر کو نجات مل گئی۔ سیدنا عمر فاروق نے حضرت عمرو بن عاص کی اس تدبیر کو بے حد سراہا اور دلی مسرت محسوس کی۔

فتح مصر

ملک مصر جس کے فاتح کی حیثیت سے حضرت عمرو بن عاص نے اسلام کی فتوحات میں بڑی شہرت حاصل کی چونکہ ابھی مشرف بہ اسلام نہیں ہوا تھا اور مسلمانوں کو یہ ڈر تھا کہ روم کا قیصر اب مصر کی طرف سے شام کے ملک پر حملہ کرے گا۔ حضرت عمرو بن عاص نے اس خطرے کو ٹالنے کے لیے ضروری سمجھا کہ مصر کو فتح کر لیا جائے۔ اس زمانے میں چونکہ طاعون کی وبا سے نجات ملے مسلمانوں کو تھوڑی ہی مدت گزری تھی اور اس کے اثرات ابھی پورے طور پر زائل نہ ہوئے تھے اس لیے سیدنا عمر فاروق ان حالات میں اسلام کی فوج کو باہر بھیجنا پسند نہ کرتے تھے۔ مگر حضرت عمرو بن عاص کا اصرار بڑھا ہوا تھا اس لیے دشمن کے خطرے کو سامنے رکھتے ہوئے رضامند ہو گئے۔ اور حضرت عمرو بن عاص کو ایک ہزار فوج دے کر مصر کی طرف بھیج دیا۔

حضرت عمرو بن عاص وادی العریش کے راستے سے مصر کی سرحد میں داخل ہوئے۔ پہلے آپ نے عریش ورفح وغیرہ فتح کیے۔ پھر ایک قدیمی اور تاریخی شہر فرما کو فتح کیا۔ یہ شہر کسی زمانے میں اپنی سنگین فصیلوں، گرجوں، کلیساؤں اور بلند ترین عمارتوں کے لحاظ سے ساری دنیا میں مشہور تھا۔ فرما کے بعد شہر بلبیس کو فتح کیا جو مصر سے تیس میل کے فاصلے فرما کے جنوب میں واقع ہے

اس لڑائی میں مصر کے بادشاہ مقوقس کی بیٹی ارمانوسہ جو بلبیس میں رہتی تھی دیگر جنگی قیدیوں کے ہمراہ گرفتار ہوئی جسے حضرت عمرو بن عاص نے نہایت عزت اور حفاظت کے ساتھ اس کے باپ مقوقس کے پاس پہنچا دیا اور مقوقس ان کے کریمانہ اور شریفانہ برتاؤ سے بے حد متاثر ہوا۔

بلبیس پر قبضہ کرنے کے بعد اب آپ مصر کے ایک اور شہر ام دنین کی طرف متوجہ ہوئے جو مصر کی سب سے بڑی بندرگاہ ہونے کی وجہ سے سب سے بڑا تجارتی مرکز تھا۔ یہاں کئی ہفتے لڑائی ہوتی رہی۔ کیونکہ مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی اور ان کے مقابلے میں رومی سپاہی کہیں زیادہ تھے۔ لہٰذا جنگ نے کافی طول پکڑ لیا۔ حضرت عمرو بن عاص اس سے اکتا گئے تھے اور انھوں نے دربار خلافت میں امداد بھیجنے کو لکھ دیا۔ لیکن دور دراز کا سفر ہونے کے سبب مدد کے پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ آخر کار حضرت عمرو بن عاص نے خود ہی جرأت کر کے نہایت بے جگری سے دشمن پر حملہ کر دیا اور اس پامردی اور جرأت سے لڑے کہ قلعہ پر مسلمانوں کا مکمل قبضہ ہو گیا۔ اس لڑائی میں بہت سا مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا، جن میں کافی تعداد میں کشتیاں بھی تھیں جو آگے چل کر لشکرِ اسلام کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوئیں۔

ام دنین کی فتح کے بعد اب حضرت عمرو بن عاص دریائے نیل کے مغربی علاقوں کو فتح کرنے کے لیے آگے بڑھے۔ چنانچہ "منف" پر حملہ کیا جس میں مصریوں نے سخت شکست کھائی۔ اس کے بعد انھوں نے شہر ہنسا پر حملہ کیا، جس میں رومی فوج کے سارغ رسانوں کی بہت بڑی تعداد

میدانِ جنگ میں کام آئی اور مسلمانوں نے اس کے قلعے کا محاصرہ کر لیا جو کافی عرصے تک جاری رہا اور مسلمانوں کے ڈر سے رومی قلعے ہی میں پڑے رہے اور انھیں قلعے سے باہر قدم رکھنے کی مطلقاً جرأت نہ ہو سکی۔

بعض وجوہات کی بنا پر جب آپ اس مہم کو یہیں پر نا تمام چھوڑ کر آگے بڑھے تو شہر ہیلیو پولیس جسے اہلِ عرب عین الشمس کہتے ہیں۔ اُن کے راستے میں آیا۔ یہاں عین الشمس کا فرماں روا بیس ہزار کا ایک تجربے کار لشکر لیے پہلے سے موجود تھا۔ حضرت عمرو بن عاص نے یہ بات دیکھی تو بہت خوش ہوئے۔ کہ آج مصر کے لوگ پہلی مرتبہ ان کے سامنے کھل کر آئے ہیں۔ حضرت عمرو بن عاص نے کمال حکمت و دانائی سے لشکرِ اسلام کو مرتب کیا۔ مگر عین الشمس کے فرمانروا میتھوڈورس نے جونہی اپنے مقابلے میں مسلمانوں کو صف بستہ پایا، جھپٹ کر حملہ کر دیا۔ حضرت عمرو بن عاص بھی اب بپھرے ہوئے ببر کی طرح اس پر جھپٹے اور کمال دادِ شجاعت دینے لگے۔ ابھی جنگ جاری تھی کہ دفعتہً خارجہ بن حذافہ اپنے ساتھیوں کو لے کر پہاڑ سے نکلے اور نکلتے ہی بجلی کی مانند رومیوں پر ٹوٹ پڑے اور ان کے اس اچانک حملے سے رومیوں کا اب سارا انتظام درہم برہم ہو گیا۔ وہ بدحواس ہو کر بھاگے۔ لیکن راستے میں اُنھیں پھر اُن مجاہدوں نے گھیر لیا، جنھیں حضرت عمرو بن عاص نے جنگی نقطہ نظر کے مطابق دریائے نیل کی گزرگاہ میں پہلے ہی سے چھپا رکھا تھا۔ اب رومی تین طرف سے مسلمانوں کے گھیرے میں آ چکے تھے اور مسلمانوں نے انھیں گاجر مولی کی طرح کاٹ کاٹ کر پھینکنا

شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ اُن کی فوج کے بیس ہزار سپاہیوں میں بمشکل تین ایک سو سپاہی اپنی جان بچا سکے۔ باقی سب کے سب قتل ہو گئے۔

عین الشمس کی فتح کے بعد حضرت عمرو بن عاص نے رومیوں کے مشہور قلعہ بابلیون کا محاصرہ کر لیا۔ یہ قلعہ انتہائی مضبوط اور وسیع تھا اور مصر کا بادشاہ مقوقس یہیں رہتا تھا۔ اب دشواری یہ تھی کہ حضرت عمرو بن عاص کے پاس نہ تو قلعہ شکن توپیں تھیں نہ زیادہ سامانِ حرب اور مصری کھل کر سامنے آتے نہیں تھے اور اگر کبھی آ نے بھی تھے تو ایک آدھ معمولی سی جھڑپ لے کر پھر قلعے میں جا گھستے۔ غرض اسی حال میں سات مہینے گزر گئے۔ لیکن مسلمانوں نے بھی قسم کھا رکھی تھی کہ جب تک کوئی فیصلہ کُن بات نہیں ہوتی محاصرہ نہیں اُٹھائیں گے۔ آخر کار مقوقس گھبرا گیا اور اُس نے مسلمانوں کو مرعوب کرنے کے لیے حضرت عمرو بن عاص کے نام ایک خط بھیجا، جس میں لکھا تھا کہ تم لوگ ہمارے ملک میں داخل ہو کر ایک طویل مدت سے ہمارا خون پی رہے ہو۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ رومی سپاہیوں کا ٹڈی دل، کیل کانٹے سے لیس ہو کر تمھارا مزاج بحال کرنے کے لیے چل پڑا ہے لیکن اس سے پہلے کہ وہ یہاں پہنچے۔ ہم تمھیں صلح کی بات چیت کا موقع دیتے ہیں۔ اگر جان بچانا منظور ہے تو گفتگو کے لیے سفیر بھیج دو۔

حضرت عمرو بن عاص نے قاصد سے خط لے کر پڑھا اور پھر اُسے دو روز روکے رکھا تاکہ وہ مسلمانوں کے شب و روز کچھ اندازہ کر لے کہ

کس نہج پر گزرتے ہیں اور اُن کے افعال و کردار بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ کس قدر پاکیزہ ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد جب تیسرے دن قاصد روانہ ہوا اور اپنے بادشاہ مصر مقوقس کے پاس پہنچا تو کہا اے بادشاہ! ہم نے مسلمانوں کو ایسی قوم کی صورت میں پایا ہے، جو زندگی پر موت کو ترجیح دیتی ہے۔ اور انکساری و تواضع اُسے شان و شوکت سے زیادہ پیاری ہے۔ اس کے کسی فرد کو بھی دنیا اور دُنیا کے سامان سے کوئی رغبت اور لگاؤ نہیں۔ وہ زمین پر بیٹھتے اور سواریوں کی پیٹھ پر کھانا کھاتے ہیں۔ اُس قوم کا امیر یا حکمران اُن سے کسی قسم کا امتیازی سلوک نہیں کرتا وہ اُنہی میں سے ایک فرد نظر آتا ہے۔ جب نماز کا وقت آتا ہے تو کوئی شخص بھی پیچھے نہیں رہتا۔ وہ اپنے ہاتھ پاؤں پانی سے دھوتے ہیں اور انتہائی سوز و گداز سے نماز پڑھتے ہیں۔ اس کے بعد اُس نے حضرت عمرو بن عاص کا خط دیا، جس میں لکھا تھا:۔

۱۔ اسلام قبول کر لو۔

۲۔ اسلام قبول نہیں کرتے تو جزیہ دو!

۳۔ اور اگر جزیہ کے لیے بھی تیار نہیں۔ تو پھر جنگ کے سوا کوئی صورت نہیں۔ یہاں تک کہ ہمارے تمھارے درمیان اللہ تعالیٰ فیصلہ کر دے۔

اگر تم اسلام قبول کر لو تو ہمارے بھائی بن سکتے ہو جو حقوق ہمیں حاصل ہیں وہی تمھیں حاصل ہو جائیں گے۔ اور اگر یہ منظور نہ ہو تو جزیہ ادا کرو۔ ہم اس کے بدلے میں تمھارے مال و جان اور عزت و آبرو کی

کی حفاظت کریں گے۔

مقوقس اپنے قاصد کی باتیں سن کر بہت متاثر ہو چکا تھا۔ اور خط پڑھ کر اس نے اپنے درباریوں سے کہا کہ مسلمانوں کی فتح میں اب کوئی شک و شبہ نہیں۔ ہم سب کی بہتری اسی میں ہے کہ مسلمانوں سے صلح کر لی جائے۔ چنانچہ درباریوں کی رضامندی پر اس نے اسلامی سفیر کو طلب کیا۔ حضرت عمرو بن عاص نے حضرت عبادہ بن صامت کو دس آدمیوں کے ساتھ بھیج دیا۔ حضرت عبادہ بن صامت بے حد کالے تھے۔ آپ جس وقت مقوقس کے دربار میں پہنچے تو وہ آپ کو دیکھتے ہی چلایا، اس کالے آدمی کو میری طرف آنے سے روکو۔ اس کے جواب میں جب مسلمان سفیروں نے کہا کہ یہ بزرگ ہم میں سب سے زیادہ صاحبِ علم و فضل ہیں اور ہمارے سپہ سالار عمرو بن عاص نے انھیں اسی لیے ہمارے وفد کا قائد بنا کر بھیجا ہے۔ تب کہیں جا کر مقوقس اُن سے بات چیت کرنے پر راضی ہوا۔

مقوقس نے کہا۔ تم لوگ بے حد لالچی اور حریص ہو۔ ہم سے کچھ مال و دولت سونا چاندی لے لو اور واپس چلے جاؤ۔ بصورت دیگر ہماری امدادی فوجیں عنقریب آیا چاہتی ہیں۔ تمھیں پیروں تلے کچل ڈالیں گی۔ حضرت صامت بن عبادہ نے غصے کو ضبط کرتے ہوئے جواب دیا۔ ہمارے نزدیک جنگ کا مقصد مال و دولت اور جاہ و منصب کا حصول نہیں۔ ہم تو صرف اللہ ہی کا نام بلند کرنے کے لیے لڑتے ہیں اور اسی کی راہ میں اس کے حکم کے مطابق جہاد کرتے ہیں اور اس میں جو غنیمتیں ہمیں حاصل ہوں۔ اُن سے فائدہ اُٹھانا

اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے جائز کر دیا ہے۔ ہمارے پاس چاہے سونے چاندی اور جواہرات کے ڈھیر ہوں یا ایک درہم بھی نہ ہو ہمیں اس کی بالکل کوئی پروا نہیں۔ روٹی کا ایک ٹکڑا جو ہماری بھوک مٹا سکے اور کپڑے کا ایک ٹکڑا جو ہمارا تن ڈھانپ سکے ہمارے لیے بہت کافی ہے۔ ہمارے پاس اگر ڈھیروں سونا بھی ہو تو ہم اسے اللہ تعالیٰ کی رضا پانے اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے خرچ کر دیتے ہیں۔ ہمیں دنیا کے عیش و آرام اور ساز و سامان کی کوئی حرص نہیں۔ ہمارے سامنے آخرت کی آسودگی اور سکون و راحت ہے۔ ہمیں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ برحق کے ذریعے یہی تعلیم دی ہے اور اسی کا ہم سے عہد لیا ہے۔ لہٰذا ہماری تمام تر کوششیں اللہ تعالیٰ ہی کی رضا و خوشنودی اور اس کا نام بلند کرنے کے لیے وقف ہیں۔

حضرت عبادہ بن صامت کے واپس چلے آنے کے بعد مقوقس نے اپنے درباریوں سے پھر کہا کہ میرا دل کہتا ہے، مسلمان ہمارا قلعہ ضرور فتح کر لیں گے، اس لیے مناسب یہی ہے کہ اُن سے صلح کر ہی لی جائے۔ لیکن رومی اُس کی بات سن کر پھر غصّے سے بپھر گئے اور اُسی وقت آگ بگولا ہو کر قلعے سے باہر نکل آئے اور آتے ہی مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ مسلمان جن کی خواہش ہی یہی تھی کہ رومی قلعہ سے نکلیں اور کھل کر مقابلہ کریں۔ اب اُن کے آنے سے بے حد خوش ہوئے اور بڑھ بڑھ کر دادِ شجاعت دینے لگے۔ حتیٰ کہ رومیوں کے قدم اُکھڑ گئے اور بھاگ نکلے۔ اب انھیں بھی یہ احساس پیدا ہو گیا کہ مقوقس کی رائے ٹھیک ہی ہے۔ مسلمانوں سے صلح کر لینا ہی مناسب ہے۔ چنانچہ مقوقس اپنے درباریوں کے ہمراہ صلح کی درخواست لے کر حضرت عمرو بن عاص

کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت عمرو بن عاص نے اُن کا نہایت فراخدلی سے استقبال کیا اور قدرے نرم لہجے میں فرمایا۔ آپ بذات خود تشریف لائے ہیں۔ ہم آپ کے ممنون ہیں۔ اس کے جواب میں مقوقس نے بھی سر جھکاتے ہوئے کہا، بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ سرزمین عطا فرمادی ہے۔ اب میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ رومیوں کے خلاف بالکل کوئی جنگ نہ کریں۔

صلح کرنے کے بعد مقوقس نے اس واقعہ کی اطلاع قیصر روم کو بھجوا دی۔ مگر قیصر روم خط دیکھتے ہی آگ بگولا ہوگیا اور اُس نے فوراً ایک فوج مسلمانوں سے لڑنے کے لیے مصر کی جانب روانہ کردی۔ مقوقس یہ صورت دیکھ کر قلعہ سے باہر چلا گیا اور حضرت عمرو بن عاص کو کسی سے کہلوا بھیجا کہ میں اپنے عہد پر بدستور قائم ہوں۔

پھر اسی دوران میں اطلاع پہنچی کہ قیصر روم ہرقل مر گیا۔ تو لوگوں نے کہا کہ یہ سزا ہے مقوقس کی بات نہ ماننے کی جو خدا نے ہرقل کو اجل کے سپرد کر دیا۔ اب اس کے بعد مسلمانوں نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ رومیوں پر حملہ آور ہونے کی تیاریاں شروع کردیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں جو صاحب سب سے آگے بڑھے وہ حضور پیغمبر اسلام کے پھوپھی زاد بھائی زبیر ابن العوام (حضرت عبداللہ بن زبیر کے والد) تھے۔ انھوں نے رومیوں پر حملہ کرنے سے پہلے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ اے مسلمانو! میں اپنی جان اللہ کے سپرد کرتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں مسلمانوں کو ضرور فتح عطا فرمائے گا۔ اور یہ کہتے ہی پھر قلعہ کی فصیل پر سیڑھی لگائی اور مسلمانوں کو ہدایت کی کہ جب میں،

نعرۂ تکبیر بلند کروں، تم پوری طاقت سے اُس کا جواب دینا۔ اب آپ تلوار ہاتھ میں لے کر نہایت پھرتی کے ساتھ دیوار پر چڑھ گئے اور نہایت بلند آواز سے تکبیر کہی جس کا باہر سے مسلمانوں نے پورے جوش و خروش کے ساتھ جواب دیا۔ رومیوں نے اب جو تکبیر کے نعروں کا شور و غل سُنا تو سمجھے کہ مسلمانوں نے قلعے کو فتح کر لیا۔ چنانچہ وہ اپنی جانیں بچانے کے لیے بدحواس ہو کر اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ حضرت زبیر ابن العوام نے آگے بڑھ کر قلعہ کا دروازہ کھول دیا۔ اسلامی فوج اندر آگئی اور آتے ہی قلعے پر قبضہ کر لیا۔

اب اس مہم سے فارغ ہو کر حضرت عمرو بن عاص اسکندریہ کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ اس مرتبہ آپ کی فوج میں قبطی بھی شامل تھے۔ سبب اس کا یہ تھا کہ مقوقس نے قلعے سے نکلتے ہوئے قبطیوں کو تاکید کی تھی کہ وہ رومیوں کے بجائے مسلمانوں سے تعاون کریں کیونکہ مسلمانوں کا حسنِ سلوک رومیوں کے مقابلے میں بدرجہا بہتر ہے۔ اسکندریہ کی جانب چلتے ہوئے راستے میں انھیں جو سب سے پہلا شہر پڑا وہ طرنوش تھا، جہاں رومیوں نے مسلمانوں کو ایک لمحہ کی مہلت دیے بغیر آتے ہی جنگ کے میدان میں اُترنے پر مجبور کر دیا اور جنگ شروع ہو گئی۔ جب رومیوں نے دیکھا کہ قبطی جو کل تک ہمارے ساتھ مل کر مسلمانوں سے جنگ کرتے رہے آج مسلمانوں سے مل کر ہم سے جنگ کر رہے ہیں تو سخت حواس باختہ ہوئے۔ اور آخر کار مرعوب ہو کر ہتھیار ڈال دیے۔

طرنوش کے بعد جب اسلامی فوج شہر نقیوس کے قریب پہنچی تو رومی سپہ سالار صرف اتنی بات سُن کر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا کہ اسلامی فوج اس کے

مضبوط قلعہ کی طرف بڑھی چلی آرہی ہے اور چشم زدن میں قلعے کو مٹی کا ڈھیر کر ڈالے گی۔ چنانچہ وہ سر پہ پاؤں رکھ کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ اِدھر سپاہیوں نے جو اپنے سپہ سالار کو ایسے بدحواس ہو کر بھاگتے دیکھا تو اُن میں بھی افراتفری مچ گئی اور انھوں نے گھبرا گھبرا کر دریا میں چھلانگیں لگانی شروع کر دیں۔ اور کشتیوں میں اپنے آپ کو اس قدر بھرنا شروع کر دیا کہ وہ اُن کے بوجھ کی متحمل نہ ہو سکیں اور دریا میں غرق ہو گئیں۔ خوبیٔ تقدیر سے اگر کچھ لوگ بچ گئے تھے تو وہ بھی ایک طرف پھر بھاگ کھڑے ہو گئے۔ غرض تقیوس کا قلعہ بھی مسلمانوں کو بغیر لڑے بھڑے حاصل ہو گیا۔ پھر اسی طرح آگے چل کر اُن کی راہ میں ایک شہر سلبطس آیا۔ اگرچہ یہاں رومیوں نے مسلمانوں کا مقابلہ کیا تاہم بہت جلد سخت منہ کی کھائی اور حضرت عمرو بن عاص نے اسے بھی فتح کر لیا۔ اس کے بعد جب اسلامی لشکر پھر آگے بڑھا تو اس کی راہ میں ایک شہر کریون آیا، جس کا قلعہ نہایت قدیم اور مضبوط تھا۔ اس مقام سے اسکندریہ تھوڑے ہی فاصلہ پر تھا۔ یہاں بھی رومی فوجوں نے اسلامی لشکر سے معرکہ آرائی کی۔ رومی سپہ سالار تھیوڈرس اس قلعے کی دیوار کے پیچھے اپنی فوجوں کو چھپائے بیٹھا تھا اور اس تاک میں تھا کہ جونہی لشکرِ اسلام اس راہ سے بے دھیان گزرے اس پر اچانک حملہ کر دے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ مسلمانوں کو اس غیر متوقع حملے سے پہلے تو گھبراہٹ محسوس ہوئی لیکن پھر وہ جلد ہی سنبھل گئے۔ حضرت عمرو بن عاص جب خود تلوار لے کر آگے بڑھے تو سخت گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ رومیوں کو اپنے بہت سے قلعوں کے ہاتھ سے نکل جانے

کا بے حد غم تھا۔ اب وہ پورے زور شور سے حملہ کر رہے تھے۔ اور اپنے کھوئے ہوئے وقار کو پانے کی سر دھڑ کی بازی لگا چکے تھے۔ حتیٰ کہ پورے دس دن تک میدان کارزار گرم رہا۔ مگر لڑائی فیصلہ کن مرحلے میں داخل نہ ہو سکی۔

جنگ کو طول پکڑے ہوئے دیکھ کر حضرت عمرو بن عاص نے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ بھائیو! ساتھیو! یہ دنیا سرائے فانی ہے۔ پھر ہم کیوں نہ خدا کی راہ میں شہید ہو کر ہمیشہ کی زندگی حاصل کر لیں اور یہ کہتے ہوئے پھر انھوں نے اپنے ساتھ مسلمانوں کو لے کر ایسا بھرپور حملہ کیا کہ رومی سپاہ تاب نہ لاتے ہوئے بھاگ کھڑی ہوئی۔ سپاہ کو راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے جب تھیوڈرس نے دیکھا تو وہ بھی جان بچانے کے لیے اسکندریہ کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

اس جنگ میں حضرت عمرو بن عاص کے بیٹے حضرت عبداللہ بن عمرو اور ان کے غلام وردان بُری طرح زخمی ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ تمام بدن زخموں سے چُور چُور تھا۔ جن میں سے بعض زخم تو بہت ہی گہرے تھے۔ حضرت عمرو بن عاص نے جب اُن کی یہ حالت دیکھی تو اُن سے نہ رہا گیا۔ پہلے وردان سے کہا۔ اے وردان! چند روز لشکر کے پیچھے رہو تاکہ تمھیں کچھ راحت مل جائے۔ انھوں نے جواب دیا۔ راحت پیچھے کہاں ہے وہ تو آگے ہے۔ پھر اس کے بعد اپنے بیٹے سے بولے۔ اے بیٹا! اپنے زخموں کا علاج تو کر لو۔ انھوں نے کہا، ابا جان! ہم تو خدا کی راہ میں جان دینے کے لیے ہیں ان جراحتوں کی کیا پرواہ؟ حضرت عمرو بن عاص ان کا جواب سُن کر خوشی سے اُچھل پڑے اور کہا کیوں نہ ہو آخر میرا ہی تو بیٹا ہے۔

اب حضرت عمرو بن عاص ایک ماہ بعد اسکندریہ ایسے مشہور تاریخی مقام

کی فتح کے لیے جا پہنچے جسے مشہور عالم فاتح اسکندر یونانی نے بحرابیض پر تعمیر کیا تھا۔ اس موقع پر اسلامی فوج کی تعداد آٹھ ہزار یا زیادہ سے زیادہ بارہ ہزار تھی لیکن رومی فوج پوری پچاس ہزار تھی۔ اسلامی فوج کا حال یہ تھا کہ اُس کے پاس نہ قلعہ شکن آلات حرب تھے نہ بحری جنگ کے لیے جہاز اور رومی پورے طور پر مکمل کانٹے سے لیس اور سر سے لے کر پیر تک لوہے میں غرق تھے۔ اور خون کا آخری قطرہ تک بہا دینے کا عزم کیے میدانِ جنگ میں نکلنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ پھر جب وہ مکمل تیار ہو کر نکلے تو مسلمانوں نے باوجود بے سروسامان ہونے کے اپنی جانوں کو خدا کے سپرد کر کے مردانہ وار تلواروں سے ان کا استقبال کیا۔ جنگ شروع ہو گئی اور اس قدر بڑھی کہ متواتر دو مہینے تک جاری رہی۔

ایک روز قبیلہ مہرہ کے ایک مجاہد اسلام دشمن رومیوں سے لڑتے لڑتے شہید ہو گئے اور اُن کا سر نامراد رومی کاٹ کر اپنے ساتھ لے گئے۔ مہریوں نے حضرت عمرو بن عاص سے آکر شکایت کی اور کہا کہ جب تک ہمارے بھائی کا سر واپس نہیں ملے گا ہم لاش کو دفن نہیں کریں گے۔ حضرت عمرو بن عاص نے کہا، بھلا رومیوں کو تمھارے غم و غصے کی کیا پرواہ اب تو ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ تم بھی کسی رومی کا سر کاٹ کر لے آؤ۔ جب وہ اس کی واپسی کا تقاضا کریں تم بھی واپسی کا تقاضا کر دینا۔ وہ اگر سر تمھیں واپس کر دیں تم بھی انھیں واپس کر دینا۔ چنانچہ دوسرے ہی دن مہریوں نے رومیوں کے ایک سردار کو موقع پا کر مار گرایا اور اُس کا سر کاٹ کر ساتھ لے آئے۔

ایک روز حضرت عمرو بن عاص کو بڑی الجھن پڑ گئی۔ قصّہ یوں ہوا کہ

مسلمانوں نے شجاعت کے جوش میں آکر اس زور سے رومیوں پر حملہ کیا کہ وہ برابر قلعے میں گھستے چلے گئے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد رومیوں نے بھی کچھ ایسی جرأت دکھائی کہ تمام مجاہدوں کو قلعے سے باہر دھکیل دیا۔ لیکن حضرت عمرو بن عاص۔ آپ کے غلام وردان اور مسلمہ بن مخلد رومیوں سے لڑتے لڑتے قلعے کے اندر ہی رہ گئے۔ رومی سپاہی انھیں گرفتار کرکے اپنے حاکم کے پاس لے گئے جہاں حضرت عمرو بن عاص نے اُس سے بڑی جرأت اور بے باکی سے گفتگو کی۔ رومی حاکم کو اس سے اندازہ ہوگیا کہ یہی مسلمانوں کی فوج کے سپہ سالار ہیں۔ چنانچہ اُس نے آپ کے قتل کا حکم دے دیا۔ آپ کے غلام وردان جو آپ ہی کے پاس کھڑے تھے یہ دیکھ کر کہ حضرت عمرو بن عاص قتل ہوا چاہتے ہیں۔ انھوں نے آپ کے منہ پر طمانچہ دے مارا۔ اور بولے۔ خاموش رہ کُتے۔ سرداروں کے سامنے اس طرح گستاخانہ نہیں بولا کرتے۔ پھر حضرت مسلمہ بن مخلد نے رومی حاکم سے کہا۔ ہمارے خلیفہ نے حضرت عمرو بن عاص یعنی ہمارے سپہ سالار کو حکم دیا ہے کہ محاصرہ اُٹھا لیا جائے۔ اور صلح کی بات چیت کر لی جائے۔ حاکم نے یہ سن کر کہ اب مسلمان محاصرہ اُٹھانے والے ہیں۔ اور صلح کی بات چیت ہوا چاہتی ہے۔ حضرت عمرو بن عاص کو ایک معمولی سپاہی خیال کرتے ہوئے چھوڑ دیا اور اس طرح وردان کی فراست سے حضرت عمرو بن عاص قتل ہوتے ہوتے بچ گئے۔

اب رومیوں اور مسلمانوں کے درمیان مسلسل جنگیں برپا ہوتے ایک سال دو مہینے پورے ہو گئے۔ حضرت عمر فاروق فتح کا مژدہ سننے کے لیے بے چین رہنے لگے۔ حتیٰ کہ جب انتظار کی مدت حد سے گزر گئی تو آپ نے حضرت عمرو بن عاص

کو لکھا: معلوم ہوتا ہے تم بھی آرام طلب رومیوں کی طرح اب آرام پسند ہو گئے۔ ورنہ فتح میں اتنی دیر کیوں ہے۔ حضرت عمرو بن عاص نے اسلامی فوج کو خط کے مضمون سے مطلع کیا پھر حضرت عبادہ بن صامت سے اُن کا نیزہ لے کر اپنا عمامہ اتارا اور اس نیزے سے باندھ دیا پھر اسے علم بنا کر حضرت عبادہ بن صامت کو واپس کر دیا اور کہا آج سے آپ علم بردار ہیں۔ اس کے بعد حضرت زبیر ابن العوام کو حضرت مسلمہ کی فوج کا ہراول مقرر کیا اور ساری فوج کے آگے آگے ننگی تلوار لیے خود رومیوں کی طرف بڑھے اور ایسا میدان کارزار گرم کیا کہ جب تک دشمن رومیوں کی بری اور بحری فوجوں کو شکست فاش نہ دے دی جنگ برابر جاری رکھی۔

جنگ سے فراغت پانے کے بعد آپ نے حضرت عمر فاروق کی خدمت میں فتح مصر کی خوشخبری پہنچائی اور لکھا کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے فضل و کرم سے ہم پر اس عظیم مملکت کے دروازے کھول دیے ہیں جس کی شان یہ ہے کہ اس میں چار ہزار عالی شان محلات، چار ہزار حمام اور طعام خانے ہیں۔ چار سو کھیل کے میدان ہیں۔ بارہ ہزار میوہ فروش ہیں اور چالیس ہزار یہودی ذمی آباد ہیں۔ حضرت عمر فاروق نے خط پڑھتے ہی خدا کی بارگاہ میں سجدۂ شکر ادا کیا۔ اس کے بعد آپ نے مسجد نبوی میں مسلمانوں کو جمع کر کے فتح مصر کی خوشخبری دی۔

فتح مصر کے علاوہ حضرت عمرو بن عاص کا ایک قابلِ ذکر کارنامہ نہر سویز کی تعمیر ہے جسے انھوں نے حضرت عمر فاروقؓ کے حکم پر بنانا شروع کیا تھا اور بہت جلد پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا۔ اس نہر نے دریائے نیل کے پانی کو بحر احمر کے پانی

سے ملا دیا اور اس کے ذریعے سے مصر کے غلے کو عرب کی بندرگاہ "ینبوع" پر بھیجنے میں بڑی آسانی ہو گئی۔ اسی برس تک یہ نہر کار آمد رہی، لیکن بعد میں ریت سے بھر جانے کے باعث بیکار ہو گئی۔

وفات

کتاب المعارف ابن قتیبہ اور اسد الغابہ میں لکھا ہے کہ حضرت عمرو بن عاص کی رحلت کا وقت جب قریب آیا تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا گو ہوئے اور کہا اے اللہ! تو نے حکم دیا میں نے سرتابی کی تو نے ممانعت کی، میں نے نافرمانی کی اگر تو مجھے معاف کر دے تو مجھ پر یہ تیرا کرم ہے اور اگر سزا دے تو میں اپنے اعمال کی بدولت اس کا مستحق ہوں۔ میں قوی نہیں کہ غالب آجاؤں۔ بے گناہ نہیں کہ معذرت کروں۔ معذور نہیں بلکہ گناہوں کی معافی چاہنے والا ہوں۔ تیری بخشش کا امیدوار ہوں اور تیرے حضور اپنے گناہوں سے توبہ کرتا ہوں اے اللہ! یہ میرا ہاتھ میری ٹھوڑی کے پاس ہے آخر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کہتے ہوئے جان بحق تسلیم ہوئے۔ تاریخ وفات ۲۹ رمضان المبارک ۴۳ھ ہے نوے سال کی عمر پائی۔

سعدؓ بن وقاص

نام و نسب

ولادت

مکے میں پیدا ہوئے۔ سن ولادت بڑی تلاش کے باوجود نہیں مل سکا۔ اغلب ہے کہ وہ حضرت ابوبکر کی عمر کے تھے۔ نسب کے لحاظ سے قریشی زہری ہیں۔ ان کی والدہ حمنہ بنت سفیان بن اُمیہ بن عبدالشمس بن عبدمناف تھیں۔ جو ابوسفیان بن حرب ابن امیہ کے چچا کی بیٹی تھیں۔

سعد بن وقاص حضور پیغمبر اسلام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتے میں ماموں لگتے تھے اور آپ کے مشہور صحابی تھے۔ اور اُن پانچ مسلمانوں میں سے ایک ہیں جو حضرت ابوبکر صدیق کے ترغیب دلانے پر مسلمان ہوئے تھے۔ یعنی حضرت زبیر بن العوام (حضور کے پھوپھی زاد بھائی) حضرت عثمان بن عفان، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت طلحہ بن عبیداللہ اور پانچویں یعنی حضرت سعد بن وقاص جن کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ شہ سوار اور مجیب الدعوات تھے۔ ان اصحاب رسول اللہ میں چار سخت آدمیوں میں سے ایک خیال کیے جاتے ہیں۔ یعنی حضرت عمر حضرت زبیر، حضرت علی ابن ابی طالب اور ایک یہی حضرت سعد بن ابی وقاص جن کے بارے میں مشہور ہے کہ اسلام کی خاطر سب سے پہلے انھوں نے ہی ایک کافر کو قتل کیا۔ جو مسلمانوں کو نماز پڑھنے سے روکتا تھا اور سب سے پہلے انھوں نے ہی کفار مکہ پر تیر چلایا جو مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کیے جارہے تھے۔

ابتدائیہ

تسخیر ایران کی جس مہم کا آغاز حضرت خالد بن ولید نے اپنے پہلے حملے میں کیا تھا حضرت سعد بن وقاص نے اُسے اپنے دوسرے حملے میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ آپ کی سپاہیانہ زندگی اُس وقت شروع ہوئی جب مکّہ کے مسلمان ہجرت کر کے مدینہ پہنچے اور وہاں بھی کفار مکّہ نے انھیں چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ اُن کے حملے کا خطرہ مسلمانوں کے لیے وہاں بھی موجود تھا۔ چنانچہ حضور پیغمبر اسلام اور آپ کے جاں نثار مسلمان خطرے کو سامنے رکھتے ہوئے مدینے میں چوکنے رہتے اور تمام رات جاگتے رہتے۔ اکثر اوقات خود پیغمبر اسلام لاکھوں درود و سلام ہوں اُن پر بہ نفسِ نفیس راتوں کو پہرہ دیتے اور جب خود آرام فرماتے تو کسی دوسرے بہادر کو پاسبانی کے لیے کھڑا کر دیتے۔

ایک رات حضورؐ پیغمبر اسلام اور آپ کے جاں نثار مسلمانوں کو کفارِ مکّہ کے ناپاک ارادوں سے بڑا خطرہ تھا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ آج کی رات کوئی بہادر آدمی پہرہ دے۔ اور ابھی حضورؐ اپنی زبان مبارک سے یہ جملہ مکمل کرنے بھی نہ پائے تھے کہ حضرت سعد بن وقاص ہتھیار پہن کر تیار ہو گئے۔ یہ گویا حضرت سعد بن وقاص کی سپاہیانہ زندگی کی پہلی رات تھی۔ پھر جب آپ ایک باقاعدہ سپاہی بن گئے تو مدینے سے دُور کفارِ مکّہ

کی فوجی نقل و حرکت معلوم کرنے کے لیے مقرر کیے گئے۔

ایک مرتبہ آپ دشمن کی نقل و حرکت معلوم کر رہے تھے کہ ایک دشمن نے اچانک آپ کی طرف تیر پھینکا اور آپ کو اس سے مقابلہ پیش آگیا چنانچہ آپ نے بھی ایک تیر چلایا یہ گویا اسلام اور مسلمانوں کی خدمت اور حفاظت کے لیے پہلا تیر تھا جو آپ کے ترکش سے نکلا اور دشمن کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ یہی وہ ایام تھے جن میں حضرت سعد بن وقاص کو قدرت الٰہی کی طرف سے سپاہیانہ تربیت ملی اور آپ خطرات کا مقابلہ کرنے کے عادی ہو گئے۔ پھر جب جنگ بدر کا معرکہ قتال و جدال گرم ہوا تو اس میں آپ کی تلوار منجھ گئی۔ آپ اس لڑائی میں اس حد تک لڑے کہ دشمن کے چھکے چھوٹ گئے اور اوسان خطا ہو گئے۔ دشمنانِ اسلام کے کئی بڑے بڑے افسروں اور بہادروں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ پھر جب جنگِ اُحد ہوئی تو اُس وقت حضرت سعد بن وقاص ایک تجربے کار اور آزمودہ کار سپاہی بن چکے تھے۔ آپ کو معرکہ سر کرنے کی بہت عمدہ مشق ہو گئی تھی۔ حتیٰ کہ آپ نے اپنی ماہرانہ سپہ سالاری سے جنگِ اُحد میں اسلام کے دشمنوں پر کاری ضرب لگائی تیروں کا مینہ برسایا۔ خود پیغمبر اسلام اس کی داد دیے بغیر نہ رہ سکے آپ نے فرمایا میرا باپ تم پر قربان تیر چلاتے جاؤ۔

حضرت سعد بن وقاص کی جنگی قابلیت اصابتِ رائے کی خود حضور پیغمبرِ اسلام ہی کے مبارک زمانے میں لوگوں پر دھاک

بیٹھ چکی تھی اور حضرت عمر فاروق کے عہد خلافت کے ابتدائی ایام تک تو آپ کو ایک ممتاز مجاہد اولوالعزم سپاہی تسلیم کیا جا چکا تھا۔ پھر جب شکست خوردہ ایرانیوں کی سازشوں اور شورشوں کے باعث مسلمانوں کے ہاتھ سے مفتوحہ علاقے نکل گئے۔ اور حضرت عمر فاروق کو پتہ چلا کہ ایرانیوں نے اُن کے اُس حکم سے ناجائز فائدہ اُٹھایا ہے جس میں عراق کی فتح کے بعد اسلامی فوج کو آگے بڑھنے اور اسلامی سرحدوں میں توسیع نہ کرنے کی اطلاع دی گئی تھی۔ تو اس نازک ترین موقع پر متفقہ رائے سے حضرت سعد بن وقاص ہی کو اسلامی فوجوں کا سپہ سالار مقرر کیا گیا۔

ایران کی جانب مسلمانوں کی مزید پیش قدمی کے سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس کی نوعیت صرف دفاعی تھی، جارحیت نہیں تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ سیدنا عمر فاروق بھی اُسی خارجہ پالیسی پر قائم رہے جسے اسلام کے دشمن رومیوں اور ایرانیوں کی سرکوبی کے لیے سیدنا ابوبکر صدیق نے اپنے عہد خلافت میں وضع کیا تھا۔ یہی سبب ہے کہ فتح عراق کے بعد جو نتیجہ ہے دین اسلام اور ملت اسلامیہ کی مدافعت اور حفاظت کے لیے جہاد کا۔ حضرت عمر فاروق نے مجاہدین اسلام کو آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔ اور مسلمانوں کو ایران کی طرف مزید پیش قدمی کی اجازت مانگنے پر بقول ولیم میور ایک مغربی مفکر کے یہ کہلا بھیجا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ عراق و عرب کے درمیان آتشیں پہاڑ حائل ہوں تاکہ نہ تو ایرانی ہم تک پہنچ سکیں اور نہ ہم ایرانیوں تک پہنچ سکیں۔ عراق کا میدان ہماری ضرورتوں کے لیے کافی ہے۔ میں اپنی قوم کی حفاظت کو ہزاروں مال غنیمت اور فتوحات پر ترجیح دیتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ حضرت عمر فاروق یہ خیال کرتے تھے کہ اب ایرانیوں کا زور

ٹوٹ چکا ہے۔ وہ آئندہ مسلمانوں کو نہیں ستائیں گے۔ لہٰذا مزید پیش قدمی کرنا مناسب نہیں۔

لیکن پھر جب حضرت عمر فاروق کی خلافت کو تین سال گزر گئے اور سارا عرب، عراق اور شام کا ملک مفتوح ہو کر اسلامی سلطنت میں شامل ہو گیا اور ایرانی و رومی اپنے پڑوس میں اسلام کی ایک نئی طاقت (سلطنت) کو اُبھرتا دیکھ کر بغض و حسد کے مارے انگاروں پر لوٹنے لگے اور باوجود اطاعت کا اقرار کرنے کے مسلمانوں کے خلاف سازشیں اور سلطنتِ اسلامیہ سے بغاوتیں کرنی شروع کر دیں۔ وہ ابتدا ہی سے چاہتے تھے کہ جیسے تیسے بن پڑے اسلام اور مسلمانوں کو حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالیں۔ تو ان حالات میں حضرت عمر فاروق کو بھی اپنا حکم واپس لینے پر مجبور ہونا پڑا۔

لیکن اس سے پہلے کہ مجاہدینِ اسلام ایران کی طرف پیش قدمی کریں، اتمامِ حجت کے لیے حضرت عمر فاروق نے یہ ضروری سمجھا کہ ایرانی بار بار معاہدہ شکنی اور بغاوت کیوں کرتے ہیں، اس کے اسباب معلوم کریں۔ آپ نے مجاہدینِ اسلام سے پوچھا کہ کیا تم ایرانیوں کے ساتھ سختی کا برتاؤ تو نہیں کرتے؟ انھوں نے بیک زبان ہو کر عرض کیا کہ ہرگز ایسا نہیں۔ اصلی بات یہ ہے کہ آپ نے ہمیں اسلامی سلطنت کی سرحدوں کے پھیلانے اور توسیع کرنے سے روک رکھا ہے جس کے باعث ایرانیوں کے درمیان اُن کا جو بادشاہ موجود ہے وہ اُنھیں مسلمانوں کے خلاف ہمیشہ بھڑکاتا اور بغاوت پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ اور جب تک یہ صورتِ حال رہے گی اس وقت تک امن و امان

کا قائم ہونا غیر ممکن ہے۔ ظاہر ہے دو بادشاہ ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ حتیٰ کہ ایک دوسرے کو نکال باہر کرے گا لہٰذا ہماری درخواست ہے کہ ہمیں پیش قدمی کی اجازت مرحمت فرمائی جائے، تاکہ ہم فتنے اور فساد کو بیخ و بُن سے اُکھاڑ پھینکیں۔ علاوہ ازیں اس موقع پر خود ایرانی (نومسلم) ہرمزان نے بھی مسلمانوں کے اس مطالبہ کی پُرزور حمایت اور تائید کی۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق سے اجازت پاکر حضرت سعد بن وقاص اسلامی لشکر کے ساتھ ایران کی تسخیر کے لیے روانہ ہو گئے۔

فتوحات

جیسا کہ پچھلے اوراق میں بیان کیا جا چکا ہے کہ مسلمانوں اور ایرانیوں کی پہلی مڈبھیڑ ایران کی سرحد سے پچاس میل دور ایک مقام حفیر پر ہوئی تھی جس میں ایران کے سپاہیوں نے ثابت قدمی سے لڑنے کے لیے اپنے پاؤں میں زنجیریں ڈال رکھی تھیں۔ اسی مناسبت سے یہ معرکہ، جنگ سلاسل کے نام سے مشہور ہے لیکن ان تمام تدابیر کے باوجود انھیں مسلمانوں پر غلبہ حاصل نہ ہو سکا اور انھوں نے حضرت خالد بن ولید کے ہاتھوں شکست فاش کھائی۔

اب ایک مسلمان مجاہد مثنیٰ بن حارث شیبانی کا حال سنیے، جنھوں نے بحرین میں بنی بکر کی اُس بغاوت کو دبانے میں بہت اولوالعزمی اور بہادری دکھائی جو ایرانیوں کی شہ پا کر اس قبیلے نے کی تھی۔ مثنیٰ بن حارث نے بنی بکر اور اس کے حلیف ایرانیوں کو اُن کی بغاوت اور سازش کا وہ مزہ چکھایا کہ انھیں چھٹی کا دودھ یاد آ گیا۔

لیکن پھر ایرانیوں نے اپنی فوج کی تعداد بڑھا کر خلیج فارس کے کنارے پر آباد اُن عرب قوموں کو مزید ستانا شروع کر دیا، جن میں خود مثنیٰ بن حارثہ شیبانی کا قبیلہ بھی تھا۔ اب مثنیٰ اپنے قبیلے کے آٹھ ہزار آدمیوں کو لے کر پھر ایرانیوں کے مقابلے میں آ گئے۔ لیکن اس مرتبہ ایرانی فوج کی تعداد کئی گنا زیادہ ہونے کے باعث انھیں

کمک کی سخت ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ انھوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کی خدمت میں مزید کمک کے لیے لکھ بھیجا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ اس زمانے میں بسترِ علالت پر دراز تھے۔ انھوں نے حضرت عمر فاروق رضؓ کو وصیت کی کہ وہ سب سے پہلے عراق کی طرف متوجہ ہوں اور مثنیٰ بن حارثہ رضؓ کو کمک بھیجنے کا فوری بندوبست کریں۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق نے خلیفہ ہوتے ہی سب سے پہلے یہی کام کیا کہ حضرت مثنیٰ بن شیبانی کی امداد کے لیے قبیلہ ثقیف کے مشہور سردار ابوعبیدہ رضؓ ثقفی کی سپہ سالاری میں ایک فوج روانہ کی اور تمام مسلمانوں کو جن میں بڑے بڑے صحابہ بھی تھے ابوعبیدہ ثقفی کے ماتحت رہ کر کام کرنے کا حکم دیا۔

اس زمانے میں ایران کے تخت پر ایک عورت پوران دخت بیٹھی تھی۔ اُس نے ایک ایرانی شہزادے رستم کو وزیرِ جنگ مقرر کر کے ساری مملکت ایران کے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا۔ رستم نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ عراق کے تمام علاقوں میں جو مسلمانوں کے زیرِ نگین تھے اپنے قاصد اور نقیب روانہ کر کے مسلمانوں کے خلاف بغاوت کرا دی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سب کے سب علاقے مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔

رستم کے علاوہ پوران دخت نے دو سپہ سالار اور منتخب کیے۔ ان میں ایک مشہور ایرانی جرنیل "نرسی" اور دوسرا "جابان" تھا۔ پوران دخت نے ان جرنیلوں کو ایک ایک فوج دے کر مسلمانوں کے مقابلے کے لیے دو مختلف راستوں سے روانہ کیا۔ جابان عراق کا ایک مشہور بہادر اور سردار تھا۔ وہ عرب کے مسلمانوں سے

دلی بغض رکھتا تھا۔ جب وہ اپنی فوج کے دو نامور افسروں مردان شاہ اور جوشن کو لے کر آگے بڑھا تو ابوعبیدہ ثقفی نے بھی پیش قدمی کی اور نمارق کے میدان میں دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ ہر چند ایرانی بڑی بہادری سے لڑے مگر آخر کار شکست کھائی۔ اگرچہ جابان گرفتار ہو گیا لیکن وہ سادہ لوح مسلمانوں کو دھوکہ دے کر ان کی قید سے بچ کر صاف نکل گیا۔

نمارق کو فتح کرنے کے بعد ابوعبیدہ رضؓ ثقفی اب کسکر کی طرف بڑھے، جہاں "نرسی" ایک لشکر جرار لیے پہلے سے موجود تھا۔ "نرسی" مسلمانوں کے ہاتھ دیکھ کر اب لڑنے سے گریز کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ اس سے پہلے میدان کارزار گرم ہو اُسے مزید کمک حاصل ہو جائے۔ لیکن ابوعبیدہ نے خود پیش قدمی کر کے بعجلت تمام نرسی کی فوج پر حملہ کر دیا۔ ایرانیوں میں کھلبلی مچ گئی اور میدان جنگ سے بھاگ نکلے۔

اب نمارق اور کسکر کی شکست کا حال سن کر ایران کا وزیر جنگ رستم بڑا غضبناک ہوا اور اس نے ایران کے ایک اور نامور جرنیل بہمن جادویہ کی سپہ سالاری میں ایک عظیم الشان فوج مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے بھیجی۔

اسلامی فوج دریائے فرات کے کنارے پر تھی اور ایرانی فوج اس کے دوسرے کنارے پر۔ ایرانی فوج کے سپہ سالار بہمن جادویہ نے ابوعبیدہ کو قاصد سے کہلوا بھیجا کہ تم اپنی فوج لے کر اس پار آ ؤ یا ہم اس پار آئیں۔ ابوعبیدہ ثقفی شجاعت کے جوش اور شہادت کے نشے میں سرشار تھے اُن سے غلطی یہ ہوئی کہ انھوں نے سپاہیوں کو کشتیوں کا پل بنا کر پار ہونے کا حکم دے دیا اور سمجھے کہ ایسا نہ کرنا پست ہمتی اور بزدلی کی دلیل ہے۔ اس سے مسلمانوں کی ہتک اور

سبکی ہو گی۔

اگرچہ مثنیٰ بن حارثہ شیبانی، سلیط اور دوسرے بڑے سرداران لشکران کے اس حکم کے خلاف تھے۔ لیکن امیر کی اطاعت ان پر فرض تھی، اس لیے حکم کی تعمیل کرنے پر مجبور تھے۔ مگر ہوا وہی جس کا انھیں پہلے سے اندیشہ تھا۔ ایک تو اس پار کا میدان بہت ہی تنگ تھا اور مسلمان اپنی فوج کو اچھی طرح سے ترتیب نہ دے سکتے تھے۔ دوسرے اس مرتبہ ایرانیوں کے ہمراہ کوہ پیکر ہاتھی بھی تھے جن کے گلے میں بڑے بڑے گھنٹے لٹکے ہوئے زور زور شور سے بجتے جاتے تھے اور یہ مہیب اور خطرناک جانور ایرانی فوج کے آگے مسلمانوں کا راستہ روکے ہوئے تھے۔

عرب کے مسلمانوں پر اگرچہ ان کا کچھ اثر نہ ہوا لیکن اُن کے گھوڑوں کے لیے یہ نظارہ چونکہ بالکل نیا تھا اس لیے وہ بدک کر پیچھے ہٹنے لگے یہ دیکھ کر حضرت ابوعبیدہ ثقفی نے مجاہدین کو للکارا اور کہا کہ سب سے پہلے ان ہاتھیوں پر حملہ کرو اور ہودوں کو سواروں سمیت الٹ دو اور یہ کہہ کر وہ خود بھی ایک ہاتھی پر حملہ آور ہوئے، جو ڈیل ڈول کے اعتبار سے سب میں بڑا تھا اور فیل سفید کہلاتا تھا۔ ابھی حضرت ابوعبیدہ ثقفی تلوار لے کر آگے بڑھے ہی تھے کہ ہاتھی نے انھیں اپنی سونڈ میں لپیٹ لیا اور پکڑ کر نیچے گرا دیا۔ پھر اپنے پاؤں سے کچل دیا۔ حضرت ابوعبیدہ ثقفی کی شہادت کے بعد پھر اسی طرح سات مجاہد اور آگے بڑھے اور شہید ہوئے۔

بڑے بڑے نامور افسروں کی شہادت کے بعد اسلامی فوج میں بھی کچھ

بھگدڑ مچ گئی۔ قریب تھا کہ ساری فوج تباہ و برباد ہو جاتی کہ حضرت مثنیٰ بن حارثہ شیبانی نے کمال شجاعت سے آگے بڑھ کر اسلامی فوج کا جھنڈا خود اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس دوران میں ایک غضب یہ ہوا کہ کسی مجاہد نے غلطی سے دریا کا پُل کاٹ دیا تاکہ میدانِ جنگ سے کسی کو بھاگنے کا موقع نہ مل سکے۔ آخر کار راہ نہ پا کر بہت سے آدمی دریا میں کود پڑے اور ایسے نازک موقع پر حضرت مثنیٰ بن حارثہ شیبانی نے اپنی جس عدیم المثال حکمت عملی اور تدبیر کا ثبوت دیا وہ یہ تھی کہ انھوں نے بچی کھچی فوج کو اکٹھا کر کے دشمن کی پیش قدمی کو روک رکھا اور تھوڑے سے سپاہیوں کو بھیج کر ٹوٹے ہوئے پُل کی مرمت کرادی۔ اور شکست خوردہ فوج کو دریا کے اُس پار اتار دیا۔ لیکن حضرت مثنیٰ بن حارثہ شیبانی کی اس تدبیر و احتیاط کے باوجود جب اسلامی فوج کا شمار کیا گیا تو نو ہزار میں سے فقط تین ہزار ہی رہ گئی تھی۔

مدینۃ النبی میں اس شکست کی اطلاع کے پہنچتے ہی ایک کہرام برپا ہو گیا۔ جو لوگ اس جنگ میں جان بچا کر بھاگے تھے وہ لوگوں سے منہ چھپاتے پھرتے تھے شرم کے مارے لوگوں کے سامنے نہیں آتے تھے اور نہ اپنے گھروں میں جاتے تھے بلکہ اِدھر اُدھر جنگلوں میں خاک بسر مارے مارے چھپتے پھرتے اور اپنی بد قسمتی پر آٹھ آٹھ آنسو بہاتے تھے۔ حضرت عمر فاروق کو اس جنگ کی شکست سے دلی صدمہ پہنچا اور انھوں نے اس کی تلافی کے لیے اب ایک وسیع پیمانے پر جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ملک کے تمام اطراف و جوانب سے فوجیں اکٹھی کی گئیں۔ مختلف قبیلے اپنے اپنے گروہوں کے ساتھ شہادت

کے نشے میں شرسار ہو کر مدینے پہنچے۔ اس کے علاوہ عرب کے عیسائی قبیلے میں تغلب کے سردار بھی اپنی فوج لے کر آئے اور کہا کہ آج عرب و عجم کا مقابلہ ہے اور بحیثیت ایک عرب قوم ہونے کے آج ہم بھی عرب کے مسلمانوں کے ساتھ ہیں۔ علاوہ ازیں حضرت مثنیٰ بن حارثہ شیبانی نے بھی شام کے سرحدی علاقوں میں نقیب اور قاصد بھیج کر اچھی خاصی فوج تیار کر لی۔

کوفے کے قریب "بویب" کے مقام پر اسلامی فوجیں خیمہ زن ہوئیں۔ اِدھر ایرانی فوجوں کا نیا سپہ سالار مہران بن مہرویہ ہمدانی بھی اپنی فوجیں لے کر آ گیا۔ حضرت مثنیٰ بن حارثہ شیبانی نے کمال دانائی اور نہایت ہشیاری کے ساتھ لشکر اسلام کو ترتیب دیا اور اس کی صفیں درست کیں۔ علاوہ ازیں اس کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے ہر ایک حصے پر ایک تجربے کار اور آزمودہ افسر کو مقرر کیا۔ نیز میمنہ پر مزعور، میسرہ پر نسیر اور پیدل فوج پر مسعود کو متعین کیا۔ پھر جب لشکر اسلام کی ساری صفیں درست ہو گئیں اور وہ مرتب ہو گیا تو ساری فوج میں ایک مرتبہ چکر لگایا اور ہر شخص کے پاس جا کر اسے ہمت دلائی اور کہا دیکھنا تمھارے سبب سارے عرب پر دھبہ نہ لگنے پائے۔

اب لڑائی شروع ہو چکی تھی۔ دونوں طرف کے بہادر دادِ شجاعت دے رہے تھے کہ یکایک حضرت مثنیٰ بن حارثہ شیبانی نے اپنے دستے کے سپاہیوں کو لے کر ایسا زور کا حملہ کیا کہ ایرانی تڑپ تڑپ کر پیچھے ہٹنے لگے۔ لیکن پھر جلد ہی سنبھل گئے اور اس مرتبہ انھوں نے بھی کچھ اتنے زور شور سے حملہ کیا کہ مسلمانوں میں ابتری پھیل گئی۔ مگر عین وقت پر حضرت مثنیٰ بن حارثہ شیبانی کے للکارنے

سے کہ اے مسلمانو! کدھر جاتے ہو دیکھیں! دھر ہوں مسلمانوں میں غضب کا جوش پیدا ہوا اور وہ پلٹ پڑے۔ اسی دوران حضرت مثنیٰ بن حارثہ کے بھائی حضرت مسعودؓ بن حارثہ جو بڑے بہادر، جری اور دلیر تھے زخموں سے چور چور ہو کر گرے۔ انھیں گرتے ہوئے دیکھ کر حضرت مثنیٰ بن حارثہ نے مسلمانوں کو پھر للکارا اور کہا اے مسلمانو! اگر میرا بھائی مارا گیا تو کچھ غم نہیں۔ شریف لوگ اسی طرح جان دیا کرتے ہیں۔ دیکھو اسلامی فوج کا جھنڈا نہ جھکنے پائے۔ خود حضرت مسعود بن حارثہؓ نے بھی آخر وقت تک اپنے دستے کو یہی ہدایت کی کہ تمھیں بے دل نہ ہونا چاہیے جنگ جاری رکھو۔

گھمسان کی لڑائی جاری رہی۔ دونوں طرف کے بڑے بڑے بہادر سپوت افسر اور بے شمار سپاہی مارے گئے۔ لیکن حضرت مثنیٰ بن حارثہؓ شیبانی کی بے مثال قیادت کی بدولت میدان جنگ میں مسلمانوں کا پلّہ بھاری رہا۔ اسی دوران ایرانیوں کا ایک مشہور افسر شہر براز مسلمانوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی تھوڑی دیر بعد ایرانی فوج کا سپہ سالار مہران بھی قتل ہو گیا۔ اب ان دو افسروں کے مارے جانے سے ایرانیوں کی کمر ٹوٹ گئی اور وہ بدحواس ہو کر بھاگنے لگے، مگر حضرت مثنیٰ بن حارثہ شیبانی نے پُل کا راستہ روکے رکھا جس سے ایرانی فوج بھاگنے کی راہ نہ پا کر مجبوراً مرنے مارنے پر آمادہ ہو گئی۔

مختصراً یہ کہ بے شمار ایرانی سپاہی مارے گئے یہاں تک کہ اُن کی لاشوں سے میدانِ جنگ پٹ گیا۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ ایرانیوں نے کسی دوسری لڑائی میں اس قدر بے شمار لاشیں نہیں چھوڑیں کہ جس قدر جنگ بویب میں چھوڑیں۔ اس جنگ میں مسلمانوں کو جو کامیابی نصیب ہوئی اُس نے بہت ہی خوشگوار اثرات

پیدا کیے اور اب مسلمانوں کو مکمل یقین آ گیا کہ شہنشاہِ ایران کسریٰ کوئی دن کا مہمان ہے۔ خود حضرت مثنیٰ بن حارثہ شیبانی کہتے ہیں کہ اسلام قبول کرنے سے پہلے مجھے اہل عجم سے لڑنے کے کئی موقعے ملے ہیں۔ اُس وقت ایک سو عجمی ایک ہزار عربوں پر بھاری تھے۔ لیکن آج اسلام کی روحانی طاقت کی بدولت ایک عرب مسلمان دس عجمیوں پر بھاری ہے۔

جنگ بویب کی شکست کے بعد اب ایرانیوں نے پوران دخت کو بحیثیت عورت کے ایک کمزور حکمران خیال کر کے تخت سے اُتار دیا اور اس کی جگہ ایران کے جائز وارث ایک سولہ سالہ لڑکے یزدجرد کو تخت نشین کر دیا۔ رستم اور فیروز جو ایران کی سلطنت کے دست و بازو تھے اور آپس میں ایک دوسرے سے لڑتے رہتے تھے۔ اہل ایران کے سر پر منڈلاتے ہوئے خطرے کو دیکھ کر دونوں ایک ہو گئے اور آپس میں ایکا کر کے مسلمانوں سے لڑنے کی ایک مرتبہ پھر ٹھان لی۔ چنانچہ ان کی طرف سے تمام عراق میں نقیب اور قاصد بھیجے گئے تاکہ لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف اُبھاریں اور اُن سے لڑنے پر اُکسائیں۔ آخر کار اللہ کو ایک ماننے اور اسلام کے آخری نبی و رسول کی رسالت پر ایمان لانے والوں یعنی مسلمانوں کے خلاف۔ بجائے ایک خدا کے تین خداؤں کو ماننے والوں اور حضرت عیسیٰ کو بجائے رسولِ خدا کے فرزند خدا کہنے والے ان عیسائیوں کی کوششیں کامیاب ہو گئیں جن کے نتیجے میں عراق کے تمام مفتوحہ علاقے مسلمانوں کے ہاتھ سے ایک مرتبہ پھر نکل گئے۔ ان حالات کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت عمر فاروق نے حضرت مثنیٰ بن حارثہ کو لکھا کہ وہ تمام اسلامی فوج ہر طرف سے اکٹھا کر کے عرب کی سرحد کے پاس لے آئیں۔ پھر اس کے بعد حضرت عمر فاروق نے بڑے انہماک اور توجہ سے لڑائی کی

تیاریاں شروع کردیں۔

اس مرتبہ حضرت عمر فاروق نے لشکر کو خود ترتیب دیا اور اس کی صفوں کو درست کیا اور اعلان کیا کہ وہ خود اس فوج کے سپہ سالار بن کر میدان جنگ میں لڑنے جائیں گے چنانچہ لشکر لے کر چل پڑے اور مدینے سے تین میل دور ایک گاؤں ضرار میں آکر ٹھہر گئے۔ سبب یہ تھا کہ بڑے بڑے صحابہ اس بات کے خلاف تھے کہ حضرت عمر فاروق رض کے مدینے میں نہ ہونے سے اسلام اور مسلمانوں کا مستقبل سخت خطرے میں پڑ جائے گا۔ چنانچہ متفقہ طور پر یہ طے پایا کہ بجائے عمر فاروق رض کے حضرت سعد بن وقاص سپہ سالار بنیں۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے اس رائے کی پُرزور تائید کی۔ نیز تمام مسلمانوں نے بھی حضرت سعد بن وقاص کے انتخاب کو پسند کیا۔

الغرض حضرت سعد بن وقاص لشکر اسلام کو لے کر ایران کی مہم پر چل دیے اور ثعلبہ کے مقام پر پہنچ کر حضرت عمر فاروق کی خدمت میں اُن کی ہدایات کے مطابق راستے کے نقشے بھیج دیے اور اُنھوں نے نقشوں کو دیکھ کر فوج کی تنظیم اور پیش قدمی کے بارے میں مختلف ہدایات بھیجیں۔ ہر چند سعد بن ابی وقاص اسلامی فوج کے سپہ سالار تھے۔ تاہم حفظِ ماتقدم کے طور پر اسلامی فوج کی نقل و حرکت اُس کی ترتیب و تنظیم اور مورچہ بندی وغیرہ حضرت عمر فاروق نے اپنے ہاتھ میں رکھی۔ پھر جب سعد بن وقاص مقام ثعلبہ سے اُٹھ کر اشراف پہنچے تو حضرت عمر فاروق نے انھیں حکم بھیجا کہ قادسیہ کے مقام پر جا کر قیام کرو۔ اور وہاں اس طرح مورچہ بندی کرو کہ سامنے عجم کی زمین اور پشت پر عرب کے پہاڑ ہوں۔ فتح کی صورت میں آگے

بڑھتے جاؤ۔ بصورت دیگر پہاڑوں میں پناہ لے سکو۔

قادسیہ پہنچ کر حضرت سعد بن وقاص نے دشمن کی نقل و حرکت اور اُس کی جنگی تیاریاں معلوم کرنے کے لیے ہر طرف مخبروں کو دوڑایا جن سے پتہ چلا کہ اس مرتبہ ایرانیوں کا سپہ سالار مملکت ایران کا وزیر جنگ رستم مقرر ہوا ہے اور وہ اپنی فوجوں کو لے کر ساباط میں خیمے ڈالے پڑا ہے۔ حضرت سعد بن وقاص نے اب آگے قدم بڑھانے کے لیے حضرت عمر فاروق سے اجازت مانگی۔ انھوں نے فرمایا۔ اس سے پہلے کہ جنگ کا آغاز ہو اسلامی سفیروں کو ایرانی دربار میں اسلام کا دعوت نامہ دے کر بھیجا جائے۔ چنانچہ حکم کی تعمیل ہوئی اور حضرت سعد بن وقاص نے چند مسلمانوں کو شہنشاہ ایران یزدجرد کے دربار میں بھیج دیا۔

اسلامی سفیروں سے یزدجرد کی گفتگو ہوئی اُس نے کہا تم لوگ یہاں کس لیے آئے ہو وہ بولے اسلام کی دعوت لے کر بصورت دیگر ہم تمھارے سامنے دو چیزیں رکھتے ہیں۔ جزیہ یا تلوار۔ یزدجرد غضب ناک ہو کر بولا۔ ہمارے سامنے تمھاری یہ جرأت۔ کیا تمھیں وہ دن یاد نہیں جب تم سے زیادہ دنیا میں کوئی ذلیل اور بدبخت قوم نہ تھی۔ تم جب کبھی سرکشی اختیار کرتے ہم اپنے گماشتوں کو بھیجتے اور وہ تمھارے کس بل نکال دیتے تھے۔ مغیرہ بن زرہ نے جواب میں کہا واقعی تم سچ کہتے ہو۔ ہم ایسے ہی تھے۔ لیکن خدا نے ہم پر احسان کیا اور ہم میں ایک پیغمبر بھیجا۔ پہلے تو اس کی ہم نے مخالفت کی۔ لیکن جب رفتہ رفتہ اُس کی باتیں ہمارے دل کی گہرائیوں میں اتر گئیں اور ہم اسلام لے آئے۔ تو اُس نے ہمیں حکم دیا کہ اسلام کے دین کو ساری دنیا میں پھیلاؤ۔ یہ ساری دنیا کی بھلائی کے لیے ہے۔ جو لوگ

اسلام قبول کرلیں وہ تمہارے بھائی ہیں اور تمہارے حقوق میں تمہارے برابر ہیں اور جو لوگ اس سے انکار کریں لیکن جزیہ دینے میں تامل نہ کریں انھیں اسلام کی حمایت میں لے لو اور جو لوگ اس سے بھی انکار کریں اُن کے لیے تلوار ہے۔
یزدجرد یہ سُن کر غصّے میں آگ بگولا ہو گیا اور بولا۔ اگر قاصدوں کا قتل کرنا روا ہوتا تو آج تم میں سے ایک بھی مسلمان زندہ بچ کر نہ جاتا۔ پھر اس نے کہا تم میں سے معزز کون ہے۔ مسلمانوں نے حضرت عاصم بن عمرو کو سامنے کیا۔ یزدجرد کے ملازموں نے اس کے حکم سے مٹی کا ایک تھیلا اُن کے سر پر رکھ دیا۔ اور کہا لو ہماری زمین میں تمہارا یہ حصّہ ہے۔

حضرت عاصم بن عمرو (یا بقول بعضوں کے عمرو بن معدی کرب) یہ مٹی دامن میں لے کر خوشی خوشی لوٹ آئے اور آتے ہی مسلمانوں سے کہا کہ لو دشمن نے اپنی سرزمین آپ سے آپ ہمارے حوالے کر دی۔ اس واقعے کے تین مہینے تک پھر دونوں طرف مکمل خاموشی رہی۔ مسلمان چاہتے تھے کہ ایرانی پہل کریں لیکن رستم کو مسلمانوں کا پُورا تجربہ ہو چکا تھا اس لیے وہ یزدجرد کی تاکید کے باوجود پیشقدمی کرنے میں پس وپیش کر رہا تھا اور جنگ سے بچنے کے حیلے بہانے ڈھونڈ رہا تھا۔ اسی دوران مسلمانوں نے اسلام کے دشمنوں کے ایک گاؤں پر حملہ کر کے مویشیوں کو رسد کے لیے لُوٹ لیا۔ جب کافروں نے رستم کی دہائی دینی شروع کی تو وہ چار و ناچار ساباط سے اُٹھ کر قادسیہ چلا آیا اور یہیں ڈیرے ڈال دیے۔

حضرت سعد بن وقاص نے سراغ رسانوں کے ذریعے کچھ ایسا معقول انتظام کیا ہُوا تھا کہ انھیں ایرانی فوج کی نقل وحرکت۔ اس کی تعداد اور ترتیب و

تنظیم کی لمحہ بہ لمحہ خبریں ملتی رہتی تھیں اور کچھ ایسے افسر بھی مقرر کیے ہوئے تھے جو مخبروں اور سراغ رسانوں کی حفاظت کرتے اور بعض اوقات ان کی ایرانیوں سے جھڑپ بھی ہو جاتی تھی، جس سے ایک چھوٹی موٹی لڑائی کا نقشہ قائم ہو جاتا۔

ایک مرتبہ حضرت طلحہ رات کے وقت بھیس بدل کر ایرانیوں کے لشکر میں جا گھسے اور وہاں سے نعمان بندھا ہوا ایک گھوڑا اپنے گھوڑے کی باگ میں باندھ کر اڑا لائے۔ ابھی کچھ ہی دور گئے تھے کہ گھوڑے کے مالک کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے دو ایرانی سپاہیوں کو ساتھ لے کر اُن کا پیچھا کیا۔ حضرت طلحہ نے دو آدمیوں کو تو موت کے گھاٹ اُتار دیا اور تیسرے آدمی کو ساتھ لے کر لشکرِ اسلامی میں واپس آ گئے، جہاں قیدی نے مسلمانوں کی کریمانہ صفات دیکھ کر اپنی رضا و رغبت سے اسلام قبول کر لیا اور مسلمانوں کو ایرانیوں کے بارے میں بہت سی معلومات بھی بہم پہنچائیں۔ اور اُس نے یہ بھی بتایا کہ گھوڑے کا مالک ایرانیوں میں بہت بڑا سورما اور معزز افسر خیال کیا جاتا تھا۔

رستم ان تمام باتوں کے باوجود جنگ کو ٹالنے کی برابر کوشش کرتا رہا۔ اسی سلسلے میں اُس نے ایک مرتبہ مسلمانوں سے خود بھی صلح کی بات چیت کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس کے آراستہ و پیراستہ دربار میں اسی کی درخواست پر حضرت سعد بن وقاص نے چند مسلمانوں کے ساتھ حضرت مغیرہ بن شعبہ کو (یا بقول بعضوں کے ربعی بن عامر کو) اسلامی نمائندہ بنا کر بھیجا۔ یہ بزرگ جس شکل و صورت میں رستم کے پاس گئے اس کا بیان کرنا اس اعتبار

سے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ رستم نے مسلمانوں کو مرعوب کرنے کے لیے اپنے دربار کو بڑے ٹھاٹھ سے آراستہ کیا تھا۔ اس کے برعکس اسلامی نمائندے کی تلوار بھی قرینے کی نہ تھی۔ نیام کی بجائے اوپر چیتھڑے لپٹے ہوئے تھے۔ کمر میں رسی کا پٹکا بندھا تھا۔ عرق گیر کی زرہ بنائی ہوئی تھی اور اسی کا ایک ٹکڑا سر سے لپیٹ رکھا تھا۔ غرض اس شان سے وہ رستم کے تخت کی طرف بڑھے اور ایک بے خوف مجاہد کی طرح آن پر جا کر اس کے آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ درباریوں نے اُن کے اس بے تکلفانہ طرزِ عمل کو سخت ناپسند کیا اور چوبداروں کو حکم دیا کہ وہ انھیں بازو سے گھسیٹ کر تخت سے اُتار دیں۔ لیکن اُن میں سے کسی میں بھی اتنی ہمت پیدا نہ ہو سکی۔

آخر میں رستم نے ایرانیوں کی قوت اور شان و شوکت کا ذکر کرتے ہوئے انھیں لالچ دیا کہ تم لوگ شاید معاش کی تنگی کے باعث جنگ کے لیے نکلے ہو۔ اگر یہی بات ہے تو ہمیں کچھ ملال نہیں تم یہیں سے لوٹ جاؤ ہم اس کے بدلے میں تمھیں اتنا دیں گے کہ تمھارا پیٹ بھر جائے گا اور تمھاری کوئی ضرورت ادھوری نہیں رہے گی۔ انھوں نے جواب میں تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا۔ بے شک ہم بھوکے تھے لیکن خدا نے ہم میں ایک پیغمبر بھیجا جس کی پیروی کرنے سے ہماری بدحالی اور بدبختی خدا نے خوشحالی اور خوش بختی میں بدل دی۔ رسولؐ خدا نے ہمیں اسلام کے دشمنوں سے جہاد کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس لیے ہم تمھیں خدائے واحد کی عبادت کرنے اور حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پر ایمان لانے کی دعوت دیتے ہیں اور اگر یہ منظور نہیں تو جزیہ دو اور اگر یہ بھی ناگوارِ خاطر ہو تو سن لو اب تمھارا ہمارا فیصلہ تلوار ہی سے ہو گا۔ رستم یہ بات سن کر جوشِ غضب سے چلا اُٹھا۔

اور کہنے لگا۔ آفتاب و ماہتاب کی قسم، کل صبح ہونے سے پہلے پہلے تم سب لوگوں کو مٹی میں ملادوں گا۔ مسلمان رستم کے یہ کلمات کفر سن کر لاحول ولاقوۃ الا باللہ کہتے ہوئے واپس آ گئے اور اب آ کر جنگ کی تیاریاں کرنے لگے۔

رستم نے راتوں رات ایرانی فوجوں کو مرتب کیا اور طلوع آفتاب سے پہلے پہلے قادسیہ کے میدان میں ڈیرے ڈال دیے۔ فوجیں کیا تھیں ایرانی بہادروں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ مسلمانوں کا لشکر بھی جو پہلے ہی سے تیار تھا۔ میدان قادسیہ میں صف آرا ہوا۔ مگر عین اُس وقت جب لڑائی کا آغاز ہوا چاہتا تھا۔ حضرت سعد بن وقاص ایسے بیمار پڑ گئے کہ نقل و حرکت کرنے سے مجبور ہو گئے۔ ناچار انھوں نے حضرت خالد بن عرفطہ کو سپہ سالار مقرر کیا اور خود میدان جنگ کے قریب ہی ایک مقام پر پہنچ کر جہاں سے انھیں جنگ کا پورا نقشہ نظر آتا تھا۔ لشکر اسلام کو مناسب احکام اور ہدایات بھیجتے رہے۔ بڑی خونریز لڑائی ہوئی، جو طلوع آفتاب تک برابر جاری رہی۔ حتیٰ کہ رات کی تاریکی پھیل گئی اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیا۔ مجبوراً جنگ روک دی گئی۔ یہ لڑائی یوم الارماث کے نام سے مشہور ہے۔

اسلامی فوج کا ہمیشہ سے یہ دستور تھا کہ سردار فوج تین مرتبہ نعرۂ تکبیر بلند کرتا تھا۔ پہلی تکبیر پر مسلمان اپنے ہتھیار وغیرہ سنبھال لیتے۔ دوسری تکبیر پر ہتھیار تول لیتے اور تیسری تکبیر سنتے ہی دشمن پر حملہ آور ہو جاتے تھے۔ چنانچہ دوسرے دن پھر مقابلہ کے لیے صف آرائی ہوئی اور تیسری تکبیر سنتے ہی مسلمانوں نے ایرانیوں پر دھاوا بول دیا۔ آج پہلے دن سے بھی زیادہ گھمسان کا رن پڑا۔ صبح سے شام تک

خوں ریز جنگ ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ رات کی تاریکی بڑھنے لگی اور جنگ دوسرے دن پر پھر ملتوی ہو گئی۔

پہلے دن کی لڑائی میں ایک واقعہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ لڑائی کے آغاز پر سب سے پہلے ایک ایرانی سوار سر سے پیر تک لوہے کے خود میں ملبوس ہو کر میدانِ جنگ میں آیا اور اپنا مدِ مقابل طلب کیا۔ لشکرِ اسلام سے حضرت عمرو بن معدی کرب زبیدی اُس کے مقابلے میں نکلے اور اُنہوں نے تھوڑی ہی کشمکش کے بعد اُس کے کمر بند میں ہاتھ ڈال کر اُسے معلق اُٹھا لیا اور زمین پر دے مارا۔ پھر اس کی گردن تلوار سے اُڑا کر اسلامی فوج سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ دیکھو ایسے لڑا کرتے ہیں۔ اس پر مسلمانوں نے یک آواز ہو کر کہا۔ بھلا ہر شخص معدی بن کرب کیونکر ہو سکتا ہے۔

دوسرے دن کی لڑائی جو معرکہ اغواث کے نام سے مشہور ہے اس میں خاص بات یہ ہوئی کہ جب حضرت قعقاع نے معمول کے مطابق میدانِ جنگ میں آکر ایرانیوں کو للکارا اور کہا کہ اگر تم میں کوئی بہادر ہے تو میرے سامنے آئے اس پر ایرانی فوج سے مشہور سپہ سالار بہمن جادویہ اُن کی دعوت قبول کرتے ہوئے میدان میں آیا۔ حضرت نے اُسے دیکھتے ہی کہا ہاں! بہمن، ابوعبیدہ ثقفی کا قاتل دیکھنا۔ ابوعبیدہ کا قاتل بچ کر نہ جانے پائے۔ اور یہ کہتے ہی اُس پر حملہ کیا اور قتل کر ڈالا۔

اس جنگ کا ایک خاص واقعہ اور ہے جو بیان کے لائق ہے۔ ابو محجن ثقفی ایک مشہور بہادر جو شاعر بھی تھے شراب کے ایک جرم میں قید کر دیے

گئے۔ اور حضرت سعد بن وقاص نے اپنی بیوی سلمیٰ کو ان پر نگران مقرر کیا۔ ان کے پیر میں زنجیریں پڑی ہوئی تھیں اور جنگ کا منظاہرہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ جب ایرانیوں کی ٹڈی دل فوج کی یلغار سے بعض اوقات مسلمانوں کے قدم اُکھڑنے لگتے تو ابو محجن شجاعت کے جوش میں جذبۂ غیرت کے ساتھ پیچ و تاب کھانے لگتے۔ حتیٰ کہ اُن سے نہ رہا گیا۔ آخر کار اُنھوں نے حضرت سلمیٰ سے درخواست کی کہ مجھ سے اب جنگ کا منظر نہیں دیکھا جاتا۔ میری زنجیریں کاٹ دی جائیں۔ میں بھی اسلامی فوج میں شامل ہو کر ایرانیوں سے لڑوں گا۔ اگر بچ کر واپس آ گیا تو وعدہ کرتا ہوں کہ میں خود آ کر بیڑیاں پاؤں میں ڈال لوں گا۔ اصرار کچھ اتنا بلیغ تھا کہ حضرت سلمیٰ کو اُن کی بات ماننی ہی پڑی۔ اس کے بعد ابو محجن مردانہ وار دشمنوں کی صف میں گھس گئے اور کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ ہر شخص حیران تھا کہ یہ کون بہادر ہے۔ رات کو لڑائی بند ہوئی تو ابو محجن نے آ کر خود اپنے پاؤں میں زنجیریں ڈال لیں۔

حضرت سعد بن ابی وقاص کو جب اس واقعہ کا پتہ چلا تو انھوں نے ابو محجن کو رہا کر دیا اور کہا کہ خدا کی قسم اُس شخص کو میں سزا نہیں دے سکتا جو اسلام اور مسلمانوں پر اس طرح نثار ہو۔ دراصل بعد میں آنے والے بعض نا اہل مورخوں نے تحقیق کئے بغیر صرف ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی یہ لکھا ہے کہ ابو محجن شراب پینے کے جرم میں گرفتار ہوئے حالانکہ واقعہ یہ نہیں۔ اصل قصہ یہ تھا کہ ابو محجن نے اپنے اشعار میں شراب کے بارے میں کچھ ایسا قلبی تعلق ظاہر کیا جس سے شراب کی ممانعت کے خلاف بغاوت کا اظہار ہوتا تھا اور حضرت سعد بن وقاص اسے جرم گردانتے

ہوئے اُنھیں قید کر دیا۔

ابو محجن نے شراب کے سلسلے میں جو اشعار کہے تھے اُن کا ترجمہ یہ ہے۔
جب میں مر جاؤں تو مجھے شاخ انگور کی جڑ میں دفن کریں، تاکہ مرنے کے بعد میری ہڈیاں بھی نشۂ مے سے سرشار ہوتی رہیں اور ہاں مجھے کسی چٹیل میدان میں نہ گاڑنا کہ پھر دختِ رز سے مجھے ملنا ہی نصیب نہ ہو۔

درحقیقت ابو محجن نے شراب وغیرہ نہیں پی تھی۔ بلکہ اُسے جاہلیت کے ایام کی بادہ خواری کا دور یاد آگیا تھا جسے اس نے اشعار میں بیان کر دیا اور حضرت سعد بن وقاص نے تنبیہ کے طور پر قید کر دیا تاکہ آئندہ اس قسم کے اشعار ایسے نازک مواقع پر نہ کہے جائیں جہاں نوائے چنگ کی بجائے نوائے جنگ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک واقعہ ایک شاعرہ کا بھی ہے جو اپنے چار بیٹوں کے ساتھ اس جنگ میں شریک تھی۔ اُس نے اپنے بیٹوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ اے پیارے بیٹو! تم اپنے ملک پر بھاری نہ تھے اور نہ قحط میں مبتلا ہوئے۔ اس کے باوجود تم اپنی بوڑھی ماں کو یہاں لائے اور ماں نے اپنے بیٹے ایرانیوں کے سامنے ڈال دیے۔ میرے بیٹو! خدا کی قسم جس طرح تم ایک ماں سے ہو اسی طرح ایک باپ کے بھی ہو۔ میں نے تمھارے باپ سے خیانت نہیں کی اور نہ تمھارے ماموں کو رسوا کیا۔ جاؤ اور جب تک تمھارے دم میں دم ہے اسلام کے دشمنوں سے لڑتے رہو۔ بیٹوں نے یہ سن کر ایک ساتھ ایرانیوں پر حملہ کیا اور جب وہ اپنی ماں کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو ماں نے ہاتھ اُٹھا کر

کہا، خداوندا! میرے بیٹوں کو محفوظ رکھنا۔ اس جنگ میں دو ہزار مسلمانوں نے جامِ شہادت نوش کیا اور دس ہزار ایرانی قتل ہوئے۔

رات گزرنے کے بعد تیسرے دن پھر معرکہ شروع ہوا۔ گذشتہ دونوں معرکوں سے یہ تیسرا معرکہ زیادہ ہولناک ثابت ہوا۔ حضرت قعقاع بن عمرو نے اس لڑائی میں پہلے سے یہ تدبیر کی ہوئی تھی کہ فوج کے کچھ دستے رات کی تاریکی میں شام کی طرف نکال کے انھیں حکم دیا کہ سَو سَو کی تعداد میں صبح سویرے ایک ایک کر کے میدانِ جنگ میں پہنچتے رہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب مسلمانوں کا پہلا دستہ نعرۂ تکبیر کہتا ہوا میدان جنگ میں پہنچا تو ایرانی سمجھے کہ مسلمانوں کو مزید کمک پہنچ گئی ہے۔ اس کے بعد پھر حضرت ہشام کی سپہ سالاری میں سات سو سواروں کا ایک دستہ اور پہنچ گیا جسے حضرت ابو عبیدہ ابن الجراح نے شام سے بھیجا تھا۔ حضرت ہشام نے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہا تمھارے بھائیوں نے شام کو فتح کر لیا ہے۔ ایران کی فتح کا جو وعدہ خدا نے تم سے کیا ہے وہ ضرور پورا ہو کر رہے گا۔

اس کے بعد جنگ شروع ہو گئی۔ معمول کے مطابق ایرانیوں کی طرف سے پہل ہوئی اور ان کی طرف سے سب سے پہلے ایک مضبوط ڈیل ڈول کا آدمی سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق ہو کر میدانِ جنگ میں آیا جو آتے ہی اتفاق سے ایک نحیف الجثہ مسلمان کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اب اس کے بعد عام لڑائی کا آغاز ہوا۔ مسلمانوں کو اس جنگ میں سب سے زیادہ دشواری اُن کوہ پیکر ہاتھیوں سے پیش آئی جو لوہے کی دیوار بن کر مسلمانوں کا راستہ روکے ہوتے

تھے۔ عربی گھوڑے انھیں دیکھ دیکھ بھڑکتے تھے۔ اگرچہ مسلمانوں نے گھوڑوں پر جھولیں ڈال کر اس مشکل کو آسان تو کر لیا تاہم دشواری پھر بھی قائم رہی۔ ہاتھیوں کی قطار جس طرف منہ اُٹھاتی صفوں کی صفیں درہم برہم ہو جاتی تھیں۔ یہ صورت دیکھ کر حضرت سعد بن وقاص نے مسلمانوں سے کہا کہ نیزے لے لے کر اُن پر ٹوٹ پڑیں اور تاک تاک کر اُن کی آنکھیں ضائع کر دیں۔ حضرت قعقاع نے ایک سفید ہاتھی پر ایسا وار کیا کہ سونڈ مستک سے الگ ہو گئی اور وہ جھرجھری لے کر بھاگا اور اسے دیکھ کر اُس کے پیچھے والے بھی سب کے سب نکل بھاگے۔ اور اس طرح یہ آہنی دیوار آپ سے آپ گر گئی اور مسلمانوں کو مقابلے کا کھلا موقع میسر آ گیا۔

مسلمانوں نے اب پوری قوت کے ساتھ ایرانیوں پر حملہ کیا، اور ایسی گھمسان کی لڑائی ہوئی کہ تلواروں کی کھچاکھچ، نعروں کی گونج اور گھوڑوں کی ہنہناہٹ کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ حتیٰ کہ بنو اسد، نخع، بجیلہ اور کندہ وغیرہ عرب قبائل کے مسلمانوں نے کشتوں کے پشتے لگا دیے۔ لیکن ایرانی پھر بھی ثابت قدم رہے۔ دن بھر میدان کارزار گرم رہا۔ رات کو بھی شدت سے لڑائی جاری رہی اور اس قدر طول پکڑا کہ دوسرے دن کہیں دوپہر میں جا کر فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوئی۔ ایرانی فوجوں کا سپہ سالار رستم لڑتے لڑتے زخموں سے چور ہو کر بھاگ نکلا اور ایک ندی میں کود کر موت کے منہ سے نکل بھاگنے کی کوشش کی لیکن ایک مسلمان نے پیچھا کر کے اُسے جا لیا اور قتل کر دیا۔

رستم کے قتل کے بعد ایرانیوں کی کمر ٹوٹ گئی۔ اور مسلمانوں کے ہاتھ اُن کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔ اس معرکے میں ایرانیوں کے پورے بیس ہزار آدمی قتل ہوئے۔ حضرت سعد بن وقاص نے فوراً فتح کی خوشخبری حضرت عمر فاروق کی خدمت میں بھجوائی۔ اس کے علاوہ انھیں ایرانیوں کے مقتولین اور مسلمانوں کے شہدا کی تعداد سے بھی آگاہ کیا۔

جب سے جنگ قادسیہ کا معرکہ شروع ہوا تھا۔ حضرت عمر فاروق کا یہ معمول بن گیا تھا کہ وہ روزانہ صبح کی نماز کے بعد شہر سے باہر کافی دُور نکل جاتے اور نہایت بے چینی سے قاصد کا انتظار کرتے۔ ایک روز معمول کے مطابق جب آپ نکلے تو دُور سے ایک شتر سوار کو آتے دیکھا۔ آپ بے تابانہ اُس کی طرف دوڑے اور قریب پہنچ کر حالات پوچھنے شروع کیے۔ شتر سوار سرسری طور پر بتاتا چلا جاتا تھا۔ اور آپ اس کی سواری کے ساتھ ساتھ دوڑتے چلے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ اسی حالت میں دونوں شہر میں داخل ہو گئے۔ یہاں پہنچ کر جب اُسے معلوم ہوا کہ یہی امیر المومنین حضرت عمر فاروق ہیں تو سخت سراسیمہ ہوا۔ حضرت عمر فاروق نے فرمایا۔ کچھ ہرج نہیں تم حالات بیان کرتے جاؤ۔ قاصد کی زبانی حالات سننے کے بعد آپ نے مسلمانوں کو مسجد نبوی میں اکٹھا کر کے حضرت سعد بن وقاص کا خط سنایا اور پھر ایک تقریر کی جس میں آپ نے فرمایا۔ اے مسلمانو! میں بادشاہ نہیں کہ تمھیں اپنا غلام بناؤں۔ میں تو خود خدا کا غلام ہوں۔ البتہ خلافت کا بارِ گراں میرے کندھوں پر ڈالا گیا ہے۔ اگر میں اس طرح تمھاری خدمت کر سکوں کہ تم

شکم سیر ہو کر اطمینان وسکون سے زندگی بسر کر سکو تو یہ میرے لیے عین سعادت ہے۔ اور اگر میں خواہش کروں کہ تم لوگ میرے دروازے پر حاضری دیا کرو تو یہ میری بدبختی ہوگی۔ اُس وقت مجھے خوشی کم اور غم زیادہ ہوگا۔

قادسیہ کی شکست کے بعد ایرانیوں نے بابل میں اکٹھے ہو کر انتقام لینے کے لیے پھر جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ حضرت سعد بن وقاص کو جب نئی صورتِ حال کا پتہ چلا تو وہ فوراً بابل روانہ ہو گئے۔ قادسیہ کی جنگ نے چونکہ ایرانیوں کی طاقت میں کافی کمی پیدا کر دی تھی اس لیے وہ حضرت سعد بن وقاص کے مقابلے میں اب جم کر نہ لڑ سکے۔ چنانچہ حضرت سعد بن وقاص انھیں جلد ہی شکست دے کر بابل، کوثی اور بہرہ شیر وغیرہ پر قبضہ کرتے ہوئے ایران کے پایۂ تخت مدائن جا پہنچے۔ بہرہ شیر اور مدائن کے درمیان دجلہ پڑتا تھا۔ ایرانیوں نے مسلمانوں کے حملے کو روکنے کے لیے دریائے دجلہ کا پل توڑ دیا اور کشتیاں روک دیں۔ حضرت سعد بن وقاص نے دریا پار کرنے کا جب کوئی سامان نہ پایا تو خدا کا نام لے کر دریائے دجلہ میں گھوڑا ڈال دیا۔ پھر ان کی دیکھا دیکھی تمام اسلامی فوج بھی دجلہ میں اُتر گئی۔ اور نہایت سکون واطمینان سے باتیں کرتی ہوئی پار پہنچ گئی۔ ایرانی دُور سے یہ نظارہ بڑی حیرت و استعجاب سے دیکھتے رہے۔ جب مسلمان اُن کے قریب پہنچ گئے تو دیوان آمدند، دیوان آمدند، دیو، آ گئے، دیو آ گئے کہتے ہوئے بھاگ نکلے۔ یزدجرد جس نے اپنے حرم اور شاہی خاندان کو پہلے ہی سے حلوان بھجوا دیا۔ اب وہ خود بھی حلوان چلا گیا اور شہر مدائن پر مسلمان قابض ہو گئے۔ بے شمار مالِ غنیمت، ہاتھ آیا۔ سونے چاندی اور زر و جواہرات کے ڈھیر لگ گئے

حضرت سعد بن وقاص نے مال غنیمت کو فوج میں تقسیم کرنے کے بعد اُس کا پانچواں حصّہ مدینے میں حضرت عمر فاروق کی خدمت میں بھجوا دیا۔

اب ایرانی مدائن سے بھاگ کر جلولا میں اکٹھے ہوگئے اور رستم کے بھائی فرزار کی سپہ سالاری میں ایک لشکر جرّار تیار کر کے مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی پھر تیاریاں شروع کر دیں۔ حضرت سعد بن وقاص نے ان کی تیاریوں کے بارے میں حضرت عمر فاروق کی خدمت میں پھر لکھا اور انھوں نے حکم دیا کہ ہاشم بن عتبہ کو بارہ ہزار مجاہدوں کی ایک فوج دے کر جلولا بھیج دیا جائے۔ چنانچہ حکم کی تعمیل ہوئی۔ حضرت ہاشم بن عتبہ نے محاذ پر پہنچتے ہی جنگ شروع کر دی گھمسان کا رن پڑا۔ حضرت قعقاع نے بھی اس لڑائی میں خوب دادِ شجاعت دی۔ آخر کار مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی اور بے شمار ایرانی مارے گئے۔

یزدجرد اُس وقت حلوان میں تھا۔ اُسے ایرانیوں کی شکست کا پتہ چلا تو حلوان چھوڑ کر رے کی طرف بھاگ نکلا۔ اس اثنا میں حضرت قعقاع حلوان پہنچ گئے اور انھوں نے خسرو شنوم کو شکست دے کر حلوان پر بھی قبضہ کر لیا۔ اور عام منادی کرا دی کہ جو شخص اسلام قبول کرے گا یا جزیہ ادا کرے گا اُس کی جان، مال اور عزّت و آبرو بالکل محفوظ رہے گی۔ اس اعلان پر بہت سے ایرانی امراء مسلمان ہو گئے۔ غرض اس جنگ کے بعد عراقِ عرب کی تمام لڑائیاں ختم ہو گئیں اور سرزمینِ عراق ساری کی ساری مسلمانوں کے قبضے میں آگئی اب عراقِ عرب کا کوئی علاقہ یا خطّہ ایسا نہیں رہا تھا جو مفتوح نہ ہو۔

ہر چند حضرت عمر فاروق عراق سے آگے قدم نہیں بڑھانا چاہتے تھے

وہ سمجھتے تھے کہ ایرانیوں میں اب اتنا دم خم نہیں رہا جو مسلمانوں کو پھر ستائیں اور اُن پر حملے کریں لیکن عراق کے ہاتھ سے نکل جانے کے باعث اب ایرانی چین سے نہیں بیٹھ سکتے تھے کیونکہ اُن کے لیے عراق کا ہاتھ سے چلے جانا ایک قومی مسئلہ بن گیا۔ چنانچہ پہلے صرف حکومت ایران کا مقابلہ تھا۔ اب ساری مملکت ایران مقابلے پر آ گئی   حضرت سعد بن وقاص نے سارے حالات حضرت عمر فاروق کی خدمت میں لکھ بھیجے جس کے جواب میں حضرت عمر فاروق نے مجبوراً یہ حکم دیا کہ عبداللہ بن غنم کو اس مہم پر بھیج دیا جاتے۔

چنانچہ ۱۶ھ میں حضرت عبداللہؓ بن غنم پانچ ہزار مجاہدوں کو لے کر تکریت پہنچے۔ جہاں ایرانیوں کی جنگ کے لیے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ حضرت عبداللہ بن غنم نے آتے ہی تکریت کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن جزیرہ کے عرب عیسائی بھی دشمنی کے ہمراہ تھے۔ اس لیے کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ حضرت عبداللہ بن غنم نے عرب عیسائیوں کے پاس خفیہ نامہ و پیام کر کے انھیں توڑ لیا اور اپنے ساتھ ملا لیا۔ پھر جب مسلمان حملہ آور ہوتے تو پشت کی طرف سے اُن عربوں نے بھی حملہ کیا اور ایرانی اُن دونوں کے درمیان میں آ کر بُری طرح پس گئے اور تکریت پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ اس کے بعد تھوڑے عرصے تک لڑائی رکی رہی۔ مگر جب ۱۷ھ میں حضرت عمر فاروق نے حضرت عیاض بن غنم کو مقرر کیا تو اُنھوں نے سارے جزیرے میں فوجیں پھیلا دیں۔ اور معمولی جنگوں کے بعد رقہ، حرّان، نصیبین، میافارقین سمساط، سروج اور قرقیسا وغیرہ علاقوں کو یکے بعد دیگرے فتح کر کے پورے جزیرے کو زیر نگیں کر لیا۔

اگرچہ اب سارا عراق مسلمان لے چکے تھے اور اس پر مکمل اور مستقل قبضہ رکھنے کے لیے یہاں حضرت عمر فاروق کے حکم سے بصرہ نام ایک فوجی چھاؤنی بھی قائم ہو گئی۔ تاہم ایران کی سرحدی پچوکی خوزستان ابھی تک ایرانیوں ہی کے پاس تھی اور فوجی نقطۂ نظر سے خوزستان پر قبضہ کرنا بصرے کی حفاظت کے لیے ضروری تھا۔ چنانچہ بصرے کے حاکم حضرت مغیرہ بن شعبہ نے اہواز پر حملہ کر کے یہاں کے حاکم ہرمز کو مطیع کیا، لیکن ہرمز تھوڑی مدّت کے بعد پھر باغی ہو گیا۔ اُس وقت حضرت ابوموسیٰ اشعری بصرے کے حاکم تھے۔ انھوں نے ہرمز کو شکست دے کر اہواز پر مستقل قبضہ کر لیا۔ پھر وہ سوس کی طرف بڑھے۔ پھر جب اُسے بھی فتح کر لیا تو رامہرمز کی طرف بڑھ گئے اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ کچھ عرصے کے بعد اُس کے حاکم نے آٹھ لاکھ سالانہ پر صلح کر لی۔ مگر جلد ہی وہ پھر باغی ہو گیا اور ایک عظیم الشان فوج اکٹھی کر کے پھر میدان جنگ میں آگیا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری فوج لے کر سوستر پہنچ گئے۔ ہرمزان نے بڑی بہادری سے اُن کے حملے کو روکا جس کے نتیجے میں بہت سے مسلمان شہید ہو گئے۔ تاہم آخر کار ہر طرح پسپا ہوا۔ اور قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا، جو کافی عرصے تک جاری رہا۔ اتفاق سے ایک روز شہر کا ایک باشندہ مل گیا جس کے ذریعے خفیہ طور پر شہر کے تمام راستے دیکھ لیے گئے۔ پھر تھوڑے سے مسلمانوں کو وہ اپنے ساتھ لے کر ایک تہ خانے کے ذریعے شہر میں داخل ہو گیا اور شہر پناہ کے دروازے کھول دیے اور مسلمان جو باہر انتظار میں کھڑے تھے۔ دروازے کھلتے ہی گھس پڑے۔ اب یہ دیکھ کر ہرمزان قلعہ میں جا کر چھپ گیا اور حضرت ابوموسیٰ

اشعری کے پاس کہلا بھیجا کہ اگر آپ مجھے حضرت عمر فاروق کے پاس بھجوا دیں اور مجھ سے کوئی تعرض نہ کریں تو میں اپنے آپ کو آپ کے حوالے کر سکتا ہوں۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری نے بخوشی منظور کر لیا غرض ہرمزان حضرت عمر فاروق کی حکومت میں پہنچ کر مسلمان ہو گیا اور حضرت عمر فاروق نے دو ہزار درہم سالانہ اُس کا وظیفہ مقرر کر دیا۔

ہرمزان کی رہائی کا واقعہ بہت دلچسپ ہے۔ بات یہ ہوئی کہ جب وہ گرفتار ہو کر مدینے میں حضرت عمر فاروق کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضرت عمر فاروق اُسے قتل کرنا چاہتے تھے مگر اس دوران ہرمزان کو ایک چال سوجھی اُس نے جھوٹ موٹ پیاسا بن کر پانی مانگا۔ پھر جب اُس کے سامنے پانی کا پیالہ آیا تو اُس نے منہ لگانے سے انکار کر دیا۔ اور کہا ڈر ہے کہ آپ مجھے پانی پینے کے دوران قتل کر دیں گے۔ حضرت عمر فاروق نے فرمایا، کچھ فکر نہ کرو۔ تم سے کوئی تعرض نہ ہو گا۔

اب ہرمزان نے حضرت عمر فاروق سے کہا امیرالمومنین! اب آپ مجھے امان دے چکے ہیں۔ لہٰذا قتل نہیں کر سکتے۔ حضرت عمر فاروق نے فرمایا نہیں تمھیں امان نہیں دی گئی۔ اس پر مسلمان بولے، امیرالمومنین! جب آپ نے یہ فرمایا تھا کہ تم کچھ فکر نہ کرو، تم سے کوئی تعرض نہ ہو گا۔ تو امان تو آپ نے اُسے اُسی وقت دے دی تھی۔ غرض ہرمزان کی چالبازی سے حضرت عمر فاروق اور مسلمان دونوں دھوکا کھا گئے۔

اسلام میں سب سے پہلی شے ایک غیر مسلم کی امان ہے۔ حتیٰ کہ

اگر کسی غیر مسلم شخص کو ایک ادنیٰ سا مسلمان سپاہی بھی امان دے دے تو اسلامی تعلیمات کے مطابق اُسے نبھانا لازم آجاتا ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ اگر کوئی مسلم غلام بھی کسی غیر مسلم حملہ آور گروہ یا فرد کو امان بخش دے تو اُس کی پابندی نہ صرف اکیلے اس پر بلکہ تمام اسلامی فوج اور صدر مملکت پر بھی عائد ہوتی ہے۔

المختصر حضرت ابوموسیٰ اشعری برابر آگے بڑھتے گئے حتیٰ کہ شوستر کے بعد جندی سابور وغیرہ کو فتح کرتے ہوئے خوزستان کا تمام علاقہ زیر نگیں کر لیا۔ اس کے بعد عراق عرب کا کوئی خطہ یا کوئی علاقہ ایسا نہیں رہا جو غیر مفتوح ہو۔ یزدجرد اُس وقت مرو میں تھا اور یہیں اُسے معلوم ہوا کہ اُس کا دست راست قوت بازو ہرمزان بھی گرفتار ہو گیا۔ اب خوزستان پر مسلمانوں کا قبضہ ہو جانے سے ایرانیوں کو سخت فکر پیدا ہوئی۔ وہ یزدجرد کے پاس گئے اور کہا کہ اگر مسلمانوں کا سیلاب یونہی آگے بڑھتا رہا تو ضرور اپنے زور سے تمام ایران کو بہا لے جائے گا۔ یزدجرد نے ایرانیوں کی چیخ پکار پر چھوٹے چھوٹے ماتحت حکمرانوں کو مدد کے لیے لکھا چنانچہ مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے یزدجرد کے پاس ڈیڑھ لاکھ فوج اکٹھی ہو گئی اور ایران کے مشہور سپہ سالار مردان شاہ نے اس کی قیادت کی۔

حضرت سعد بن وقاص نے پیش آمدہ حالات سے حضرت عمر فاروق کو مطلع کیا اور انھوں نے صحابہ سے مشورہ کر کے حضرت نعمان بن مقرن کو سپہ سالار بنا کر نہاوند روانہ کیا اور حضرت سعد وقاص کو اُن کے ماتحت

رہ کر کام کرنے کی ہدایت کی۔ نہاوند کے چند میل کے فاصلے پر مردان شاہ اپنی فوجیں لیے لڑنے کو پہلے سے موجود تھا مگر لڑنے سے پہلے وہ مسلمانوں پر اپنے غرور اور تکبر کا مظاہرہ کرنا چاہتا۔ چنانچہ صلح کی بات چیت کے لیے اُس نے اسلامی سفیر طلب کیا اور حضرت نعمان بن مقرن نے حضرت مغیرہ بن شعبہ کو بطور سفیر کے بھیج دیا۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ بلا تامل مردان شاہ کے دربار میں گھس گئے۔ وہ بڑے ٹھاٹھ سے سر پر زرنگار تاج رکھے سونے کے تخت پر بیٹھا تھا۔ حضرت مغیرہ نے مترجم کے ذریعے گفتگو کی۔ مردان شاہ حقارت سے بولا۔ تم لوگ دنیا میں سب سے زیادہ بدبخت فاقہ مست اور منحوس قوم ہو۔ ہمارے سپاہی کبھی کے تمہاری قسمت کا فیصلہ کر چکے ہوتے۔ مگر تم لوگ اتنے ذلیل ہو کہ ہم تمہارے خون سے اپنے تیروں کو بھی ناپاک کرنا پسند نہیں کرتے۔ اب بھی اگر تم واپس چلے جاؤ تو معاف کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ تمہاری لاشیں خاک و خون میں تڑپتی نظر آئیں گی۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ نے فرمایا۔ ہاں جیسا کہ تم کہتے ہو ہم پہلے ایسے ہی تھے۔ لیکن جب ہم میں ایک رسولؐ آیا اُس نے ہماری بالکل کایا ہی پلٹ دی۔ اُس نے ہم سے دنیا میں فتح و ظفر اور آخرت میں جنت کا وعدہ کیا ہے اور اُس وقت سے فتح و ظفر برابر ہمارے ساتھ رہا ہے۔ لہٰذا اب ہم یہاں سے اُس وقت تک نہیں جا سکتے کہ جب تک تمہارے ملک کو فتح نہ کر لیں یا ہماری لاشیں خاک و خون میں لت پت نہ ہوں۔

غرض صلح کی گفتگو ناکام ہوئی اور حضرت مغیرہ بن شعبہ کے واپس آتے

ہی جنگ چھڑ گئی۔ اور ایسا گھمسان کا رن پڑا کہ عجم کی تمام لڑائیوں میں قادسیہ کے سوا کبھی خونریز معرکہ نہ ہوا تھا۔ مجاہدین اسلام نہایت پامردی اور بے جگری سے لڑے اور لاشوں کے پشتے کے پشتے لگانے گئے۔ حضرت نعمان بن مقرن سخت زخمی ہو کر گرے۔ لیکن ان کے گرتے ہی اُن کے بھائی حضرت بن مقرن نے اس جا بکدستی سے اسلامی فوج کا علم سنبھال لیا کہ اُس کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائی۔ تمام دن میدان کارزار گرم رہا حتیٰ کہ رات کی تاریکی پھیلتے ہی ایرانیوں کے قدم اُکھڑ گئے۔ اور ہمدان کی طرف بھاگ نکلے۔ اس لڑائی میں تیس ہزار ایرانی قتل ہوئے اور اُن کی فوجی طاقت ایسی تباہ و برباد ہوئی کہ پھر ایسے ساز و سامان کے ساتھ وہ کبھی مسلمانوں کے مقابلے پر نہ آ سکے۔

اسلامی قاصد کسریٰ پرویز کے جواہرات کے انبار لیے حضرت عمر فاروق رضؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور فتح کی خوشخبری سنائی۔ آپ فتح کا مژدہ سن کر بے حد خوش ہوئے لیکن حضرت نعمان بن قارن کی شہادت کی اطلاع پائی تو بے اختیار سر پر ہاتھ رکھ کر رونے لگے۔

اب نہاوند سے اسلامی فوج رے کی طرف بڑھی جہاں ایرانی فوج کے سپہ سالار اسفندیار نے مسلمانوں کا مقابلہ کیا۔ اور شکست کھائی۔ یزدجرد اب مرو سے بھاگ کر اصفہان اور پھر کرمان چلا گیا اور آخر میں اُس نے بلخ میں پناہ لی، جہاں دربدر خاک بسر مارا مارا پھرتا رہا اور بالآخر حضرت عثمان غنی کے زمانے میں اپنے ہی ایک ہم قوم دہقان کے ہاتھوں قتل ہو گیا مسلمانوں

نے یکے بعد دیگرے فارس، سجستان، آذربائیجان اور خراسان کو فتح کر لیا اور اس طرح سے ۲۱ھ میں تمام ایران پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے ایران کے فتح کیے جانے کی اطلاع پاکر دلی مسرت محسوس کی اور مسلمانوں کو مسجد نبویؐ میں اکٹھا کر کے مؤثر تقریر کی جس میں آپ نے فرمایا ــــ آج مجوسیوں کی سلطنت بالکل تباہ و برباد ہو گئی۔ اب اُن کے ملک کی ایک چپہ زمین بھی اُن کے قبضے میں نہیں کہ جس کے ذریعے وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچا سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی زمین، اُن کا ملک اور اُن کی دولت کا تمھیں اس لیے وارث بنایا کہ تمھیں آزمائے اس لیے تم اپنی حالت نہ بدلو۔ ورنہ خدا بھی تمھاری جگہ دوسری قوم کو بدل دے گا۔ مجھے اُس امت کے لیے خود اس کے افراد سے خوف ہے۔

وفات

حضرت سعد بن وقاص کی وفات سے متعلق اختلاف ہے۔ ابو نعیم نے کہا ہے کہ ۵۸ھ میں وفات پائی۔ واقدی ۵۵ھ سن وفات قرار دیا ہے اور ابن حجر نے دو روایتیں بیان کی ہیں۔ جن میں ایک سن ۵۱ھ اور دوسرا سن ۵۵ھ ہے مگر مشہور سن ۵۸ھ ہی ہے۔

طارق بن زیاد

نام و نسب

طارق بن زیاد، شمالی افریقہ کے بربرہ کی نسل سے تھا۔ بربرہ کو مسلمانوں نے ۲۶ھ سے ۸۱ھ تک بڑی مشکلوں کے ساتھ مطیع کیا۔ انہی لوگوں میں سے ایک شخص زیاد تھا جو ایک مشہور اسلامی جرنیل اور عرب سردار موسیٰ بن نصیر کا خدمت گار تھا۔

زیاد نہایت بہادر اور جنگجو آدمی تھا۔ اُس نے موسیٰ بن نصیر کے ہمراہ کوئی پندرہ سولہ جنگوں میں دادِ شجاعت دی اور کئی مرتبہ نازک موقعوں پر موسیٰ بن نصیر کی جان بچائی۔ یہ احسانات موسیٰ بن نصیر کے دل پر نقش ہو گئے اور اُس نے زیاد کو اپنا منہ بولا بھائی بنا لیا۔

جب زیاد ایک لڑائی میں سخت زخمی ہو گیا اور کافی عرصے تک بیمار رہ کر انتقال کر گیا تو اُس کا نوجوان بیٹا طارق اور اُس کی ماں حلیمہ دونوں موسیٰ بن نصیر کی سرپرستی میں آ گئے اور موسیٰ بن نصیر ہی کے گھر میں رہنے لگے۔ اگرچہ آج طارق بن زیاد کو اہلِ دُنیا موسیٰ بن نصیر کا غلام کہتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ موسیٰ بن نصیر کا سلوک اس قدر مشفقانہ تھا کہ طارق بن زیاد کی اس غلامی پر "فرزندی" کے شرف کو رشک آتا تھا۔

ابتدائیہ

آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز میں اندلس کی اندرونی حالت پادریوں کی من مانیوں کے باعث بے حد خراب ہو چکی تھی۔ حکومت پر کلیسا کا اقتدار اور کلیسا کے اجارہ دار پادری تھے جن کے اشارہ چشم و ابرو کے اندلس کے تمام حکمران پابند چلے آتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ اندلس کے حکمران تو صرف نام کے حکمران تھے۔ اصل حکومت انہی پادریوں کی تھی اور یہی سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ جسے چاہتے تخت پر بٹھلاتے اور جسے چاہتے اُتار پھینکتے۔ ظاہر ہے جب اندلس کے حکمرانوں کی صورت یہ تھی تو رعیت کی حالت تو ان سے بھی کہیں زیادہ بدتر تھی۔ حکومت کے جابرانہ قوانین اور اُس کے امیروں اور جاگیرداروں کے ظالمانہ معاشی نظام سے اندلس کے عیسائی عوام بے حد نالاں تھے۔ اور کچھ ایسا ہی سلوک یہودیوں کے ساتھ روا رکھا جاتا تھا بلکہ اُن کی حالت جانوروں سے بھی کہیں زیادہ بدتر تھی۔ مختصراً یہ کہ بادشاہ اور اس کے امراء سے لے کر خانقاہوں کے راہبوں اور کلیسا کے پادریوں تک سبھی مے عشرت میں مدہوش تھے۔ ان کے دربار اِندر کا اکھاڑہ اور ان کی خانقاہیں حسین عورتوں کا پری خانہ تھیں۔

اس زمانے میں اندلس کی حکومت گاتھ قوم کے آخری بادشاہ رداوڈیز

کے ہاتھوں میں تھی۔ اگرچہ رواوِٹیزا جسے اہلِ عرب غیطشہ کہتے ہیں۔ ایک عیش پرست حکمران تھا۔ تاہم اُس نے اپنے زمانے میں کلیسا کے اجارہ داروں کی تھوڑی بہت اصلاح کی اُن کی بڑھتی ہوئی بدعنوانیوں کو روکا۔ کلیسا کے اقتدار میں کمی کی۔ ایسے تمام قوانین جو نہایت جابرانہ تھے بیک قلم منسوخ کر دیے۔ علاوہ ازیں عوام کو امیروں اور جاگیرداروں کے خونی پنجے سے نکالنے کی کوشش کی اور یہودیوں کو بھی چند ایک مراعات دے کر خوشحال بنا دیا چونکہ وہ بذاتِ خود بھی عیش پرستی میں مبتلا تھا اس لیے پادریوں نے جب اسے اپنے خلاف پایا۔ اور دیکھا کہ وہ ان کے اقتدار کو مٹی میں ملانے پر تلا ہوا ہے تو انھوں نے اس کی عیش پرستی کی کمزوری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے حکومت کے امراء و وزراء اور عیسائی عوام کو اپنے ساتھ ملا لیا اور اسے بے دین قرار دیتے ہوئے تخت سے اتارنے کی جدوجہد شروع کی۔ بالآخر مذہب کے جس مقدس نام پر انھوں نے عوام کو اپنی مدد کے لیے پکارا تھا وہ اس میں کامیاب ہوئے اور رواوِٹیزا تخت سے اتار دیا گیا۔ اور اس کی جگہ حکومت ایک ایسے بڈھے تجربہ کار فوجی راڈرک کے ہاتھ میں دے دی جسے شاہی خاندان سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ مگر عیش پرستی اور ہوس کوشی میں پادریوں کے مزاج کے مطابق تھا۔

گاتھ قوم کے حکمرانوں میں حکومت اور امرا کے درمیان تعلقات کو استوار اور مضبوط رکھنے کے لیے سیاسی مصلحت اور حکمت کے تحت مدتوں سے یہ دستور چلا آتا تھا کہ اندلس کی حکومت کے رئیسوں، امیروں اور جاگیرداروں

کے بچے شاہی محل میں بادشاہ وقت کی ملکہ کی زیر نگرانی پرورش اور تعلیم و تربیت پاتے تھے اس کے علاوہ لبسا اوقات ان بچوں کی بیاہ شادیاں بھی ان کے ماں باپ کے بجائے خود شاہ کی طرف سے ہی کر دی جاتی تھیں۔ مقصود اس سے یہی تھا کہ ان بچوں کی جان کے خوف یا بیاہ شادیوں کا اہتمام کرنے کے احسان سے ان کے ماں باپ حکومت کے فرماں بردار اور مطیع و منقاد رہیں۔

راڈرک جب حکومت کے تخت پر بیٹھا تو اسے دادِ عیش دینے کے سوا چونکہ دوسرا کام نہ تھا اس لیے اُس نے سب سے پہلے اسی دستور سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی۔ اس کی ہوس کوشی اور عیاشی کی داستان ایک عیسائی امیر کاؤنٹ جولین کی بیٹی کی عصمت دری سے شروع ہوتی ہے جو دستور کے مطابق اُس زمانے میں شاہی محل میں پرورش پا رہی تھی۔ اس کا نام فلورنڈا تھا۔ راڈرک نے اس سے زبردستی منہ کالا کیا جس سے کاؤنٹ جولین کی غیرت جوش میں آ گئی۔ اور اس نے مظلوم بیٹی سے اس واقعہ کی اطلاع ملنے پر ظالم راڈرک کی حکومت کا تختہ الٹنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

کاؤنٹ جولین جو نسلاً یونانی تھا اور قسطنطنیہ کا رہنے والا تھا۔ یہ جانتا تھا کہ وہ اکیلا راڈرک کی حکومت کا تختہ نہیں اُلٹ سکتا۔ البتہ مسلمانوں کی حکومت اُس کی فریاد سُن سکتی ہے اور اس کے ذریعے ظالم کو اس کے انجام تک پہنچانے کا راستہ ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اُس نے موسیٰ بن نصیر

کو اپنی مدد کے لیے پکارا جو اُس زمانے میں شمالی افریقہ کے گورنر تھے۔ اور اندلس کے قریب تھے۔ کاؤنٹ جولین نے اس سلسلے میں اُن کی ہر قسم کی رہنمائی کرنے اور معلومات بہم پہنچانے کا بھی وعدہ کیا اور دعوت دی کہ وہ اندلس پر حملہ کر ڈالیں۔

موسیٰ بن نصیر نے اندلس کے اندرونی حالات اور ظالم راڈرک کی عیاشی و سفاکی کے واقعات سننے کے بعد خلیفہ ولید بن عبدالملک کو دمشق خط لکھ کر اندلس پر حملہ کرنے کی اجازت چاہی جس کے جواب میں خلیفہ نے انھیں لکھا کہ واقعات اور حالات کی تحقیق کیے بغیر کوئی قدم اُٹھانا صحیح نہیں۔ مناسب یہ ہے کہ پہلے وہاں کے حالات اور واقعات کی لفظ بلفظ تصدیق حاصل کر لی جائے۔ اس پر حضرت موسیٰ بن نصیر نے ۹۱ھ میں اپنے ایک غلام طریف بن مالک کو پانسو مجاہدوں کے ساتھ اندلس روانہ کیا جو وہاں کے حالات اور واقعات دیکھ کر اور معلوم کر کے بعض جزیروں اور ساحلی شہروں سے مالِ غنیمت حاصل کرتا ہوا واپس آیا اور آکر بلا کم و کاست آنکھوں دیکھے حالات بیان کیے۔

اب طریف ابنِ مالک کی واپسی کے بعد موسیٰ بن نصیر نے دوبارہ ۹۲ھ میں اپنے دوسرے غلام طارق بن زیاد کو سات ہزار فوج دے کر کاؤنٹ جولین کے ہمراہ روانہ کیا۔ یہ فوج کشتیوں یا جہازوں میں سوار ہو کر اندلس پہنچ گئی اور ایک پہاڑی مقام پر ڈیرے ڈال دیے۔ جو بعد میں طارق ہی کے نام پر انگریزی میں جبرالٹر اور عربی میں جبل الطارق مشہور ہو گیا۔

اتفاق سے اُس وقت گاتھ قوم کا ایک جاگیردار تھیوڈو جسے اہلِ عرب

تدمیر کہتے ہیں۔ مرسیہ کے نواح میں اپنی فوج کے ساتھ موجود تھا۔ وہ اندلس کے صوبہ مرسیہ کا گورنر تھا اور آس پاس کے علاقوں کی دیکھ بھال کے سلسلے میں نکلا تھا کہ اس کی مسلمانوں سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ وہ ایک اجنبی اور نامعلوم قوم کو دیکھ کر پہلے تو متعجب ہوا۔ پھر یہ سوچ کر کہ ہو سکتا ہے یہ لوگ ہمارے لیے کوئی نئی مصیبت ثابت ہوں۔ تیزی سے آگے بڑھا اور جبرالٹر کے قریب آتے ہی مسلمانوں پر دھاوا بول دیا۔ لیکن شکست فاش کھائی اور بھاگ نکلا۔ اب اس نے راڈرک کو ان الفاظ میں واقعے کی اطلاع دی کہ ہمارے ملک پر اچانک ایک ایسی قوم نے حملہ کر دیا ہے جس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کہ وہ کیا ہیں؟ اور کہاں سے آئے ہیں، زمین سے نکلے ہیں یا آسمان سے اترے ہیں۔

راڈرک اس وقت پلونہ میں ایک فوج لیے ملک کے اندرونی دشمنوں سے نبرد آزما تھا، اسے جونہی بیرونی دشمنوں (مسلمانوں) کے حملہ کرنے کی اطلاع ملی وہ اس مہم کو وہیں چھوڑ کر چل دیا۔ اب اس کے ساتھ ایک لاکھ سپاہ تھی اور اسپین کے تمام بڑے بڑے امرا و جاگیردار اور شاہی خاندان کے ارکان ہمرکاب تھے۔ اِدھر طارق ابن زیاد بھی پیش قدمی کرتا ہوا فارس کے شہر شذونہ تک پہنچ گیا تھا۔ اُسے جب معلوم ہوا کہ راڈرک ایک لاکھ کا لشکر جرار لیے اس کے مقابلے کو آرہا ہے تو اس نے اپنے اُن جہازوں اور کشتیوں کو آگ لگا دی جن میں سوار ہو کر مجاہدین اسلام یہاں پہنچے تھے۔ بظاہر اُس کا یہ اقدام عجیب معلوم ہوتا ہے لیکن غور کیجیے تو اس سے اُس کے ایک اولوالعزم اور بہادر سپہ سالار ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ پھر جب

موسیٰ بن نصیر نے اس کی مدد کے لیے پانچ ہزار فوج اور بھیج دی تو بارہ ہزار فوج کو لے کر ظالم راڈرک کی ایک لاکھ سپاہ کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لیے میدان جنگ میں نکل آیا۔

وادی لکہ یا بکہ میں دریائے گراڈلٹ کے کنارے پر دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ طارق بن زیاد نے جنگ شروع ہونے سے پہلے مجاہدین اسلام کے سامنے ایک جوش انگیز اور ولولہ خیز تقریر کی اور کہا۔

"اے مسلمانو! میدانِ جنگ سے بھاگنے کی اب کوئی صورت نہیں تمھارے آگے دشمن کا وسیع ملک ہے اور پیچھے ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر۔ خدا کی قسم صرف ثابت قدمی، پامردی اور استقلال ہی میں تمھاری بھلائی ہے۔ یہی وہ فتح مند فوج ہے جو دشمن سے مغلوب نہیں ہو سکتی۔ اگر یہ دونوں باتیں تم میں موجود ہیں تو ہرگز تعداد کی قلت سے تمھیں نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ اور بزدلی، کاہلی، سستی، نامردی، اختلاف اور غرور کے ساتھ تعداد کی کثرت کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔

اے مسلمانو! میرے پیچھے چلو! اگر میں حملہ کروں، تم بھی حملہ آور ہو جاؤ۔ اور جب میں رک جاؤں، تم بھی رک جاؤ۔ جنگ کے وقت تم سب مل کر ایک جسم (جان) بن جاؤ۔ میں اس مغرور (راڈرک) کا سر غرور توڑنے کے لیے اُس پر حملہ کر کے دست بدست لڑوں گا۔ اگر میں اس حملے میں مارا جاؤں تو ہرگز تم رنج و غم نہ کرنا اور میرے بعد آپس میں جھگڑ کر نہ لڑ بیٹھنا۔ اس سے تمھاری ہوا اُکھڑ جائے گی اور دشمن کو تمھارے مقابلے میں موقع مل جائے گا اور اس کے ہاتھوں

قتل و گرفتار ہو کر تباہ و برباد ہو جاؤ گے۔

اور دیکھو اے مسلمانو! خبردار ذلت پر راضی نہ ہونا اور اپنے آپ کو دشمن کے حوالے نہ کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے مشقت اور جفاکشی کے ذریعے دنیا میں تمھارے لیے جو شرف، عزت و راحت اور آخرت میں جو شہادت کا ثواب مقدر کیا ہے اس کی طرف بڑھے چلے جانا۔ خدا کی پناہ اور حمایت کے باوجود اگر تم ذلت پر راضی ہو گئے تو سخت گھاٹے میں رہو گے اور دوسرے مسلمان تمھیں الگ بُرے ناموں سے یاد کریں گے۔ جیسے ہی میں حملہ کروں تم بھی حملہ کر دو۔ خدا ہمارے ساتھ ہے۔

دوسرے دن گراڈلٹ کے کنارے معرکہ آرائی شروع ہوئی۔ راڈرک بڑے تزک و احتشام سے میدانِ جنگ میں آیا۔ وہ فوج کے آگے آگے تختِ رواں پر سوار تھا۔ سر پر چترِ شاہی سایہ کیے ہوئے اور بلوریں کیل کانٹے سے لیس انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا اُس نے آتے ہی مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ اب مسلمان بھی مردانہ وار اُس کے مقابلے میں آ گئے۔ اور گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ دونوں میں اگر طاقت و قوت اور ساز و سامان کے اعتبار سے دیکھا جائے تو کوئی تناسب نہ تھا۔ ایک طرف ایک لاکھ سپاہ تھی جس کے پاس ہر قسم کے ہتھیار تھے اور وہ کیل کانٹے سے لیس ہو کر میدان میں نکلی تھی۔ سامانِ رسد اُس کے پاس بے شمار تھا۔ اس کے علاوہ ہر طرح کے ذرائع اُسے میسّر تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود بادشاہ اس کی کمان کر رہا تھا۔ دوسری طرف مسلمانوں کی حالت یہ تھی کہ تعداد کے اعتبار سے بہت تھوڑے

تھے اور ملکی لحاظ سے اجنبی تھے۔ نہ اُن کے پاس مناسب سامانِ رسد تھا اور نہ معقول ہتھیار۔ ظاہر ہے اِن میں اور اُن میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ مگر دل سب مسلمانوں کے ایک تھے۔ اُن کا مقصد ایک تھا کہ خدا کی راہ میں جہاد کریں زندہ رہے تو غازی کہلائیں، مارے گئے تو شہادت کا رتبۂ عظیم پائیں گے۔ اس کے برعکس راڈرک کے سپاہی، امراء و وزراء سب ایک نہیں تھے۔ ایک دوسرے سے شدید اختلافات رکھتے تھے۔ وہ صرف مسلمانوں کو غیر ملکی حملہ آور خیال کر کے میدانِ جنگ میں مجبوراً نکلے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ عرب کے مسلمانوں کو مال و دولت کی ضرورت ہے۔ لہٰذا لوٹ مار کر کے یہاں سے چلے جائیں گے اور ہمیں اُن کے ذریعے راڈرک کے مظالم سے ضرور نجات مل جائے گی۔

بالآخر حق پرستوں نے باطل کی قوتوں پر فتح پائی۔ راڈرک کی فوج مسلمانوں کے حملے کی تاب نہ لا کر بری طرح پسپا ہوئی، یہاں تک کہ راڈرک اپنی جان بچانے کے لیے میدانِ جنگ سے بھاگ نکلا مگر موت اب اُس کا مقدر ہو چکی تھی۔ وہ بدحواسی کے عالم میں بھاگتا ہوا دریا میں ڈوب کر مر گیا۔ بچے کھچے سپاہی بھاگ کر استجہ پہنچ گئے۔ اور میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ اس فتحِ عظیم نے مسلمانوں کے حوصلے اتنے بلند کر دیے۔ اور اسپین کے لوگوں کو اس قدر پست ہمت اور بزدل بنا دیا کہ وہ کسی مقام پر بھی مسلمانوں کا جم کر مقابلہ نہ کر سکے۔ مختصراً یہ کہ معرکہ گواڈلٹ مسلمانوں کے لیے تمام اندلس کی فتح کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

اندلس کے لوگ اب تک اس خیال میں تھے کہ طارق بن زیاد بھی اپنی مہم سے فارغ ہو کر طریف ابن مالک کی طرح لوٹ مار کر کے واپس چلا جائے گا لیکن

جب طریف نے اس کا نتیجہ کی خبر شکست خوردہ فوج کے مقابلے کی تیاریاں دیکھ کر پھر اُس کی کمر توڑ دی اور اپنے لشکر کو چار حصوں میں تقسیم کر کے اسے تمام اندلس کی فتح کے لیے مختلف سمتوں میں پھیلا دیا تو وہ یہ صورت دیکھ کر بے حد خوف زدہ ہوئے اور شہر اور قصبوں میں ٹھہرنے کی بجائے پہاڑی علاقوں میں چلے گئے۔

اب طارق بن زیاد کی فوج کا ایک حصہ تو غرناطہ کی طرف بڑھا۔ دوسرا حصہ قرطبہ پر حملہ آور ہوا۔ تیسرے حصے نے مالقہ کی راہ لی اور چوتھا حصہ خود طارق بن زیاد نے اپنے ساتھ لے کر اندلس کے پایۂ تخت طلیطلہ کا رُخ کیا۔ اطراف ملک میں فوجوں کو اس ترتیب سے روانہ کرنے کی تجویز خود کاؤنٹ جولین ہی نے پیش کی تھی جو طارق بن زیاد کی رہنمائی کے لیے برابر اس کے ساتھ ساتھ رہا۔ مقصود اس سے یہ تھا کہ اندلس کے عیسائی مرعوب ہو جائیں اور تمام صوبوں میں علیحدہ علیحدہ فوجیں بھیجنے سے پایۂ تخت طلیطلہ پر چڑھائی کرنے میں آسانی ہو۔

طلیطلہ

طلیطلہ گاتھ قوم کے فرمانرواؤں کا پایۂ تخت تھا۔ یہاں اُن کا خزانہ ان کی دولت اور اُن کے عجائب روزگار نوادر تھے۔ اہلِ طلیطلہ نے جب سنا کہ طارق بن زیاد اُن پر چڑھائی کے ارادے سے چلا آرہا ہے تو انھوں نے اس کے آنے سے پہلے پہلے ہی یہاں کی تمام دولت اور نوادرات کو دوسرے مقاموں پر منتقل کر دیا۔ اور خود شہر چھوڑ کر جبل شارات کی پشت پر دوسرے شہر میں چلے گئے۔ چنانچہ طارق بن زیاد جب یہاں پہنچا تو اس نے شہر کو بالکل خالی پایا۔

اور اس طرح بغیر جنگ و جدل کیے طلیطلہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

طلیطلہ کی فتح کے بعد اس کے نظم و نسق کے انتظامات سے فراغت پا کر طارق بن زیاد اہل طلیطلہ کی تلاش میں چل پڑا۔ راستے میں اُسے ایک سونے کا میز ہاتھ آیا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام سے منسلق ہے۔ طلیطلہ کے لوگ اسے گرجا کی دوسری قیمتی اشیاء کے ساتھ کسی دوسرے مقام پر منتقل کرنے کے لیے جا رہے تھے کہ پکڑے گئے۔ بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ اس میز کا حضرت سلیمان علیہ السلام سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ اندلس کے قدیم حکمرانوں میں یہ دستور چلا آتا تھا کہ جب کوئی دولت مند آدمی مرنے لگتا تو وہ متروکہ میں سے کنیسہ کے لیے بھی کچھ وصیت کر جاتا تھا۔ پھر اس سے جو دولت حاصل ہوتی اس سے کنیسہ کے لیے سونے چاندی کی کرسیاں میز اور دوسری عمدہ چیزیں بنوائی جاتی تھیں اور مذہبی رسموں کے ادا کرنے کے موقعوں میں ان چیزوں پر انجیل مقدس رکھی جاتی تھی نیز مذہبی تہواروں میں قربان گاہ کو سجانے کے کام بھی آتی تھیں (حوالے کے لیے دیکھیے نفح الطیب جلد اول صفحہ ۱۲۷) لیکن یہودیوں کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ بیت المقدس میں حضرت سلیمانؑ کے معبد میں تھا۔ رومیوں نے جب بیت المقدس کو لوٹا تو اُس وقت یہ میز بھی بیت المقدس سے یورپ آیا اور پھر کسی طرح عیسائیوں کے ہاتھ میں آ کر اندلس آ گیا۔

طارق بن زیاد کا چونکہ یہ معمول تھا کہ وہ مفتوحہ مقامات پر مسلمانوں کی چوکیاں بٹھانے کے ساتھ ساتھ یہودیوں کو بھی آباد کرتا چلا جاتا تھا۔ اس لیے گمان غالب ہے کہ اس میز کے بارے میں یہ روایت یہودیوں نے طارق بن زیاد کو خوش کرنے کے لیے وضع کی ہو۔

ابھی طارق بن زیاد کی پیش قدمی جاری تھی کہ موسیٰ بن نصیر بھی مہم کو سخت خیال کر کے پانچ ہزار فوج لے کر آگئے مگر صورت حال کے معلوم ہوتے پر موسیٰ نے مناسب سمجھا کہ طارق کے مفتوحہ علاقے چھوڑ کر کسی نئے میدان کی طرف بڑھا جائے چنانچہ موسیٰ بن نصیر نے کاؤنٹ جولین کی رہنمائی میں شذونہ کو پار کرتے ہوئے قرمونہ کا رُخ کیا۔ یہ شہر اپنی مضبوطی اور استحکام کے لحاظ سے اندلس بھر میں لاجواب شہر تھا اور اس کا فتح کرنا آسان نہ تھا۔ کاونٹ جولین کے ساتھیوں نے اس مشکل کا حل تلاش کرنے کے لیے ایک ترکیب کی کہ اپنے آپ کو شکست خوردہ اسپین ظاہر کر کے اہلِ قرمونہ سے پناہ کی درخواست کی جسے انھوں نے بہ طیب خاطر قبول کر لیا۔ جب رات ہوئی، تاریکی ہر طرف پھیلنے لگی یہاں تک کہ تمام شہر کے لوگ سو گئے تو انھوں نے رات کے اندھیرے میں شہر کے پھاٹک کھول دیے۔ پھاٹک کھلتے ہی اسلامی فوج اندر آگئی اور بغیر کشت و خون اور جنگ و جدل کرنے کے قرمونہ پر قبضہ کر لیا۔

قرمونہ کی فتح کے بعد موسیٰ بن نصیر نے اشبیلیہ کو فتح کیا جو بڑا قدیم اور تاریخی شہر تھا۔ اور گاتھ خاندان سے پہلے مدتوں عیسائی سلطنت کا مرکز رہا۔ اسپین کے تمام علماء، فضلا اور پیشوا یہیں رہتے تھے۔ اشبیلیہ کے بعد پھر وہ بطلیموس پہنچا اور اس کے تاریخی شہر ماردہ کا محاصرہ کر لیا۔ یہ شہر بھی اپنی قدامت و عظمت کے اعتبار سے اندلس کا سب سے ممتاز شہر تھا۔ یہاں شاہی محلات، کنیسے اور پل بکثرت تھے۔ اس کے علاوہ شہر کے گرد نہایت سنگین شہر پناہ تھی۔ ہر چند اہلِ ماردہ نے بڑی بہادری اور بے جگری سے مسلمانوں کا مقابلہ کیا۔

کئی خونریز معرکے بھی ہوئے تاہم شکست ان کا مقدر ہو چکی تھی۔ اُن کا طریقہ جنگ یہ تھا کہ روزانہ شہر سے نکل کر لڑتے اور شام کو واپس چلے جاتے۔ ایک روز جب وہ شام کو واپس چلے گئے تو مسلمانوں نے تھوڑی سی فوج اپنی کمین گاہوں میں چھپادی پھر جیسے ہی صبح کو اہلِ مارده لڑائی کے لیے نکلے اور مقابلہ شروع ہوا۔ کمین گاہوں سے فوج اچانک نکل کر ٹوٹ پڑی۔ یہاں تک کہ اہلِ مارده اس ناگہانی حملے کی تاب نہ لاتے ہوئے بُری طرح پسپا ہوتے اور ان کی بہت بڑی تعداد قتل ہو گئی تھوڑے سے بہت آدمی جو بچ رہے۔ وہ بھاگ کر قلعے میں پہنچ گئے اور قلعے کے دروازے بند کر کے دھرنا دے کر بیٹھ گئے۔ اور اندر ہی اندر لڑنا شروع کر دیا۔

موسیٰ بن نصیر نے قلعے کو توڑنے کے لیے دبابہ تیار کروایا اور اس کی آڑ لے کر مجاہدین اسلام فصیل تک پہنچ گئے اور ایک برج کے نیچے فصیل کو توڑنا شروع کیا۔ لیکن فصیل کچھ اتنی سخت اور پختہ تھی کہ قلعہ توڑنے کے سارے آلات بیکار ہو گئے۔ اس پر قیامت یہ کہ اہلِ مارده نے موقع پا کر مسلمانوں پر اچانک حملہ کر دیا جس سے بے دھیان مسلمان اُن کے حملے کا پورا جواب نہ دے سکے اور اُن کی بہت بڑی تعداد شہید ہو گئی۔ بالآخر اہلِ مارده اور مسلمانوں میں صلح ہو گئی اور مصالحت کی رُو سے شہر کے باہر کے معرکے میں جتنے اہلِ مارده مارے گئے یا وہ لوگ جو جلیقیہ بھاگ گئے تھے۔ اُن سب کا مال و متاع اور شہر کے تمام کنیسوں کی تمام دولت مسلمانوں کو مل گئی۔

ہر چند اشبیلہ کے لوگ یہ دیکھ کر کہ موسیٰ بن نصیر اہلِ مارده کے معاملے میں مصروف ہے اور شہر کے انتظامات میں لگا ہوا ہے۔ باغی ہو گئے اور انھوں

نے اسی مسلمانوں کو شہید کر ڈالا۔ مگر موسیٰ بن نصیر نے اُن کی سرکوبی کے لیے جونہی اپنے بیٹے عبدالعزیز کو روانہ کیا اور اُس نے آتے ہی شہر پر دوبارہ قبضہ کر کے قاتلوں اور باغیوں کو موت کی سزا دی تو سارے اندلس میں مسلمانوں کے جاہ و جلال رعب داب اور طاقت و قوّت کی دھاک بیٹھ گئی اور اہلِ اندلس نے پھر کبھی ایسی حرکت کرنے کی کوشش نہیں کی۔

قرطبہ

اندلس کی حکومت کے پایۂ تخت طلیطلہ کے بعد دوسرا اہم صوبہ قرطبہ تھا۔ اس کی مہم میں طارق بن زیاد نے خلیفہ ولید بن عبدالملک کے ایک تجربے کار غلام مغیث رومی کو بھیجا تھا۔ مغیث نے قرطبہ پہنچ کر اپنی فوج کو ترائی کی جھاڑی میں چھپا دیا اور تجربہ کار لوگوں کو معلومات حاصل کرنے کے لیے آگے بڑھا دیا۔ وہ لوگ راستے میں ایک چرواہے سے ملے جس کی زبانی انھیں پتہ چلا کہ قرطبہ کے تمام لوگ شہر چھوڑ کر طلیطلہ چلے گئے۔ صرف چند سپاہی۔ اور ایک صوبہ دار یہاں ہے۔ اس کے علاوہ اُس نے یہ بھی بتایا کہ قرطبہ کی شہر پناہ بے حد مضبوط ہے۔

ان حالات کا علم ہونے کے بعد اب مجاہدینِ اسلام رات کی تاریکی میں شہر کی طرف بڑھے۔ قدرتِ خدا جب وہ دریا کو پار کر کے شہر کی فصیل تک پہنچے تو مینہ آگیا۔ موسم سرد تھا پھر اس پر طرہ یہ کہ بارش ہونے لگی۔ شہر پناہ کے محافظ پہرے چھوڑ کر کونوں کھدروں میں جا کر سو گئے۔ مغیث نے بڑے اطمینان و سکون کے ساتھ گھوم پھر کر شہر پناہ دیکھی مگر اُسے کوئی راستہ نہ ملا۔ ابھی وہ کچھ سوچتا ہوا دو قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ

اُسے اچانک ایک روزن دکھائی دیا اور اس کے پاس ہی ایک اُونچا سا درخت تھا۔ چند مسلمان پگڑیوں کی کمند بنا کر درخت کے سہارے شہر پناہ کے اوپر پہنچ گئے۔ اور نیچے اُتر کر پہرہ داروں کو قتل کر دیا اور پھاٹک کھول دیے۔ باہر جو لشکرِ اسلام انتظار میں کھڑا تھا دروازہ کھلتے ہی ریلا کر کے اندر آ گیا اور سیدھا قصرِ حکومت کی طرف بڑھ گیا۔ یہاں صوبے دار (گورنر) کے پاس کچھ زیادہ طاقت نہیں تھی اس لیے وہ مسلمانوں کو اپنی طرف آتے دیکھ کر چپکے سے کھسک گیا اور محل خالی کر کے شہر کے مغربی حصے کے ایک کنیسہ میں پناہ گزین ہو گیا۔ یہ کنیسہ نہایت مستحکم اور سنگین تھا۔ گویا بجائے خود ایک قلعہ تھا۔

مغیث رومی نے قصرِ حکومت پر قبضہ کرنے کے بعد کنیسہ کا محاصرہ کر لیا۔ پورے تین مہینے تک اس پر سختی کی مگر کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ معاً سوچتے سوچتے اُسے ایک خیال آیا اور اُس نے خیال کے آتے ہی وہ نہر بند کر دی جس کے ذریعے قلعے میں پانی پہنچتا تھا۔ چنانچہ اس کا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔ قلعہ کے محصورین پانی کی بندش سے تڑپنے لگے۔ صوبے دار نے یہ صورت جو دیکھی تو پھر یہاں سے بھی خاموشی کے ساتھ کھسک گیا مگر مغیث رومی کو اس کے نکل بھاگنے کا پتہ چل گیا اس نے اس کا پیچھا کیا۔ صوبے دار نے اپنا تعاقب دیکھ کر گھوڑا سرپٹ ڈال دیا۔ لیکن ایک نالہ پھاندنے میں گھوڑا سخت زخمی ہو کر گر پڑا اور مغیث رومی نے سر پر پہنچ کر اُسے گرفتار کر لیا۔ صوبے دار کے پکڑے جانے پر اہلِ قلعہ نے بھی ہتھیار ڈال دیے اور قرطبہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

قرطبہ کی فتح کے بعد مغیث رومی نے اس کے نظم و نسق کو بحال رکھنے کے

انتظامات کیے اور یہودیوں کو لا کر یہاں آباد کیا جن سے عیسائیوں کو سخت دلی دشمنی تھی۔ قرطبہ کے صوبوں میں یہودیوں کی بڑی آبادی تھی۔ مفتوحہ علاقوں میں انھیں لا کر آباد کرانے کا مقصد یہ تھا کہ اگر عیسائی مسلمانوں کے خلاف کبھی بغاوت کرنے کی تیاریاں کریں تو اُن کے ذریعے سے بروقت اطلاع ملتی رہے۔ تاکہ باغیوں کی ریشہ دوانیوں کا سدِ باب ہو سکے۔

قرطبہ کے بعد اندلس کا دوسرا نہایت اہم صوبہ تدمیر تھا جو اپنے صوبے دار (گورنر) تھیوڈومیر کی نسبت سے تدمیر مشہور تھا۔ تھیوڈومیر اندلس کے تمام بہادروں میں سب سے زیادہ طاقتور اور نامور تھا۔ جب مجاہدینِ اسلام یہاں پہنچے تو اُس نے مسلمانوں کا بڑی جانبازی کے ساتھ مقابلہ کیا مگر مغیث رومی کی تلوار خارا شگاف کے سامنے اس کی شجاعت کچھ کام نہ آ سکی۔ بالآخر شکست فاش کھائی اور بچی کھچی فوج کو ساتھ لے کر اریولہ کی طرف بھاگ نکلا اور قلعے میں جا کر پناہ گزیں ہو گیا۔ مغیث رومی نے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔

تدمیر شجاعت کے ساتھ ساتھ فہم و فراست کا بہرہ وافر بھی رکھتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مغیث رومی کے ساتھ معرکہ آرائی ہو۔ لیکن وہ اپنا جھوٹا وقار اور کچھ دوسروں کی نگاہوں میں بھرم بھی رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے صلح کے لیے ایک چال چلی۔ ترکیب یہ کی کہ عورتوں کو فوجی لباس پہنا کر کچھ ایسے انداز سے اسلحہ سے آراستہ کر کے قلعے کی فصیل پر کھڑا کر دیا کہ وہ دُور سے مرد نظر آئیں۔ اور پھر خود قاصد کے لباس میں آ کر مسلمانوں سے صلح کی بات چیت شروع کی۔ مسلمان اُس کے دھوکے میں آ گئے اور صلح کر لی۔ پھر جب مسلمان شہر میں داخل ہوئے اور انھوں نے

دیکھا کہ عورتوں اور بچوں کے سوا یہاں کوئی مرد نہیں اور یہ کہ قاصد کے لباس میں خود تدمیر ہی اُن کے پاس صلح کی درخواست لے کر آیا تھا تو انھیں بے حد پشیمانی ہوئی۔ لیکن ایفائے عہد چونکہ اسلام کے تعلیمات میں ایک مومن مجاہد کے لیے لازمی شرط ہے۔ لہٰذا مسلمان اپنے وعدے پر قائم رہے۔

ادھر ماردہ کی فتح کے بعد موسیٰ بن نصیر طلیطلہ کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں طارق بن زیاد سے ملاقات ہوگئی، جو دوسری طرف سے آرہا تھا۔ طارق بن زیاد نے آگے بڑھ کر موسیٰ بن نصیر کا استقبال کیا۔ اور پھر دونوں اکٹھے ہو کر طلیطلہ پہنچ گئے، جہاں موسیٰ بن نصیر نے مال غنیمت کا جائزہ لیا۔ ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ طلیطلہ کی فتح میں مسلمانوں کو اتنا سونا، چاندی اور مختلف قسم کا دوسرا قیمتی ساز و سامان ہاتھ آیا کہ شمار سے باہر ہے اس کے بعد موسیٰ بن نصیر نے اندلس کے باقی حصوں پر چڑھائی کرنے کے انتظامات مکمل کیے جو ابھی فتح ہونے سے رہ گئے۔ مختصر طور سے یہ کہ موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد۔ یہ دونوں سپہ سالار آگے پیچھے روانہ ہوئے۔ اور طلیطلہ سے سرقوسہ تک تمام علاقے فتح کر ڈالے۔

مقریزی لکھتا ہے کہ اندلس کے عیسائیوں پر مسلمانوں کی تیغ خارا شگاف کی اس قدر ہیبت چھائی ہوئی تھی کہ انھیں کوئی روکنے والا نہ تھا۔ طارق بن زیاد جس طرف رُخ کرتا فتح و نصرت اُ) کے ساتھ ساتھ چلتی تھی یہی کہ خود اندلس کے عیسائی پیش قدمی کر کے مصالحت کرتے تھے۔ وہ آگے آگے فتح کرتا چلا جاتا تھا اور موسیٰ بن نصیر پیچھے پیچھے صلح ناموں اور معاہدوں کی تصدیق کرتے چلے جاتے تھے۔

مورخین لکھتے ہیں کہ اندلس دولت وثروت کا بے پناہ خزانہ تھا گویا سارے ملک میں سونے چاندی کے دریا بہتے تھے۔ اس لیے اندلس کی فتح سے مسلمانوں کو اَن گنت مال غنیمت حاصل ہوا۔ سونے، چاندی، جواہرات اور نقد روپے کے علاوہ بے شمار نوادرات روزگار بھی ہاتھ آئے۔ ان میں سب سے معمولی شے ایک فرش تھا جو سونے اور چاندی کے تاروں سے بنا ہوا تھا، یاقوت، زبرجد اور دوسرے بیش قیمت موتی اس میں جڑے ہوئے تھے۔ اب اس سے ایک اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دیگر اشیا جو اس کے مقابلے میں اُونچے درجے کی تھیں وہ کس قدر قیمتی ہوں گی۔ مختصراً یہ کہ جب موسیٰ بن نصیر یہاں سے دارالخلافت کی طرف چلا ہے تو اُس کے ہمراہ تیس ہزار لونڈی، غلام، گاتھ فرمانروائی کے چوبیس گراں بہا تاج، سونے کا سلیمانی میز، سونے چاندی کے برتن، جواہرات کے ذخیرے اور بے شمار عجائبات و نوادرات روزگار تھے۔

اندلس کے عیسائیوں سے فاتح مسلمانوں نے بے حد فیاضانہ سلوک کیا اُن کی تمام جاگیریں واپس کر دی گئیں۔ اور مذہبی رسموں کے ادا کرنے کی عام اجازت دے دی گئی اور اُن کے مذہبی معاملات میں ہرگز کوئی بیرونی مداخلت روا نہیں رکھی۔ علاوہ ازیں جن غاصب عیسائیوں نے اپنے ہی بھائی بندوں کا حق مار لیا تھا اور ان سے ناانصافی کی تھی۔ اُن کا حق انھیں پہنچایا گیا اور اُن کی دادرسی بھی کی گئی۔

وفات

خلیفہ ولید بن عبدالملک نے ایک مرتبہ ارادہ کیا کہ اپنے بھائی سلیمان

بن عبدالملک کی بجائے اپنے بیٹے عبدالعزیز کو ولی عہد بناتے اور اس سلسلے میں تمام بڑے بڑے امراء خاص کر حجاج بن یوسف نے خلیفہ کے خیال کی تائید اور حمایت بھی کی تھی مگر پھر بعد میں خلیفہ نے کچھ سوچ کر اپنا ارادہ بدل دیا۔

ہر چند ولید بن عبدالملک کے انتقال کے بعد سلیمان بن عبدالملک کو خلافت مل گئی۔ تاہم نئے خلیفہ کے دل سے اُن امراء کے خلاف کدورت نہ گئی جنھوں نے ولید بن عبدالملک کی ہمنوائی کی تھی۔ چنانچہ محمد بن قاسم، موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد وغیرہ ایسے مدبر جرنیلوں کو سلیمان بن عبدالملک کی انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بننا پڑا۔

(اگرچہ خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کی ذات میں بڑی خوبیاں تھیں اپنے چچیرے بھائی حضرت عمر بن عبدالعزیز ایسے فاروق ثانی خلیفہ کو اپنے بعد خلیفہ منتخب کرنا سلیمان بن عبدالملک کا ایک قابل قدر کارنامہ ہے۔ تاہم اسلام کے نامور جرنیلوں کا قتل خلیفہ کے دامن پر بدترین داغ ہے)

محمد بن قاسم، موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد۔ خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کے عہدِ خلافت میں، مختلف اوقات میں، مختلف طریقے سے قتل کیے گئے۔ مثلاً محمد بن قاسم کو عراق میں لا کر قید کیا گیا، جہاں عراق کے گورنر صالح بن عبدالرحمٰن نے اپنے بھائی آدم کے انتقام میں جو خارجی تھا اور حجاج نے اُسے قتل کیا تھا۔ محمد بن قاسم کو طرح طرح کے آزار پہنچا کر مروا دیا۔

موسیٰ بن نصیر پر روپے پیسے کی خرد برد کا الزام لگایا گیا۔ اُسے

دھوپ میں کھڑا کیا گیا اور کئی لاکھ روپے کا تاوان ادا کرنے کی سزا دی گئی جسے وہ ادا نہ کر سکا اور اسی صدمے میں دنیا سے چل بسا اور کچھ ایسا ہی معاملہ طارق بن زیاد سے بھی پیش آیا۔

محمد بن قاسم

نام ونسب

امداد الدین محمد بن قاسم بن محمد ثقفی۔ بنی ثقیف، عرب کا ایک مشہور قبیلہ ہے جس نے دانائی، چالاکی، سفاکی اور بہادری میں بڑی شہرت حاصل کی اور عربوں کی تاریخ میں اپنے قبیلے کا نام روشن کیا۔ مثلاً دانائی اور چالاکی میں ایک منچلا نوجوان مختار ثقفی مشہور ہوا جس نے قاتلانِ حسینؑ سے خونِ حسین کا انتقام لیا۔ سفاکی میں حجاج بن یوسف ثقفی کا نام ضرب المثل ہوا اور بہادری میں محمد بن قاسم نے ناموری پائی۔

ولادت:۔ محمد بن قاسم جب سندھ کی مہم پر ۷۱۲ عیسوی بمطابق ۸۶ھ میں بھیجا گیا تو بقول مؤرخین کے وہ سترہ برس کا نوجوان تھا اور اس وقت فارس کا گورنر تھا۔ اگر یہ بیان درست ہے تو اس حساب سے محمد بن قاسم کا سن ولادت ۶۹ھ کے لگ بھگ قرار پاتا ہے۔ محمد بن قاسم عرب کے ایک مشہور شہر طائف میں پیدا ہوا۔ ابھی کمسن ہی تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس کی ماں نے تعلیم وتربیت دلائی۔ وہ پہلے محلے کی مسجد میں بٹھایا گیا، جہاں اسے قرآن حکیم کی تعلیم ملی۔ پھر جب ذرا سیانا ہوا تو اپنے چچا[1] حجاج بن یوسف کے پاس چلا آیا، جو اس وقت عراق کا گورنر تھا۔ اور یہاں اس نے اپنے چچا سے فنون جنگ کی تربیت حاصل کی۔

---

[1] بعض مورخوں نے محمد بن قاسم کو حجاج بن یوسف کا چچیرا بھائی بیان کیا ہے جو غلط محض ہے

ابتدائیہ

لنکا میں بہت پہلے سے کچھ عرب تاجر آباد تھے۔ اُن میں سے ایک تاجر فوت ہو گیا۔ لنکا کے راجہ نے عرب کے مسلمانوں سے دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کے لیے متوفی تاجر کے بال بچوں کو جن میں کئی ایک عورتیں بھی تھیں۔ جہاز کے ذریعے واپس بھجوانے کا انتظام کر دیا۔ اس کے علاوہ اس جہاز میں کچھ حاجی بھی سوار تھے۔ نیز خلیفہ ولید بن عبدالملک کے لیے کچھ تحفے تحائف بھی تھے۔ جب یہ جہاز دیبل کے قریب پہنچا تو سندھ کے ڈاکوؤں نے اس پر حملہ کر کے مال و دولت لوٹ لیا اور عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ ان میں سے ایک عورت نے غائبانہ حجاج سے فریاد کی کہ اے حجاج المدد! جب کسی طرح حجاج کو اس واقعہ کا علم ہوا تو وہ سخت بےچین ہوا اور اس نے اسی عالم میں غائبانہ جواب دیا۔ اے بیٹی میں آیا اور اسی وقت دیبل کے راجہ داہر کو لکھا کہ وہ لٹیروں کو گرفتار کر کے قرار واقعی سزا دے اور مظلوم بچوں اور عورتوں کو ان کے چنگل سے رہائی دلائے۔ لیکن راجہ داہر نے سخت سرد مہری سے کام لیا اور حجاج کو لکھ بھیجا کہ میں اس کام کے کرنے سے مجبور ہوں۔ بحری قزاقوں کا میرے پاس کوئی علاج نہیں۔

حجاج بن یوسف ثقفی اُس وقت عراق کا مشہور ظالم سفاک گورنر تھا۔

اس نے راجہ داہر کا کورا اکھڑ جواب پایا تو سخت پیچ و تاب کھایا اور اسی وقت راجہ داہر کی مزاج پرسی کے لیے عبیداللہ بن نبہان کو فوج دے کر دیبل روانہ کیا۔ اُن کی راجہ داہر کی فوج سے مڈ بھیڑ ہوئی اگر وہ شہید ہو گئے۔ ان کے بعد بدیل بن طہفہ بجلی بھیجے گئے وہ تین ہزار فوج لے کر مکران سے ہوتے ہوتے دیبل پہنچ گئے۔ راجہ داہر نے اُن کے مقابلے میں ایک لشکر جرار بھیجا۔ بدیل نے بڑی شجاعت و بامردی کا مظاہرہ کیا اور بے جگری سے لڑے۔ لیکن عین میدانِ جنگ میں ان کا گھوڑا بدک گیا اور گر گئے۔ اور ابھی سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ سندھی سپاہی لپک کر ٹوٹ پڑے اور اُنھیں شہید کر دیا۔ اور مجاہدینِ اسلام نے شکست فاش کھائی۔

اُن حالات کا جب حجاج بن یوسف کو پتہ چلا تو وہ سخت رنجیدہ ہوا۔ یہ صدمہ اُس کے لیے بہت بھاری تھا۔ اب اس نے اپنے نوجوان بھتیجے محمد بن قاسم ثقفی کو جو اس وقت فارس کا گورنر تھا۔ سندھ کی مہم پر جانے کے لیے منتخب کیا۔

فتح سندھ

محمد بن قاسم جس کی عمر اُس وقت سترہ سال تھی۔ چھ ہزار سپاہیوں کو لے کر سندھ روانہ ہوا۔ اُس نے تمام بھاری سامان تو بحری راستے سے روانہ کر دیا اور خود مکران ہوتے ہوئے خشکی کے راستے سے سندھ آیا اور سب سے پہلے قنز پور کی طرف بڑھا اور اُسے فتح کر کے ارمابیل کو تسخیر کیا۔ پھر ارمابیل پر قبضہ کرنے کے بعد وہ دیبل کی طرف بڑھا۔ اُس کے پہنچتے ہی وہ سامان بھی جسے بحری راستے سے بھیجا تھا پہنچ گیا۔ اس میں ایک قلعہ شکن منجنیق بھی تھی جسے پانسو آدمی چلاتے تھے۔ اُس کا نام عروس تھا۔ اب محمد بن قاسم کے آنے پر دیبل کے لوگ قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ محمد بن قاسم نے شہر کا محاصرہ کر لیا اور چاروں طرف خندقیں کھدوا کر منجنیق نصب کروا دی۔ اہلِ شہر نہایت بہادری کے ساتھ کئی مہینے تک مسلمانوں سے لڑتے رہے لیکن لڑائی کسی فیصلہ کن مرحلے میں داخل نہ ہو سکی۔

حجاج بن یوسف اس مہم سے کچھ اتنا قلبی تعلق رکھتا تھا کہ اُسے ہر تیسرے دن سندھ کی مہم سے متعلق اطلاعات بہم پہنچائی جاتی تھیں اور وہ جنگ کے حالات معلوم کر کے مناسب ہدایات بھیجتا رہتا تھا۔ جب محاصرے نے زیادہ طول پکڑا اور فتح پانے میں دشواری پیش آئی تو حجاج نے لکھا کہ منجنیق کو ایک

زاویہ کم کر کے اور مشرقی جانب نصب کر کے ٹھیک نشانے باندھ کر دیول پر پتھر برسائے جائیں چنانچہ ان ہدایات پر عمل کرتے ہوئے محمد بن قاسم نے سنگباری کا حکم دیا۔ دیول بدھ مذہب کے ماننے والوں کا بت کدہ تھا۔ جو شہر کے قلب میں واقع اور اس کی جان کی حیثیت رکھتا تھا۔ سنگباری کا نتیجہ یہ نکلا کہ دیول کا گنبد ٹوٹ گیا اور دوسری طرف باہر سے مسلمانوں نے پوری قوت کے ساتھ کوشش کی اور بڑھتے ہوئے فصیل تک پہنچ گئے۔ اہل شہر نے انھیں روکنے کی بڑی جدوجہد کی، مگر بے سود۔ چند مسلمان جان کی بازی لگا کر کمند کے ذریعے فصیل پر چڑھ گئے، جس سے اہلِ شہر نے اندازہ کر لیا کہ اُن میں مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کی اب مزید ہمت نہیں رہی۔ چنانچہ راجہ داہر کا حاکم شہر چھوڑ کر بھاگ نکلا اور مسلمان آسانی سے اُس پر قابض ہو گئے۔

دیبل پر فتح پانے کے بعد محمد بن قاسم نے یادگار کے طور پر یہاں ایک مسجد تعمیر کرائی اور چار ہزار مسلمانوں کو آباد کیا۔ دیبل سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک مقام نیرون تھا۔ یہاں کے راجہ بھدرکن نے یہ دیکھ کر کہ دیبل کے لوگوں نے ہزار مقابلہ اور طرح طرح کے جتن کرنے کے آخر گھٹنے ٹیک دیے۔ اور مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی۔ چنانچہ اُس نے بھی صلح کی درخواست پیش کی جسے محمد بن قاسم نے بہ طیب خاطر قبول کر لیا۔ نیرون کے حاکم نے احسان شناسی کے طور پر محمد بن قاسم اور اُس کے لشکر کو ساتھ لے کر شہر میں اس کی ضیافت کی اور لشکر کے مویشیوں کے لیے چارہ فراہم کیا اور بہت سے قیمتی ہدیے بھی پیش کیے۔

نیرون کے بعد محمد بن قاسم بلا روک ٹوک نیرون سے شمالی سندھ تک کا سارا علاقہ آسانی کے ساتھ فتح کرتا چلا گیا۔ اور دریا کو پار کرنے کے بعد شری و بدس کے بدھوں سے پالا پڑا جنھوں نے بغیر لڑے بھڑے خراج دے کر اطاعت قبول کر لی۔ اب یہاں سے محمد بن قاسم سیستان کی طرف روانہ ہوا بھدرکن کا راجہ محمد بن قاسم کی شجاعت، اور اُس کے کریمانہ اوصاف دیکھ کر اُس کی رہنمائی کے لیے ساتھ ہو لیا۔ راستے میں بہروچ کا علاقہ پڑتا تھا جس پر راجہ داہر کے بیٹے بجرا کی حکومت تھی۔ یہاں کی آبادی بدھ مذہب کے ماننے والوں پر مشتمل تھی اور کشت و خون کو سخت ناپسند کرتی تھی۔ اُن لوگوں نے بجرا سے کہا کہ مسلمانوں کا یہ عام طریقہ ہے کہ وہ لوگ جو امن پسند ہوں، جنگ و جدل نہ کرتے ہوں۔ مطیع و فرماں بردار ہوں۔ ۔ اُن سے جنگ نہیں کرتے۔ انھیں اُن کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمیں جنگ و جدل سے طبعاً نفرت ہے۔ ہمارے مذہب (بدھ) میں لڑنا جھگڑنا قطعاً گوارا نہیں۔ دوسرے ہم آپ کی طرح محفوظ نہیں۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ اگر ہم نے عربوں کا مقابلہ کیا تو ضرور ان کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ اس لیے ہم نہیں چاہتے کہ اُن سے جنگ و جدل کریں۔ اس لیے اگر آپ ہمیں اجازت دے دیں تو اپنی جانوں کی سلامتی کے لیے ہم مسلمانوں کے سامنے صلح کی درخواست رکھیں۔ بجرا نے بدھوں کی باتیں بغور سنیں لیکن منہ سے اُن کا کچھ جواب نہ دیا۔

محمد بن قاسم جب بہروچ پہنچا تو اُس نے یہاں کی آبادی کو نہایت اطاعت کیش اور صلح کل پایا۔ لہٰذا اُس نے ان سے بالکل کوئی چھیڑ چھاڑ

نہیں کی اور سیستان کا سفر جاری رکھا۔ راستے میں اُسے مخبروں کی زبانی پتہ چلا کہ سیستان کے باشندے بھی اطاعت اختیار کرنے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن راجہ بجیرا اور اس کی مسلح فوج اس کے لیے تیار نہیں، بلکہ لڑائی پر آمادہ ہے۔ محمد بن قاسم نے سیستان پہنچتے ہی قلعے کا محاصرہ کر لیا اور پتھر برسانے شروع کر دیے۔ یہاں کے باشندے تو چونکہ شروع ہی سے جنگ کرنے کے مخالف تھے۔ ایک سنگباری سے بہت گھبرائے اور بجیرا سے درخواست کی کہ جیسے تیسے بھی ہو جنگ بند کر دی جائے۔ لیکن بجیرا نے سُنی اَن سُنی کر دی۔ اب اہلِ شہر نے تنگ آ کر کہلا بھیجا کہ ہم سب بجیرا سے نفرت کرتے ہیں۔ ہمارا اس جنگ سے کوئی تعلق نہیں اور کام کی بات ہم آپ کو ایک یہ بتائے دیتے ہیں کہ راجہ کے پاس کچھ زیادہ فوج نہیں اہلِ شہر سے یہ اطلاع پا کر اب مسلمانوں نے پوری قوت سے حملہ کیا یہاں تک کہ ایک ہفتے کے مقابلے کے بعد بجرا کی فوج کے حوصلے ماند پڑ گئے اور کمر ہمت ٹوٹ گئی۔ بجرا نے جب اپنی فوج کو ناکامی و مایوسی کے عالم میں دیکھا تو چند آدمیوں کو اپنے ساتھ لے کر رات کی تاریکی میں فرار ہو گیا۔ اور بودھیا کے حاکم کاکا کے پاس جا کر پناہ لی۔ کاکا چونکہ راجہ داہر کا ماتحت تھا اس لیے اس نے بجرا کی آؤ بھگت کی اور ادھر دوسرے روز سیستان پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

اب سیستان کے نظم و نسق کے سلسلے میں انتظامات مکمل کرنے کے بعد محمد بن قاسم نے کاکا کے دارالسلطنت سیسم کا رُخ کیا۔ مفتوحہ علاقوں کے لوگ اور اُن کے رؤسا محمد بن قاسم کے اخلاق اور حسنِ سلوک سے اس قدر متاثر تھے کہ سیسم کی چڑھائی کے سلسلے میں بہت سے رؤسا اور سردار محمد بن قاسم کے

ہم رکاب ہو گئے

ہر چند کاکا بھی محمد بن قاسم سے جنگ نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن بجرا چونکہ اس کا دوست اور اس کے حاکم راجہ داہر کا بھتیجا تھا اس لیے چاروناچار اسے اپنے یہاں پناہ دینے پر مجبور تھا۔ جب کاکا کو پتہ چلا کہ محمد بن قاسم فوج لیے سیسم کے قریب آچکا ہے تو وہ صلح کی بات چیت کرنے کے لیے اپنے سرداروں کو ساتھ لے کر چل پڑا۔ راستے میں محمد بن قاسم کے ایک آدمی سے ملاقات ہوئی جسے حالات کا پتہ لگانے کے لیے فوج کے آگے آگے بھیجا گیا تھا۔ وہ ایک عرب سردار تھا۔ بنانہ بن حنظلہ اُس کا نام تھا۔ بنانہ اُسے اور اُس کے سرداروں کو لے کر محمد بن قاسم کے پاس چلا آیا۔ یہاں کاکا نے محمد بن قاسم سے مل کر اپنی وفاداری کا پورا پورا یقین دلایا اور محمد بن قاسم نے اس کے صلے میں اسے خلعت فاخرہ سے نوازا۔ اس کی بڑی عزت افزائی کی۔ اور پھر اپنے ایک وکیل عبدالملک بن قیس کے ہمراہ اُسے عزت واحترام کے ساتھ روانہ کر دیا۔

بجرا ابھی تک سیسم ہی میں ٹھہرا ہوا تھا اور کاکا اُسے یہاں سے نکالنے کی قدرت نہیں رکھتا تھا لہٰذا محمد بن قاسم کے لیے سیسم پہنچ کر قلعہ پر حملہ کرنا لازم ہو گیا۔ ہر چند بجرا کے ساتھیوں نے جان توڑ کر مقابلہ کیا اور ان میں سے ایک ایک نے بڑی بے جگری سے جنگ کی تاہم اُن میں سے اکثر قتل ہو گئے اور بچے کھچے کسی طرح جان بچا کر بھاگ نکلے۔ اس شکست کا اثر یہ ہوا کہ بعض علاقوں کے حکمران جو دل سے راجہ داہر کے خلاف تھے۔ لیکن کھلم کھلا اس کی مخالفت نہیں کر سکتے۔ محمد بن قاسم کی اطاعت کے حلقے میں بے دھڑک داخل ہو گئے۔

سیسم پر قبضہ کرنے کے بعد ابھی محمد بن قاسم آگے بڑھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اسے حجاج کی طرف سے حکم ملا۔ نیرون واپس جا کر راجہ داہر کے دار الحکومت پر چڑھائی کرو۔ یہ حکم پاتے ہی محمد بن قاسم نیرون پہنچ گیا۔ تھوڑے دن یہاں ٹھہرا۔ پھر اپنی منزل مقصود کی طرف گامزن ہوا۔ راستے میں اس نے شبہار کے قلعے پر چڑھائی کی اور فتح پائی۔ پھر وہاں سے بڑھا تو دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر پہنچ گیا اور بیٹ کے راجہ موکا کو لکھا کہ اگر تم اطاعت قبول کر لو تو تجھ اور سورٹھ کی حکومت تمہیں کو بخش دی جائے گی۔ راجہ موکا چونکہ راجہ داہر کے ماتحت تھا اور ان دنوں اس کے اور اس کے بھائی راسل کے درمیان تخت و تاج کے معاملے میں جھگڑا چل رہا تھا اس لیے راسل کے مقابلے کے لیے اسے مسلمانوں کی مدد کی بے حد ضرورت تھی مگر دشواری یہ تھی کہ وہ راجہ داہر کی کھلم کھلا مخالفت نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک چال چلی۔ وہ یہ کہ اس نے محمد بن قاسم کو لکھا کہ میں دل سے تو آپ کے ساتھ ہوں مگر بعض مجبوریوں کے باعث مجھے آپ کے ساتھ جھوٹ موٹ جنگ کرنی پڑے گی۔ بصورت دیگر بغیر لڑے بھڑے آپ کی اطاعت اختیار کر لینے سے میری سخت رسوائی ہوگی۔ آپ ایسا کیجیے کہ میں تھوڑی سی فوج لے کر چھاپ لیتا ہوں اور آپ ایک ہزار سپاہی بھیج کر مجھے گرفتار کرا لیں۔ یہ خط لکھنے کے بعد کاکا سانگرہ چلا گیا اور محمد بن قاسم نے اس کے پیچھے ایک ہزار فوج روانہ کر دی۔ جونہی دونوں کا آمنا سامنا ہوا۔ کاکا نے اس پر حملہ کر دیا۔ اور پہلے سے کی گئی تدبیر کے مطابق بنانہ بن حنظلہ کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ محمد بن قاسم نے کاکا کی بڑی عزت افزائی کی۔ ایک لاکھ

دینار نقد عطا کیے۔ خلعت فاخرہ سے نوازا۔ نیز بیٹ کی حکومت کا موروثی پروانہ لکھ کر اُس کے حوالے کر دیا۔ یعنی اس میں یہ طے پایا کہ جب تک دنیا میں اس کی اولاد قائم ہے بیٹ کی حکومت اسی کے پاس رہے گی۔

محمد بن قاسم کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ راجہ داہر اطاعت اختیار کرے اور آئندہ مسلمانوں کے خلاف نہ خود کوئی کارروائی کرے نہ دوسروں کو موقع دے کہ وہ خواہ مخواہ دست اندازی کریں۔ اس سے پہلے کہ لڑائی کا آغاز ہو، محمد بن قاسم نے راجہ داہر کے پاس مصالحت کی غرض سے ایک وفد بھیجا لیکن وہ مغرور راجہ بات تک سننے کا روادار نہ ہوا اور کہا کہ اس کا فیصلہ اب تلوار سے ہوگا اور یہ کہتے ہی فوجیں لے کر محمد بن قاسم کے مقابلے کے لیے چل پڑا اور اسلامی فوج کے قریب پہنچ کر دریائے سندھ کے مشرقی جانب ڈیرے ڈال دیے۔ اور جا بجا تیر انداز مقرر کر دیے کیونکہ ان دونوں کے درمیان دریائے سندھ حائل تھا۔ اس لیے ضروری ہو گیا کہ ان میں جو فریق بھی کشتیوں کا پل تیار کر کے دریا کے دوسرے ساحل پر پہنچ گیا۔ وہ میدان مار لے گا۔ چنانچہ مسلمان جیسے ہی کشتیوں کو جوڑ کر دریا پار کر لینے کی کوشش کرتے، تیروں کا مینہ برسنے لگتا۔ مسلمان سخت حیران تھے کہ کیا صورت پیدا کی جائے جس سے دریا کے دوسرے کنارے پہنچ سکیں۔ بالآخر سوچتے سوچتے ایک ترکیب اُن کے ذہن میں آ ہی گئی۔ انھوں نے بجائے دن کے اُجالے کے رات کی تاریکی میں کشتیوں کو دریا کے عرض میں جوڑنے کی بجائے طول میں جوڑ کر ایک لمبا پل بنایا اور اُسے دریا کے بہاؤ پر چھوڑ دیا اور اس طرح کشتیوں کا دوسرا سرا ساحل پر پہنچ گیا اور مجاہدین اسلام

راتوں رات دریا کو پار کر کے اس جوش و خروش سے راجہ داہر کی فوج پر حملہ آور ہوئے کہ اس کی فوج مسلمانوں کے اچانک حملے کی تاب نہ لاتے ہوئے جہم تک پسپا ہوتی چلی گئی۔ اب فوجوں کی پسپائی کے بعد محمد بن قاسم نے بیٹ کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ اور عبدالرحمان بن علی ثقفی کو ایک دستہ دے کر آگے آگے روانہ کر دیا۔

راجہ داہر اس وقت کاجی جاٹ میں تھا۔ عبداللہ بن علی ثقفی اروڑ سے ہوتا ہوا جیپور کی طرف بڑھا۔ راستے میں کچھری جھیل پر اُسے راجہ داہر کا بیٹا جے سنگھ ملا، جو اسلامی فوج کے ساتھ اُلجھنے کے لیے پہلے سے وہاں موجود تھا۔ دونوں میں لڑائی ہوئی، مگر جے سنگھ کی فوج کے قدم نہ جم سکے اور شکست فاش کھائی۔ اگرچہ لڑتے لڑتے جے سنگھ بھی گھوڑے سے گر کر سخت زخمی ہوا، لیکن وہ کسی طرح اپنی جان بچا کر میدانِ جنگ سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

جے سنگھ کی اس شکست کا مسلمانوں کو سب سے بڑا فائدہ یہ پہنچا کہ جتنے ایک راجے مہاراجے لالچ کی بنا پر راجہ داہر کے ساتھ تھے۔ وہ سب اس سے سخت بد دل ہو گئے۔ حتیٰ کہ راسل جو داہر کے ساتھ تھا، اس سے علیحدہ ہو کر مسلمانوں سے مل گیا اور اپنے قیمتی مشوروں اور تجربوں سے انھیں بڑی مدد بہم پہنچائی۔ اور محمد بن قاسم کی رہنمائی کے لیے اس کے ساتھ ہو لیا۔ محمد بن قاسم نے پہلے جیپور پر قابض ہو کر یہاں اپنی فوجیں اُتاریں۔ پھر اس کے بعد راجہ داہر کے مقابلے کو نکلا۔ راجہ داہر بڑی شان و شوکت کے ساتھ جنگ میں آیا تھا۔ کوہ پیکر ہاتھیوں کی آہنی دیوار آگے آگے تھی اور اس کے پیچھے دس ہزار سوار

اور تین ہزار پیدل سپاہی تھے۔ راجہ داہر خود بھی ایک سفید ہاتھی پر سوار تھا۔ اس کے دائیں بائیں خواصیں تھیں۔ راجہ داہر کے آتے ہی لڑائی شروع ہو گئی۔ دونوں طرف کے بہادر بڑی جانبازی سے لڑے۔ بڑھ بڑھ کر دادِ شجاعت دی اور کئی خوں ریز معرکے ہوئے۔ لیکن ہاتھیوں کی آہنی دیوار مسلمانوں کا راستہ روکے رہی اور وہ پوری طاقت سے نہ لڑ سکے۔ ہاتھیوں کو سامنے سے ہٹانے کے لیے مسلمانوں نے نفت کے ذریعے آگ برسانی شروع کی جس سے ہاتھی بدحواس ہو کر پیچھے کی طرف بھاگنے لگے اور ایسی کھلبلی مچی کہ راجہ داہر کا ہاتھی بھی میدانِ جنگ سے بھاگ کر ایک ندی میں پھاند پڑا اور دلدل میں جا کر بیٹھ گیا۔ مسلمانوں نے ہاتھی پر تیر برسانے شروع کیے۔ لیکن فیل بان کسی نہ کسی ترکیب سے ہاتھی کو اٹھا کر قلعہ کی طرف لے گیا اور ہاتھی نے پھر میدانِ جنگ کی طرف جانے کا رُخ ہی نہ کیا۔

راجہ داہر کی فوج برابر جنگ وجدل کرتی رہی۔ حتیٰ کہ اس کے بڑے بڑے سردار اور بہادر مارے گئے۔ پھر ان کی شجاعت وجانبازی دیکھ کر راجہ داہر کی جمیت کو بھی جوش آگیا۔ چنانچہ ہاتھ میں ننگی تلوار لیے وہ بھی میدانِ جنگ میں پہنچ گیا۔ اور سپاہیوں کے دوش بدوش نہایت ثابت قدمی سے لڑتا رہا۔ یہاں تک کہ قتل ہو گیا۔ راجہ داہر کے قتل ہو جانے سے اس کی فوج کا جوش غضب اور بھی سوا ہو گیا اور وہ ایسے جوش وخروش سے حملے کرنے لگی کہ تھوڑی دیر کے لیے مسلمان بھی اچانک گھبرا اُٹھے۔ اور ان کا سنبھلنا مشکل ہو گیا۔ لیکن پھر جلد سنبھل گئے۔ اور پھر پور طاقت سے حملہ آور ہوئے کہ راجہ داہر کی فوج کے قدم

اُکھڑ گئے اور وہ شکست کھا کر قلعہ راآور کی طرف بھاگ نکلی۔ مسلمانوں نے اس کا پیچھا کیا جس میں سے بہت سے سپاہی اُن کے ہاتھ گرفتار ہو گئے اور بہت سے قتل کر دیے گیے۔

اب صرف جے سنگھ باقی تھا جو شکست کا انتقام لینے کے لیے سخت دانت پیس رہا تھا۔ اس نے شکست خوردہ فوج کو راآور میں اکٹھا کر کے مسلمانوں کے مقابلے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ہر چند اُس کے عاقبت اندیش وزیر بدھ نے اُسے روکنے کی کوشش کی اور کہا کہ شکست خوردہ فوج اور اس کے گرد و نواح کے علاقے کے لوگوں کے دلوں پر مسلمانوں کا سخت خوف چھایا ہوا ہے۔ اور اب اُن کا مقابلہ کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ لیکن راجہ جے سنگھ بڑا ضدی نکلا۔ اُس نے اپنے خیر خواہوں کی ایک نہ مانی اور کہا کہ تم لوگوں کو برہمن آباد چل کر مقابلے کے انتظامات کر لینے چاہئیں۔ کیونکہ وہاں جنگ کے ذرائع یہاں سے بہتر ہیں۔ چنانچہ جے سنگھ راآور سے برہمن آباد پہنچ گیا۔ لیکن راجہ داہر کی ایک رانی واپس نہ گئی۔ وہ سمجھتی تھی کہ راجہ داہر ابھی زندہ ہے۔ جیسا کہ جے سنگھ نے اس کے بارے میں مصلحتاً مشہور کیا تھا۔ اس لیے وہ مسلمانوں کا مقابلہ کرنے پر تیار ہو گئی۔ اور راآور کے قلعے کی فوج بھی اس کے ساتھ ہو گئی۔ ان حالات کا جب محمد بن قاسم کو پتہ چلا تو وہ سیدھا راآور پہنچا اور آتے ہی قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ پتھر اور آگ برسانی شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قلعے کے برج ٹوٹ گئے۔ رانی نے جب دیکھا کہ تھوڑی دیر میں قلعہ دھم سے زمین پر آیا چاہتا ہے۔ اور اب اس کے بچنے کی مطلقاً کوئی امید نہیں تو وہ اپنی خواصوں سمیت زندہ آگ

میں جل مری اور قلعے پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

راور پر قبضہ کرنے کے بعد محمد بن قاسم نے برہمن آباد کا رُخ کیا۔ راستے میں بہرور اور دھلیلا کے دو قلعے آئے۔ وہ انھیں بھی لگے ہاتھوں فتح کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔ قریب تھا کہ برہمن آباد پر حملہ کرے۔ راجہ داہر کے وزیر سی ساکر نے جو بڑا عاقبت اندیش اور دانشمند تھا۔ جے سنگھ کے انجام پر غور کر کے محمد بن قاسمؒ کے حضور میں جاں بخشی کی درخواست بھجوائی۔ اور اطاعت کرنے کا اقرار کیا۔ محمد بن قاسم نے بطیبِ خاطر اس کی درخواست قبول کر لی۔ اس کے بعد وزیر موصوف نے بھی احسان شناسی کی راہ سے خود آ کر اطاعت کا اظہار کیا اور وہ عرب خواتین بھی پیش کیں جنھیں سندھی ڈاکو قیدی بنا کر اپنے ساتھ لے گئے تھے اور اُن کی بازیابی کے لیے مسلمانوں کو میدان کارزار گرم کرنا پڑا۔

سی ساکر نے محمد بن قاسم کے کریمانہ اخلاق سے متاثر ہو کر جہاں محمد بن قاسم کی دل سے خیر خواہی اور وفاداری شروع کی۔ وہاں خود محمد بن قاسم بھی اس پر اس قدر اعتماد رکھتا تھا کہ اس کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہ کرتا تھا۔

دھلیلا کے قلعے کے انتظامات مکمل کرنے کے بعد محمد بن قاسم ۹۴ھ میں برہمن آباد پہنچا۔ جے سنگھ مقابلے کے لیے پوری تیاری کر چکا تھا اور اپنی فوج کے بڑے بڑے نامور سرداروں کو منتظم بنا کر کسی جنگی ضرورت سے برہمن آباد سے باہر چلا گیا تھا۔ محمد بن قاسم نے جنگ شروع کرنے سے پہلے اہلِ شہر کے پاس کہلا بھیجا۔ اسلام قبول کرو، یا خراج دے کر اطاعت قبول کر لو۔ بصورت دیگر جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ لیکن اہلِ شہر نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ بالآخر محمد بن قاسم

نے لڑائی شروع کر دی۔ جے سنگھ کی فوج چونکہ قلعہ بند ہو کر لڑتی رہی اس لیے لڑائی نے خاصا طول پکڑ لیا اور کوئی فیصلہ کن معرکہ نہ ہو سکا۔ اتنے میں جے سنگھ بھی واپس آ گیا۔ لیکن درمیان میں اسلامی فوج حائل تھی۔ اس لیے وہ برہمن آباد نہ پہنچ سکا۔ چنانچہ اُس نے وہیں ٹھہر کر اسلامی فوج کی رسد کے راستے روک لیے اور ہر طرف سے ناکہ بندی کر دی تاکہ اسلامی فوج کو سامانِ رسد نہ پہنچ سکے۔ اس صورتِ حال سے مسلمانوں کو سخت دشواری پیش آئی۔ آخر راجہ موکا کے مشورے سے ایک فوج جے سنگھ کے مقابلے کے لیے بھی روانہ کر دی۔ جے سنگھ کے پاس کچھ زیادہ طاقت نہ تھی اس لیے وہ راستے سے ہٹ گیا اور اپنے بھائی گوپی کو اپنا قائم مقام کرتے ہوئے کشمیر کی طرف بھاگ نکلا۔

جے سنگھ کے بھاگ نکلنے کے بعد اس کی فوج اور شہر کے لوگ کچھ عرصے تک تو مسلمانوں کا مقابلہ کرتے رہے، لیکن جب محاصرہ نے بہت زیادہ طول پکڑ لیا تو گھبرا گئے اور چپکے چپکے محمد بن قاسم سے جا ملے۔ اور طے پایا کہ محمد بن قاسم کی طرف سے جب اُن پر حملہ ہوگا وہ معمولی سی مزاحمت کریں گے اور اس کے بعد شہر کے دروازے کھلے رہنے دیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ پہلے سے طے کیے گئے منصوبے کے بعد اہلِ شہر نے تھوڑی سی مزاحمت کی اور پسپا ہو کر شہر کے دروازے کھلے رہنے دیئے۔ مسلمانوں نے شہر کی فصیل کے پیچھے سے داخل ہونے کا راستہ نکالا۔ وہ جونہی شہر میں داخل ہوئے قلعے کی فوج اُن کے یوں اچانک داخل ہونے سے گھبرا اٹھی اور بدحواس ہو کر اِدھر اُدھر بھیڑ بکریوں کی طرح بھاگنے لگی۔ غرض جس کا جدھر منہ اُٹھا بھاگ نکلا اور شہر پر مسلمانوں کا قبضہ

ہو گیا۔

محمد بن قاسم نے شہر پر قابض ہوتے ہی امن و سلامتی کا عام اعلان کر دیا اور قطعاً کسی سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا گیا۔ راجہ داہر کی ایک رانی لاڈی جو برہمن آباد میں تھی گرفتار ہو کر سامنے آئی۔ محمد بن قاسم نے اُسے عزت کے ساتھ پردے میں ٹھہرایا اور پھر حجاج بن یوسف سے اجازت لے کر اس سے نکاح کر لیا۔

راجہ داہر کا بیٹا گوپی اس دوران میں ارور چلا گیا اور وہاں کے لوگوں کو یہ یقین دلایا کہ راجہ داہر ابھی زندہ ہے اور ہندوستان میں ہے اور وہاں کے راجاؤں کی مدد لے کر آیا چاہتا ہے۔ انھیں جنگ کی تیاریوں میں پھر مشغول کر لیا۔

اب محمد بن قاسم برہمن آباد کے انتظامات سے فارغ ہو کر راستے میں چھوٹے موٹے مقامات کو فتح کرتے ہوئے پھر ارور پہنچ گیا۔ اور آتے ہی شہر کا محاصرہ کر لیا۔ شہر کے لوگ راجہ داہر کی امداد کی توقع کے سہارے کچھ دیر تو مقابلہ کرتے رہے لیکن جب انھیں رانی لاڈی کی زبانی معلوم ہوا کہ انھیں دھوکہ دیا گیا ہے اور راجہ داہر کا زندہ ہونا سفید جھوٹ ہے، وہ تو کبھی کا قتل ہو چکا تو انھوں نے اطاعت قبول کر لی۔ اور شہر کے دروازے کھول دیے۔ مگر گوپی وہاں سے بھاگ نکلا۔

آرور کے باشندوں نے اس موقع پر محمد بن قاسم کے سامنے دو باتیں رکھی تھیں۔ ایک یہ کہ ارور کے باشندوں کو قتل نہ کیا جائے۔ اور دوسرے بدھ مذہب کے کسی مندر، یا بُت خانے کو مسمار نہ کیا جائے، اور نہ کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچایا جائے۔ محمد بن قاسمؒ نے اُن کی یہ دونوں باتیں بہ طیبِ خاطر قبول کر لیں۔ اس پر

اہلِ شہر نے شہر کی کُنجی محمد بن قاسم کے حوالے کردی اور اسلامی فوج شہر میں داخل ہوگئی اور اسے اس بات کی سختی سے تنبیہ کردی گئی کہ اس کے ہاتھ سے مفتوحین کی جان و مال کو مطلقاً کوئی نقصان نہ پہنچے اور نہ اُن کے بُت خانوں اور آتش کدوں کو چھیڑا جائے۔ البتہ محمد بن قاسم نے غیر مسلم رعایا پر تھوڑا سا خراج تشخیص کردیا جسے بہ طیبِ خاطر اہلِ شہر نے گوارا کر لیا۔

ارور کے بعد محمد بن قاسم نے بابیہ کے قلعے کا رُخ کیا۔ یہاں کے حاکم راجہ کسکا نے اطاعت قبول کر لی اور جنگ و جدال کرنے کی نوبت نہیں آئی اس کے بعد اسکلندہ کے حاکم سے معرکہ آرا ہوئی اور اس نے محمد بن قاسم کا پوری قوت سے مقابلہ کیا۔ سترہ دن تک نہایت خونریز جنگ ہوتی رہی۔ بہت سے مسلمان افسر شہید ہوگئے۔ لیکن سندھیوں کا نقصان اس سے کہیں زیادہ ہوا۔ بالآخر اسکلندہ کا راجہ میدان جنگ سے بھاگ نکلا اور ملتان پہنچ گیا۔ مسلمانوں نے اسکلندہ کے قلعے پر قبضہ کر لیا۔

اب اس کے انتظام و انصرام سے فراغت پا کر محمد بن قاسم نے ملتان کی راہ لی۔ جب دریائے چناب کو پار کرتے ہوئے ملتان کی طرف بڑھا تو راجہ گور سنگھ جو پہلے ہی سے جنگ کی تیاریاں مکمل کر کے انتظار میں کھڑا تھا۔ محمد بن قاسم کے ملتان کے حدود میں داخل ہوتے ہی سرگرم جدال و قتال ہوگیا اور گھمسان کی جنگ شروع ہوگئی۔ زائدہ بن عمیر طائی نے اس جنگ میں کمال شجاعت سے کام لیا۔ یہاں تک کہ راجہ پسپا ہو کر شہر میں قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔ محمد بن قاسم نے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ اتفاق سے انہی دنوں اسلامی فوج کو سامانِ رسد کی سخت کمی

پیش آگئی اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ بار برداری کیجانوروں کو ذبح کر کے کھا لیے مگر محاصرہ بدستور قائم رکھا۔ حسن اتفاق سے انہی ایام میں ایک ملتانی شخص ان کے ہاتھ آگیا اور اس کی زبانی مسلمانوں کو قلعے کے ایک ایسے حصے کا پتہ چل گیا جو کافی کمزور تھا۔ مسلمانوں نے اس پر پتھر برسا کر اسے توڑ دیا جس کے نتیجے میں اہل شہر باہر نکل کر لڑنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن کھلے میدانوں میں جم کر لڑنے کے وہ اہل نہ تھے۔ بالآخر مسلمانوں کے ہاتھوں شکست کھائی۔ اور شہر پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

ملتان اس زمانے میں بدھ مذہب کے ماننے والوں کا تیرتھ تھا۔ اور یہاں کے بت خانوں میں بے شمار مال و دولت تھی جو سب کی سب مسلمانوں کے تصرف میں آئی۔ بلاذری لکھتا ہے کہ بت خانے کا ایک کمرہ جو اٹھارہ گز لمبا اور اور دس گز چوڑا تھا، سونے سے بھرا ہوا تھا۔ چچ نامہ میں لکھا ہے کہ اس کمرے میں جو سونا محفوظ کیا گیا تھا اس کی مقدار کئی سو من تک پہنچتی ہے۔

ملتان کی فتح کے بعد بھی محمد بن قاسم کی فتوحات ابھی جاری تھیں کہ خلیفہ ولید بن عبدالملک کا انتقال ہو گیا اور اس کے بھائی سلیمان بن عبدالملک کے خلیفہ ہو جانے سے بعض سیاسی اختلافات کی بنا پر محمد بن قاسم کو دربار خلافت کی طرف سے مزید فتوحات کے لیے آگے بڑھنے سے روک دیا گیا۔

محمد بن قاسم کی گرفتاری

فاتح سندھ محمد بن قاسم کی گرفتاری کا سبب یہ تھا کہ اس کے مشہور عالم

سفاک اور بدنام زمانہ جابر حجاج بن یوسف نے خلیفہ ولید بن عبدالملک کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایک مرتبہ یہ کوشش کی تھی کہ ولید بن عبدالملک کے مرنے کے بعد بجائے اس کے بھائی سلیمان بن عبدالملک کے ولید کا بیٹا تخت نشین ہو۔ اگرچہ ولید بن عبدالملک نے بعد میں اپنے اس ارادے کو ترک کر دیا۔ تاہم اس واقعہ کے بعد سلیمان بن عبدالملک کے دل میں حجاج بن یوسف کے خلاف گرہ پڑ گئی۔

۹۶ھ میں حجاج بن یوسف مر گیا اور اس کے مرنے کے ایک سال بعد خلیفہ ولید بن عبدالملک بھی چل بسا۔ اب سلیمان بن عبدالملک کو تخت نشین ہونے کا کھلا موقع ہاتھ آ گیا۔ ہر چند سلیمان بن عبدالملک فطرۃً بے حد نیک تھا۔ عمر ثانی حضرت عمر بن عبدالعزیز ایسے جلیل القدر بزرگ اس کے مشیر و ہم جلیس تھے، جن کی بابرکت صحبتوں نے اس کے گیسوئے اخلاق کو اور سنوارا۔ لیکن کیا کیجیے سیاسی چپقلش کا جس نے سلیمان بن عبدالملک کو بھی منتقم مزاج بنا دیا چنانچہ اس نے تخت خلافت پر بیٹھتے ہی محمد بن قاسم ایسے صالح نوجوان کو باوجود سندھ فتح کرنے اور وہاں مسلمانوں کے بارے میں اچھے اثرات پیدا کرنے اور ایک عادلانہ نظام قائم کرنے کے ناکردہ گناہوں کی پاداش میں سندھ کی حکومت سے معزول کر دیا اور اس کی جگہ یزید بن ابی کبشہ کو سندھ کا حاکم بنایا جس نے محمد بن قاسم کو گرفتار کر کے عراق بھیج دیا۔ اس وقت عراق کا گورنر صالح بن عبدالرحمٰن تھا، جس کے بھائی آدم کو جو خارجی تھا، حجاج بن یوسف نے قتل کیا۔ صالح نے اپنے بھائی کا بدلہ محمد بن قاسم سے لینے کے لیے اسے قید کر دیا۔

جہاں وہ طرح طرح کی تکلیفیں اُٹھاکر واصل بحق ہؤا۔ کچھ ایسے ہی واقعات افریقہ کے گورنر موسیٰ بن نصیر کو بھی پیش آئے۔ علاوہ سلیمان بن عبدالملک کے خود اس کا مقرر کردہ سپہ سالار طارق بن زیاد بھی اس کے خلاف تھا، جس کے نتیجے میں موسیٰ بن نصیر ایسے بہادر فاتح کی سلیمان بن عبدالملک نے بر سر عام سخت توہین کی۔ اسے دھوپ میں کھڑا کیا اور مزعومہ مفادات میں ملوث ہونے کی پاداش میں اس پر کئی لاکھ درہم و دینار کا جرمانہ کیا گیا، جسے وہ پورا کرنے سے قاصر رہا اور آخر اسی صدمے سے نہایت خستہ حالی میں اس کا انتقال ہو گیا۔

ظاہر ہے کہ سلیمان بن عبدالملک ایسے خلیفہ پر جس نے مروّجہ قاعدے سے ہٹ کر اپنے بیٹوں کی بجائے اپنے چچیرے بھائی عمر فاروق ثانی حضرت عمر بن عبدالعزیز کو اپنے بعد ولی عہد نامزد کیا تھا۔ محمد بن قاسم اور موسیٰ بن نصیر ایسے جلیل القدر فاتحوں کی ناحق رسوائی اور بے وقت موت بدترین داغ ہے

سندھ کا اجمالی جائزہ

کسی زمانے میں سندھ کے علاقے مہاراجہ ہرش دروردھن کی سلطنت میں شامل تھے۔ لیکن پھر بعد میں ایک زمانہ ایسا آیا کہ اس کے مختلف علاقے خود مختار بن گئے اور ان کی علیحدہ علیحدہ حکومتیں قائم ہوگئیں۔ اب یہ کہ اس کا نام سندھ کیونکر پڑا۔ کہتے ہیں جس زمانے میں یہاں آریہ آئے تھے وہ دریا کے کنارے آکر ٹھہرنے کی مناسبت سے اس علاقے کو سندھو کہنے لگے۔ سنسکرت میں سندھو کے معنی ایک ایسے دریا کے ہیں جو بہت وسیع ہو اور اس کے پاٹ بڑے چوڑے چوڑے ہوں۔ پس اسی لفظ سے آگے چل کر اس پورے علاقے کا نام ہی سندھ مشہور ہوگیا۔

مسلمانوں کے آنے سے پہلے سندھ ایک طاقتور سلطنت کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کی سرحدیں شمال میں میانوالی تک اور جنوب میں مالوہ اور گجرات تک پھیلی ہوئی تھیں اور دارالحکومت الور تھا، جسے آج ہمارے زمانے میں روہڑی کے نام سے پکارتے ہیں۔ نیز ملتان، برہمن آباد اور موجودہ کراچی کے قریب واقع دیبل سندھ کی سلطنت کے مشہور شہر تھے۔

معاشرتی اعتبار سے مملکت سندھ میں سخت ناہمواریاں پائی جاتی تھیں۔ راجہ داہر کا طرز عمل عوام سے نہایت ظالمانہ تھا۔ کسی شخص کو ریشمی کپڑا

اور پگڑی پہننے کی اجازت نہیں تھی اور گھوڑے کی سواری صرف انہی لوگوں کے لیے مخصوص تھی، جو شاہی خاندان کے افراد یا اعلیٰ سرکاری عہدے دار ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ انہی طبقاتی امتیازات کا نتیجہ تھا کہ یہاں کے حاکم اور محکوموں کے درمیان ایک سخت آہنی دیوار کھڑی ہو گئی اور جب مسلم فاتحین بالخصوص محمد بن قاسم ادھر آیا تو سارے سندھی اس دیوار کے توڑنے کے لیے اس کے ساتھ مل گئے۔ اور ذات پات کی جس غیر انسانی تمیز نے ان کے دلوں کو ایک ایک سے جدا کر رکھا تھا۔ اسلامی عالمگیر برادری اور انسانی سطح پر اعلیٰ رواداری کے اصول نے انھیں محمد بن قاسم کی محبت میں ملا دیا اور ایک کر دیا۔

راجہ داہر نے سندھ پر تینتیس ۳۳ برس حکومت کی اس کے قتل ہونے کے بعد جب ۶۹۷ء میں سندھ مسلمانوں کے زیر نگیں ہوا تو ۱۸۴۲ء تک برابر مسلمانوں ہی کے پاس رہا۔ پھر جب مغل سلطنت کی بساط حکومت الٹ گئی اور ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو سندھ بھی انہی کی سلطنت میں شامل ہو گیا۔ پھر جب ۱۸۴۷ء سے آزادی ملک کے لیے متحدہ کوششیں شروع ہوئیں جو ۱۹۴۷ء میں جا کر پایہ تکمیل کو پہنچیں اور مسلمانوں کا ایک علیحدہ ملک پاکستان معرض وجود میں آ گیا تو سندھ بھی مسلمانوں کو دوبارہ حاصل ہو گیا۔

محمد بن قاسم کی مقبولیت اور عظمت کے بارے میں اتنا کہنا بس ہے کہ ہے کہ جب وہ گرفتار ہو کر پا بجولاں سندھ سے عراق گیا ہے تو سندھ کے لوگ اس کی جدائی میں دھاڑیں مار مار کر روتے تھے۔ اور اس کی محبت میں اس قدر آگے بڑھ گئے کہ اس کے مجسمے بنا کر پوجنے لگے۔ اور جب اس کے مرنے کی اطلاع

سندھ پہنچی تو ہر ہندو کے گھر میں صف ماتم بچھ گئی اور ساری اسلامی سلطنت میں ایک کہرام برپا ہو گیا۔ یہاں تک کہ عربوں کے خلاف سندھ میں سخت بدامنی پھیل گئی۔ اور اس پر بمشکل قابو پایا گیا۔

سلطان محمود غزنوی

نام و نسب

سلطان محمود غزنوی بن امیر سبکتگین ابن قرالحکم بن قرارارسلان بن قرالت بن قرالیقمان بن فیروز بن یزدجرد بن شہریار الفارس۔ صاحب طبقات ناصری نے بیہقی کے حوالے سے لکھا ہے کہ دنیائے اسلام کا مشہور بت شکن فاتح سلطان محمود غزنوی ایران کے مشہور عالم بادشاہ نوشیرواں عادل کی اولاد سے تھا۔

غزنوی خاندان کی حکومت کا پہلا بانی سامانیوں کے دربار کا ایک ترکی غلام الپتگین تھا۔ جسے اس کی خداداد شجاعت اور حسن لیاقت و تدبیر کی بنا پر عبدالملک سامانی نے خراسان میں سپہ سالار بنا کر بھیجا تھا۔ سامانیوں کا مختصراً تعارف یہ ہے کہ ان کا مورث اعلیٰ سامان، بلخ کے ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ حسنِ اتفاق سے عباسیوں کے مقرر کیے ہوئے خراسان کے گورنر اسد بن عبداللہ کے یہاں چلا آیا اور زرتشتی مذہب چھوڑ کر مسلمان ہو گیا۔

سامان کے ایک بیٹے کا نام بھی اسد تھا اور اس کے آگے چار بیٹے تھے جو حسنِ لیاقت اور شجاعت کی بنا پر خلیفہ مامون الرشید عباسی کی نگاہ میں بے حد پسندیدہ تھے۔ چنانچہ خلیفہ نے نوح بن اسد سامانی کو سمرقند۔ احمد بن

اسدسامانی کو فرغانہ، یحیٰی بن اسد سامانی کو چاچ اور الیاس بن اسد سامانی کو ہرات کا گورنر بنا دیا۔ احمد بن اسد اپنے تینوں بھائیوں میں سب سے زیادہ طاقتور اور مدبر تھا۔ چنانچہ اُس نے تھوڑی ہی مدت میں اپنی حکومت کے حدود وسیع کر لیے اور اپنے بھائیوں کے علاقے چھین کر سامانی خاندان کی ایک علیحدہ مضبوط حکومت قائم کر دی۔

احمد بن اسد سامانی کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام اسماعیل تھا اور دوسرے کا نام نصر دولت سامانیہ کے حدود میں سیستان، خراسان، ماوراءالنہر، قندھار اور بخارا وغیرہ شامل تھے۔ اسماعیل و نصر دونوں بھائیوں نے مل کر بہت سی فتوحات حاصل کیں اور سلطنت کو خوب وسعت دی۔ اسماعیل بن احمد کے زمانے میں دولت سامانیہ خاص کر قندھار اور بخارا نے بڑی ترقی کی۔ لیکن اسماعیل کے مرنے کے بعد سامانیوں کی طاقت گھٹنے لگی حتیٰ کہ پچاس برس کی حکومت میں کم ہوتے ہوتے صرف خراسان و ماوراءالنہر تک محدود رہ گئی۔

سامانیوں کے دربار میں ترک غلاموں کی کثرت تھی۔ انہی میں سے ایک الپتگین تھا، جسے اسماعیل کے بھتیجے عبدالملک بن نوح نے خراسان کی سپہ سالاری کے عہدے پر فائز کیا تھا۔ پھر جب خود عبدالملک بن نوح حکمران ہوا تو اُس نے الپتگین کو بلخ کا گورنر بنا دیا۔ وہ عبدالملک کی زندگی تک اسی عہدے پر فائز رہا۔ لیکن جب عبدالملک کے مرنے کے بعد تخت نشینی پر نزاع پیدا ہوا یعنی وزیر سلطنت عبدالملک کے بھائی امیر منصور کو تخت پر بٹھانا

چاہتا تھا اور الپتگین چاہتا تھا کہ عبدالملک کا کمسن بچہ تخت و تاج کا وارث بنے۔ حتیٰ کہ جب یہ کشمکش حد سے گزرنے لگی تو الپتگین اسے وہیں چھوڑ کر غزنی چلا گیا، جہاں ۳۵۱ھ بمطابق ۹۶۲ء میں غزنوی سلسلے کی ایک آزاد حکومت کی بنیاد رکھ دی۔ اور اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ لیکن قدرتِ الٰہی نے اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اپنی حکومت کے حدود کو وسیع کر سکے۔ وہ تھوڑے ہی عرصے بعد ۳۵۲ھ ۹۶۳ء میں فوت ہو گیا۔

الپتگین کے مرنے کے بعد اُس کا بیٹا اسحاق تخت نشین ہوا مگر وہ سخت نااہل ثابت ہوا۔ قریب تھا کہ سلطنت کا شیرازہ بکھر جائے۔ سلطان محمود غزنوی کے والد امیر سبکتگین نے کمال شجاعت سے آگے بڑھ کر غزنوی سلطنت کی گرتی ہوئی دیوار کو تھام لیا اور لوہے کی طرح مضبوط بنا دیا۔ اس لحاظ سے دولت غزنویہ کا اصل بانی امیر سبکتگین کہلاتا ہے۔

امیر سبکتگین ابتداء میں الپتگین کا غلام تھا۔ اس کی ماں ترک تھی اور باپ ایرانی تھا۔ بچپن میں ڈاکوؤں نے اُسے اغوا کر لیا اور غلاموں کے بازار میں لا کر بیچ دیا۔ وہ بخارا میں ایک غلام کی حیثیت سے دن گزار رہا تھا کہ الپتگین کی اس پر نظر جا پڑی اور اسے جوہر قابل پا کر خرید لیا۔ سبکتگین نے اپنی لیاقت، شجاعت اور نیک نفسی کی بدولت جلد ہی اپنے آقا کا دل جیت لیا اور الپتگین نے اسے امیر الامرا کا خطاب دے کر اپنے اُمرا میں شامل کر لیا۔ اور پھر ایک وقت ایسا بھی آ گیا کہ الپتگین نے اسے اپنا داماد بنا لیا۔

ولادت

سلطان محمود، عاشورے کی رات کو ۳۵۷ھ مطابق یکم نومبر ۹۷۱ء میں پیدا
ہوا۔ کہتے ہیں اس کی ولادت سے تھوڑی دیر پہلے سبکتگین نے خواب دیکھا تھا کہ
اس کے محل کے آتش خانے سے ایک بہت گھناؤنا درخت پیدا ہوا۔ وہ درخت
اس قدر طویل و عریض تھا کہ تمام دنیا کے لوگ اس کے سائے میں بیٹھ سکیں۔ صبح کو جب
سبکتگین بیدار ہوا تو اُسے اس خواب کی سخت فکر دامنگیر ہوئی۔ اتنے میں اسے محمود
کے پیدا ہونے کی اطلاع ملی۔ غرض اسے اپنے خواب کی تعبیر مل گئی اور محمود نام رکھا۔

سلطان محمود اپنے بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ اسے بچپن ہی سے اپنے
باپ کے ساتھ اکثر جنگی مہمات میں شریک ہونے کے مواقع میسر آئے، جہاں اس
کی طبیعت کے جوہر خوب کھلنے شروع ہوتے اور وہ تھوڑے ہی دنوں میں ایک
نڈر سپاہی اور تجربہ کار مجاہد بن گیا۔ اس کی فہم و فراست اور صولت و شجاعت
کا ثبوت اُس معرکے سے بخوبی مل جاتا ہے، جو سبکتگین اور راجہ جے پال والی پنجاب
کے درمیان برپا ہوا اور محمود نے بطور ایک شہزادے کے اپنے باپ کے ہمراہ اس
معرکے میں حصہ لیا۔ اس واقعہ کی تفصیل کا اجمال یہ ہے کہ جس زمانے میں امیر سبکتگین
وسطی ایشیاء اور اس کے قرب و جوار کے علاقوں میں فتوحات حاصل کر رہا تھا۔
پنجاب میں اُس وقت راجہ جے پال کی ایک طاقتور اور زبردست حکومت قائم

تھی۔ اوراس کی سرحدیں مشرق میں سرہند تک اور شمال و مغرب میں پشاور و غزنی تک پھیلی ہوئی تھیں اور شمال میں کشمیر بھی اس کی سلطنت میں شامل تھا اور جنوب میں ملتان تک حکومت قائم تھی۔ اس کا دارالسلطنت بٹھنڈہ تھا۔ غرض جے پال کی حکومت نہایت وسیع اور مضبوط تھی۔

جے پال جو رسن پال کا بیٹا اور برہمن قوم سے تھا۔ امیر سبکتگین والئی غزنہ کی فتوحات کو بڑھتے ہوئے دیکھ کر خوف کھانے لگا کہ کہیں امیر اس کی حکومت پر بھی قبضہ نہ کر لے۔ حالانکہ امیر کا ہرگز ارادہ نہیں تھا کہ وہ پنجاب کی طرف رُخ کرے وہ اس وقت افغانستان اور ملحقہ علاقوں کی مہم میں مصروف تھا۔ جے پال نے توسیع سلطنت کے ذوق میں امیر سبکتگین سے ناحق سرحدی چھیڑ چھاڑ شروع کر دی جو کافی عرصے تک جاری رہی۔ ایسے حالات میں جبکہ دشمن خود بہانے تلاش کر رہا تھا یعنی کہ وہ انہی سرحدی تنازعوں کا سہارا لے کر کئی لاکھ سوار، کئی لاکھ پیدل سپاہ اور کئی ہزار ہاتھی لے کر غزنہ پر چڑھ آیا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے۔ غور طلب امر یہ ہے کہ غزنہ ایسی ایک چھوٹی سی مسلم ریاست کے لیے اتنے بڑے لشکر لانے کے کیا معنی؟ کیا جے پال ایسے متعصب برہمن زادے کا مقصود یہ نہیں تھا کہ اسلام اور مسلمانوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا چاہیے۔

سلطان محمود اس وقت نیشاپور میں سلطنت کے باغیوں سے نبرد آزما تھا۔ اور جے پال نے اس موقعے کو اپنے لیے غنیمت سمجھا اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ لاہور سے پشاور اور پشاور سے جمرود ہوتا ہوا سلطنت غزنویہ کے حدود میں داخل

ہو گیا اور امیر سبکتگین مختصر سی فوج لے کر لمغان کے میدان میں رزم آرائی کے لیے جا پہنچا۔ واضح رہے پشاور سے جلال آباد تک جو علاقہ آتا ہے، اسے تاریخوں میں لمغان کہا گیا ہے۔ اگرچہ امیر سبکتگین کا لشکر تعداد میں بہت کم تھا۔ اس کے برعکس دشمن کی فوج امیر کے لشکر سے چار پانچ گنا زیادہ تھی۔ تاہم امیر کے لشکریوں کے دل بے حد مضبوط اور حوصلے بے حد بلند تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انھیں اپنے زور بازو کی بجائے اللہ کی ذات پر بھروسہ تھا۔ اور یہی وہ صفت تھی جس سے امیر سبکتگین کی چند ہزار سپاہ جے پال کی فوج کے لاکھوں سواروں اور ہزاروں ہاتھیوں کے گروہ کو قطعاً خاطر میں نہ لاتی تھی۔

لمغان کا علاقہ آندھیوں اور طوفانوں کا برف پوش علاقہ تھا۔ جے پال کی فوج ان دشواریوں میں چلنے کی عادی نہ تھی۔ لہٰذا ہاتھی، سپاہی اور گھوڑے اس برفانی اور پہاڑی علاقے کی سردی سے اکڑ کر مرنے لگے، اور جے پال کو اپنی طاقت اور فوج کی کثرت پر جو گھمنڈ اور غرور تھا وہ ٹوٹ گیا۔ اور اس نے امیر سبکتگین کے مقابلے میں بُری طرح شکست کھائی۔ اب جے پال نے سبکتگین سے اس کی طاقت و قوت کا اندازہ کر کے کہ اُسے شکست دینا غیر ممکن ہے، نہایت عجز و انکسار اور لجاجت کے ساتھ درخواست کی کہ اُس نے غزنی پر حملہ کر کے سخت غلطی کی ہے، اس کے لیے وہ اب معافی چاہتا ہے اور آئندہ کے لیے وعدہ کرتا ہے کہ تمام عمر آپ کا فرماں بردار اور اطاعت گزار غلام بن کر رہے گا۔ اس کے علاوہ جے پال نے یہ بھی کہا کہ معافی کے صلے میں وہ بے اندازہ سونا چاندی، جواہرات اور دس لاکھ درہم نقد، پچاس ہاتھی اور کئی ایک شہر اور سرحدی قلعے تاوان جنگ

کے طور پر ادا کرنے کے لیے تیار ہے اور وہ یہ تمام چیزیں پنجاب پہنچتے ہی حضور (بادشاہ) کے قابلِ اعتماد افراد کے ہاتھ حضور کی خدمت میں بھجوا دے گا اور میرے چند ایک امیر بطور یرغمال حضور کے پاس رہیں گے۔

جب امیر سبکتگین نے یہ تمام شرطیں خود جے پال کی زبانی سنیں تو ایک سچے مسلمان اور بہادر فاتح کی طرح جے پال کی لجاجت کا خیال کر کے اور اُس کے حال پر ترس کھا کر اُسے معاف کر دیا۔ اور جے پال کے کہنے کے مطابق اپنے چند ایک ساتھی اس کے ہمراہ کر دیے۔

اگرچہ اس موقع پر سلطان محمود غزنوی بہت کمسن تھا۔ مگر شجاعت اور بہادری کے ساتھ ساتھ فہم و فراست کا بہرۂ وافر بھی رکھتا تھا۔ وہ اس بات کے خلاف تھا کہ جے پال کو صرف معاف ہی نہ کیا جائے بلکہ اس کے ساتھ امیر کے چند ایک امرا بھی پنجاب چلے آئیں۔ سلطان محمود نے کہا جے پال نہایت مکار اور بڈھا عیار معلوم ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے اُس نے اپنی جان بچانے کے لیے چکمہ دیا ہو اس لیے بہتر یہ ہے کہ اپنے امرا کو جے پال کے ہمراہ نہ کیا جائے۔ لیکن امیر سبکتگین اس سے کہہ چکا تھا، اس لیے امیر سبکتگین نے اپنے کہے سے پھر جانا گوارا نہیں کیا اور اس کے ہمراہ اپنے آدمیوں کو جانے سے روک لینا مناسب نہ سمجھا۔

لیکن بدفطرت ہندو راجہ جے پال نے پنجاب پہنچتے ہی آخر وہی کیا جس کا سلطان محمود کو پہلے ہی سے خطرہ تھا۔ جے پال نے امیر سبکتگین کے امرا کو قید میں ڈال دیا اور نئے سرے سے پھر جنگ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اور ہندوستان کے تمام راجاؤں کو مسلمانوں کے خطرے سے ڈرا کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ اور انھیں اس

بات کا یقین دلا کر کہ ہندو مذہب کو مسلمانوں سے سخت خطرہ ہے اُن سے اُن کے خزانوں کے منہ کھلوا دیے۔ اجمیر، کالنجر اور قنوج کے راجاؤں نے روپے، پیسے، سازو سامان اور فوجی طاقت سے اُس کی دل کھول کر مدد کی مختصراً یہ کہ ۳۷۶ھ بمطابق ۹۸۶ء میں جے پال تین لاکھ پیادے، سوار سپاہ اور سینکڑوں جنگی ہاتھیوں کو لے کر آندھی اور طوفان کی طرح غزنی کی طرف بڑھا اور سبکتگین کو اس کی جنگی تیاریوں کا اُس وقت پتہ چلا جب وہ غزنی کی طرف کوچ کر چکا تھا۔

امیر سبکتگین اطلاع پاتے ہی ساٹھ ہزار سوار اور پیادہ فوج لے کر جے پال کے مقابلے کے لیے اُسی وقت چل کھڑا ہوا۔ وہ بمشکل تمام دارالسلطنت سے چند قدم آگے نکلا ہی تھا کہ جے پال کے لشکر نے آ لیا اور وہیں لمغان کے میدان میں پھر جنگ شروع ہو گئی۔ اگرچہ جے پال کی فوج بڑی بے جگری سے لڑی تاہم باطل چاہے تعداد و طاقت کے اعتبار سے کتنا ہی زیادہ ہو اُسے قوّت حق کے سامنے جھکنا ہی پڑتا ہے۔ بالآخر امیر سبکتگین نے اپنی تیغ خارا شگاف کے جب جوہر دکھائے تو جے پال کی فوج کے قدم اُکھڑ گئے۔ اور جے پال میدانِ جنگ سے بھاگ نکلا اور بے شمار سامانِ جنگ اور دوسری چیزیں اپنے پیچھے چھوڑ گیا مثلاً بے شمار گھوڑے، ہتھیار، اناج، نقد روپیہ، ہاتھی، کپڑے، خود اور جوتے حتّٰی کہ ان تمام اشیا کو سمیٹنے میں امیر سبکتگین کے سپاہیوں کو کئی دن لگ گئے اور ان تمام اشیا سے نہ صرف یہ کہ امیر سبکتگین کی جنگ کے گزشتہ اخراجات پورے ہو گئے بلکہ آئندہ جنگی تیاریوں کے لیے بھی بے پناہ ذخیرہ ہاتھ آ گیا۔

ظاہر ہے کہ اس مرتبہ اکیلے جے پال کو شکست نہیں ہوئی بلکہ اُس کے

تمام ساتھی راجوں مہاراجوں نے بھی منہ کی کھائی جو غزنی کی سلطنت کو اُبھرتا دیکھ کر اسے اپنے اور اپنے مذہب ہندو کے لیے سخت خطرہ سمجھتے تھے۔ اب تمام ہندوستان میں غزنی کی اسلامی حکومت کو مٹانے کے لیے پُرزور تحریکات شروع ہوگئیں اور مذہب کے نام پر اعلیٰ و ادنیٰ تمام ہندو متفق ہو کر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مرنے مارنے پر کمربستہ ہو گئے۔ ہندوؤں کا خیال تھا کہ اسلام اُن کے مذہب کے لیے ایک مستقل خطرے کی صورت اختیار کرتا جارہا ہے۔ اگر مسلمانوں کے اقتدار کی رفتار اسی نہج پر قائم ہوتی رہی تو کوئی دن جاتا ہے کہ سبکتگین ہندوستان کے دوسرے علاقوں پر بھی ضرور حملہ کر دے گا۔ چنانچہ جنگی تیاریوں کو مکمل کرنے کے لیے تمام ہندوؤں نے متفقہ طور پر فیصلہ کر لیا کہ وہ وقت آپڑنے پر کسی بڑے سے بڑے ایثار سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ اور چندے کی رقمیں لاکھوں سے اُوپر پہنچ گئیں حتیٰ کہ نادار و غریب عورتوں نے بھی چرخوں پر سوت کات کات کر چندے دیئے۔ اور تیر و تلوار کے علاوہ چرخہ کا نیا ہتھیار بھی مسلمانوں کے خلاف چلنا شروع ہو گیا۔

سلطان محمود اب تئیس ۲۳ برس کا ہو چکا تھا۔ امیر سبکتگین نے اسے خراسان کا گورنر مقرر کر دیا۔ اور پھر ایک سال کی مدت میں اُس نے اپنے زورِ بازو اور فضل ایزدی کی تائید سے سیستان کے علاقے پر بھی قبضہ کر لیا۔ یہ صورت دیکھ کر خلیفہ بغداد قادر باللہ عباسی نے اسے افغانستان، سیستان اور خراسان کی سند حکومت عطا کر دی اور یمین الدولہ اور امین السلطنت کے خطابات سے بھی نواز دیا۔ ہندوستان کے راجاؤں مہاراجوں کی طرف سے شکست کا انتقام لینے کے لیے ابھی جنگی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ سلطان کے پدر گرامی قدر امیر سبکتگین کا ۳۸۷ھ مطابق ۹۹۷ء میں انتقال ہو گیا۔ اسے غزنی ہی میں دفن کیا گیا۔ ۵۶ برس کی عمر پائی۔

فتوحات

تخت نشینی

سبکتگین کے مرنے کے بعد اس کا بڑا بیٹا اسماعیل آڑے آیا اور اس نے غزنی کی حکومت خود سنبھالنے کی کوشش کی۔ سلطان محمود نے بھائی سے سمجھوتہ کرنے کے لیے اُسے بلخ اور خراسان کے علاقے پیش کیے۔ مگر اسماعیل نہ مانا۔ آخر نوبت جنگ و جدل تک پہنچی۔ ہر چند دونوں کے لشکروں کی تعداد برابر کی تھی لیکن سپہ گری اور جنگی صلاحیت کے اعتبار سے سلطان محمود بڑھا ہوا تھا۔ چنانچہ اسماعیل نے شکست کھائی اور محمود نے بھائی کا لحاظ کرتے ہوئے صرف نظر بند کر دیا، جس سے مقصد فقط یہ تھا کہ وہ دوبارہ امن و امان کو تباہ نہ کر سکے اور سکون و اطمینان سے زندگی بسر کرے۔

سلطان محمود ستائیس برس کی عمر میں تخت نشین ہوا اور تینتیس برس تک کامیاب حکومت کی۔ ابتدا میں اُسے جن ناخوش حالات کا سامنا کرنا پڑا وہ اس کے ایک حوصلہ مند، جری اور بہادر ہونے کا پتہ دیتے ہیں۔ کیفیت یہ تھی کہ اس کے ایک طرف کاشغر میں ایلخانی خاندان کے مسلمانوں کی حکومت تھی۔ دوسری طرف خود اپنے آقا سامانیوں کی بخارا میں حکومت تھی جو اگرچہ اسلامی علم و ادب کی سرپرستی

کرنے میں بڑے مشہور تھے مگر اب رو بہ زوال تھے۔ تیسری طرف ملیوں اور طبرستان کے آل زیاد کی حکومت تھی اور چوتھی طرف غوریوں کی حکومت۔ غرض وہ ہر طرف سے گھرا ہوا تھا اور ہر خاندان یہی چاہتا تھا کہ غزنی اُسی کے حدودِ سلطنت میں شامل ہو جائے۔ ایسے حالات میں جبکہ علیحدہ علیحدہ مسلمان ریاستیں اُس کی طرف لپک رہی تھیں اس پر مستزاد یہ ہے کہ جے پال اب توسیع سلطنت کے خواب دیکھ رہا تھا اور خیال کرتا تھا کہ محمود جو ابھی حکومت کے کاروبار کو چلانے کا بہت کم تجربہ رکھتا ہے اور چاروں طرف سے حریفوں میں گھرا ہوا ہے۔ اب ہند کی طاقت کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔ چنانچہ ۳۹۱ھ ۱۰۰۱ء میں فوجیں لے کر جے پال غزنی پر پھر حملہ آور ہوا۔ اس مرتبہ جے پال کے ہمراہ بارہ ہزار سوار تیس ہزار پیادے اور تین سو ہاتھی تھے۔ وہ دریائے سندھ کو پار کرتے ہوئے پشاور کی طرف بڑھ گیا۔ ادھر محمود بھی بمشکل تمام دس ایک ہزار فوج لے کر پشاور کی طرف چل پڑا۔ پشاور کے قریب ایک میدان میں دونوں فوجیں صف آرا ہوئیں۔ گھمسان کا رن پڑا۔ بالآخر جے پال کی فوجیں بری طرح پسپا ہوئیں جس میں سے پانچ ہزار سپاہی مارے گئے اور جے پال سمیت پندرہ بڑے بڑے سورما ذلیل ہو کر پکڑے گئے اور باقی فوج ساری کی ساری جنگی ساز و سامان چھوڑ کر لاہور کی طرف بھاگ نکلی۔

سلطان محمود جنگی قیدیوں کو لے کر غزنی چلا گیا، جہاں جے پال نے بڑی لجاجت اور خوشامد سے جاں بخشی کی درخواست پیش کی اور نہایت عجز و انکسار سے وعدہ کیا کہ اگر اس مرتبہ مجھے پھر معاف کر دیا جائے اور میری آخری غلطی

بھی نظر انداز کر دی جائے تو میں تمام عمر آپ کا احسان مند رہوں گا۔ اور شکر گزاری کے طور پر خراج کی رقم باقاعدہ ادا کرتا رہوں گا۔ اس کے علاوہ پنجاب کو غزنی کا صوبہ خیال کرتے ہوئے آپ کی طرف سے اپنے آپ کو گورنر متصور کروں گا۔

سلطان محمود ابھی جوان تھا، صاحب دل، بلند حوصلہ، عالی ظرف اور بہادر تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک سچا مسلمان سپہ سالار تھا۔ بالآخر اُس نے جے پال ایسے عیّار بڈھے راجہ کی باتوں پر اعتبار کر کے اُسے چھوڑ دیا۔

جے پال نے رہائی پانے کے بعد اگرچہ غزنی پر پھر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کی تاہم اپنے آپ کو زندہ چتا کے حوالے کر کے، اور جل مرنے سے ہندو قوم میں اس روایت کی طرح ضرور ڈال دی کہ بے شک جان سے چلے جاؤ لیکن اپنے قول و قرار کا کبھی پاس اور لحاظ نہ کرو۔ بالخصوص مسلمانوں سے تو ہمیشہ عہد شکنی کرتے رہو۔

ہر چند جے پال پنجاب کا راجہ تھا لیکن وہ ایک بیٹے کا باپ بھی تھا۔ اسے گوارا نہ تھا کہ اُس کا بیٹا انند پال مسلمانوں پر حملہ کر کے سلطان محمود غزنوی کی تلوار سے ذبح ہو۔ وہ سلطان کی قوت اور بہادری کا پورا پورا اندازہ کر چکا تھا اس لیے انند پال کو چتا میں جل کر مرنے سے پہلے یہ وصیت کرتا گیا کہ وہ سلطان محمود کے خلاف کوئی قدم نہ اُٹھائے اور خراج کی رقم اُسے باقاعدہ طور پر ادا کرتا رہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ خود جل مرنے سے اُس نے مسلمانوں کے خلاف نفرت کا ضرور بیج بو دیا اور اس بات کی مؤثر کوشش کی کہ ہندو قوم جہاں تک بن پڑے مسلمانوں کو کبھی چین سے بیٹھنے کا موقع نہ دے۔

اگرچہ انند پال ظاہری طور پر سلطان محمود کا باج گزار بن گیا لیکن باطنی طور پر مسلمانوں کے خلاف سازشوں کے جال بُننے اور اُن کے راستے میں کانٹے بچھانے میں برابر لگا رہا۔ ہندوؤں کے نزدیک چونکہ جے پال کی خودکشی قوم کی عزّت اور آزادی کا درجہ قائم رکھنے کے لیے "بلیدان" یعنی قربانی یا شہادت کا درجہ حاصل کر گئی اس لیے ہندوؤں میں انند پال کی بڑی عزّت و توقیر تھی اور وہ اس کے ایک ادنیٰ سے اشارے پر کٹ مرنے کو اپنے لیے سعادت کا باعث جانتے تھے اور جس حکمت عملی یا ڈپلومیسی کو انند پال وضع کرتا تھا اُسے برابر قائم رکھتے تھے۔ چنانچہ اب انند پال نے مسلمانوں کو براہِ راست زک پہنچانے کے بجائے ہر ایسے گروہ، جماعت یا فرقے کی حمایت کر کے بالواسطہ نقصان پہنچانے کی مہم شروع کر دی، جو سلطان محمود کے اُس کی قوم کے اُس کی سلطنت اور اُس کے دین کے خلاف ہو۔ چنانچہ اس سلسلے میں قرامطیوں کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، جن کے استیصال کے لیے سلطان محمود کو بار ہا معرکہ آرائی کرنی پڑی۔

قرامطیوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بظاہر تو مسلمان تھے لیکن بباطن بانی فرقہ عبداللہ ابن میموں کی وضع کردہ پالیسی کے مطابق مسلمانوں کو جھوٹ موٹ کے مسلمان بن کر دھوکہ دیتے تھے۔ مثلاً وہ کہتے تھے نیکی اور بدی کوئی شے نہیں۔ اس لیے نہ اس کی کوئی جزا ہے نہ سزا۔ زندہ رہو اور عیش کرو۔ حرام و حلال سب ڈھکوسلے ہیں۔ جو ہاتھ لگے سب کھاؤ پیو اور مزے کرو۔ مؤرخوں نے لکھا ہے کہ درحقیقت یہ فرقہ عیسائی مبلغوں کی ایک سازش تھا اور اس کے

ذریعے اسلام اور مسلمانوں کی تخریب و بربادی مقصود تھی۔ ہندوؤں کو چونکہ اسلام اور مسلمانوں سے نفرت تھی۔ لہٰذا سلطان محمود جب معرکہ پنجاب سے فارغ ہو کر اپنے ملکی انتظامات میں مصروف ہوا تو قرامطیوں نے تین سال کی مدت میں ہندوؤں کی درپردہ حمایت سے خوب قدم جما لیے اور اس کے بعد قرامطیوں نے سلطان محمود کے خلاف ہندوستان کے شمال و مغرب میں سازشوں کے جال پھیلانے شروع کر دیے۔

قرامطیوں کے کارناموں کا مختصراً حال یہ ہے کہ وہ اصل کے اعتبار سے ایک ایرانی فرقہ ہے۔ جے پال کے زمانے میں وارد ہند ہوا۔ اور انند پال کے زمانے میں تقویت پائی۔ قرامطیوں نے ۲۹۰ھ میں شام کے مسلمانوں کو تباہ و برباد کیا۔ حتّٰی کہ ۳۱۱ھ میں کوفہ اور بصرہ کو خوب لوٹا اور ایک بدقماش آدمی ابوطاہر کو خلیفہ بنا کر مکہ کے شہر پر قبضہ کر لیا اور خانہ کعبہ سے مشہور تاریخی پتھر، حجرِ اسود کالا پتھر، اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے، جو پورے بیس برس تک اُن کے پاس بصرے میں پڑا رہا۔ آخر کار ان پر عذابِ الٰہی آیا اور ان کا بیشتر حصہ ہلاکو خاں اور منگو خاں کی تلواروں کی نذر ہو گیا، مگر کچھ لوگ جان بچانے میں کامیاب ہو گئے۔ اور ایران سے بھاگ کر سندھ اور بلوچستان میں آ کر آباد ہو گئے۔ اور یہیں انھوں نے اپنے فرقے کی تحریک دوبارہ جاری کی جے پال اور سندھ کی ریاست بھاٹنہ سے مل کر منصورہ اور ملتان وغیرہ مسلمان ریاستوں کو ختم کیا۔ اب اس کے بعد قرامطیوں نے سلطان محمود کو نشانہ بنایا۔ چنانچہ تمام ہندو راجے کہ سلطان محمود کے زخم خوردہ تھے اور جے پال زندہ جل کر مر چکا تھا اور اس کی خودکشی کو ہندوؤں

نے ایک قومی مسئلہ بنالیا تھا۔ لہٰذا اسلام اور مسلمانوں کی تباہی کے لیے دل و جان سے اُن کے ساتھ ہو گئے۔

ہر چند سلطان محمود اپنے ملکی مہمات میں مصروف تھا۔ تاہم اُسے بیرونی دنیا کی خبریں برابر پہنچ رہی تھیں۔ اُسے جب معلوم ہوا کہ ہندوؤں نے قرامطیوں سے گٹھ جوڑ کر کے پھر طبل جنگ بجانے کا ارادہ کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ قرامطیوں نے اپنے مرکزی مقام بحرین سے ایک جماعت جہازوں میں بٹھا کر دیبل اور ٹھٹھ روانہ کی ہے۔ نیز سندھ کے راجاؤں سے بھی امداد حاصل کرنے کے لیے معاہدے کر لیے ہیں اور ریاست بھاتنہ کا راجہ اور ملتان کا حاکم داؤد بن نصر قرامطی جس کا دادا حمید خاں لودھی قرامطی تھا جس نے کسی زمانے میں ملتان کو تباہ و برباد کیا تھا۔ اس سلسلے میں خاص طور پر پیش پیش ہے۔ تو سلطان محمود غزنوی نے قرامطیوں اور اُن کے بہی خواہ ہندوؤں کو کچل ڈالنے کا ایک بار پھر تہیہ کر لیا۔

اگرچہ جے پال نے قرامطیوں کو اپنے یہاں داخل نہ ہونے دیا۔ تاہم اُن کی مدد ضرور کی۔ قرامطیوں کا اصل مرکز چونکہ بھاتنہ اور ملتان تھا اس لیے سلطان محمود نے بھاتنہ کے راجے کو لکھ بھیجا کہ تم جب ہمارے باج گزار ہو۔ پھر ہمارے دشمن قرامطہ سے کیوں میل ملاپ رکھتے ہو اور کیوں اپنے یہاں انھیں پناہ دیتے ہو۔ لیکن راجہ نے سلطان کو اس کا نہایت درشت جواب دیا۔ اور قرامطہ کی حمایت کی۔ جس پر سلطان کے لیے اب لازم ہو گیا کہ وہ بھاتنہ کے راجہ بج رائے کا مزاج سنبھال کرنے کے لیے جلد آگے بڑھے۔ چنانچہ ۳۹۵ھ ۱۰۰۴ء میں راجہ بھاتنہ (بھیرہ) اور سلطان محمود کے درمیان پھر معرکہ آرائی ہوئی جس میں راجہ

نے شکست فاش کھائی اور بھاگ نکلا۔ مگر پھر ذلت کے خوف سے خود ہی اپنے سینے میں خنجر گھونپ کر ملکِ عدم کی راہ لی۔ سلطان اس معرکے سے فارغ ہو کر بھیرہ (بھاٹنہ) اور اُس کے مضافات کو غزنہ کی سلطنت میں شامل کر کے ملتان کی طرف بڑھا اور چاہا کہ داؤد بن نصر حاکمِ ملتان کو راجہ بھاٹنہ کی ناکام مدد کرنے کے جرم کی سزا دے۔ انند پال فوجیں لے کر اس کی مدد کو آگیا۔ لیکن جب معرکہ آرائی ہوئی تو وہ بھی اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلا اور میدانِ جنگ سے بھاگ نکلا۔ اور داؤد بن نصر قرامطی نے اطاعت کا اقرار کر کے معافی مانگ لی اور تاوان کا وعدہ کیا۔

اس معرکے سے جب فراغت ہوئی تو انند پال کے بیٹے سکھ پال جس نے اسلام قبول کر لیا تھا، اُسے بھیرے (بھاٹنہ) کا گورنر مقرر کر دیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد وہ اسلام کے دین سے پھر گیا (مرتد ہو گیا) اور بھید کھلا کہ سکھ پال نے صرف حکومت سنبھالنے اور سلطان کو دھوکہ دینے کے لیے اسلام قبول کرنے کا ڈھونگ رچایا تھا۔ چنانچہ اُس کی سرکوبی کے لیے سلطان کو ۳۹۸ھ ۱۰۰۸ء میں پنجاب میں پھر آنا پڑا۔ سکھ پال کو گرفتار کیا اور حبسِ دوام کی سزا دی۔

انند پال کا خبث باطن ابھی تک ظاہر نہیں ہوا تھا اس لیے سلطان اُسے اپنا باج گزار سمجھتے ہوئے اس سے مطمئن رہا۔ لیکن اب حاکمِ ملتان کی مدد کے لیے سلطان کے خلاف کھلم کھلا فوجیں لے کر آنے سے واضح ہو گیا۔ نیز ایک طرح سے انند پال کے اس اقدام نے سلطان کو دعوتِ جنگ دے دی۔

لہٰذا لازم ہو گیا کہ سلطان اس پر چڑھائی کرے۔ ادھر انند پال بھی سمجھتا تھا کہ اب اس کی خیر نہیں اُس نے سیاست سے کام لیتے ہوئے مذہب کے نام پر ہندوؤں کے بچّے بچّے کو سلطان کے خلاف اکسانا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ ساری ہندو قوم سلطان کے خون کی پیاسی ہو گئی اور جنگ کی تیاریوں میں حب الوطنی کے عام جذبے سے اس قدر بڑھی کہ مرد تو مرد رہے عورتوں تک نے اپنے زیور بیچ کر، چرخے کات کر اور محنت مزدوری کر کے جنگی اخراجات پورے کیے۔ اس کے علاوہ کالنجر، قنوج، اُجین اور گوالیار کی ریاستوں نے بھی اُس کا ساتھ دیا اور اُسے ایک مقدّس مذہبی لڑائی گردانتے ہوئے انند پال نے فوجوں کی روپے پیسے سے خوب دل کھول کر مدد کی۔

سلطان محمود غزنوی کے خلاف تمام ہندوؤں کے مشترکہ محاذ قائم ہونے کا یہ دوسرا موقع تھا۔ اس مرتبہ تمام بھارتی فوجوں کی کمان انند پال کے بیٹے برہمن پال کے ہاتھ میں تھی۔ آخر ۳۹۹ھ ۱۰۰۸ء میں سلطان محمود اور انند پال کی فوجوں کے درمیان اٹک کے قریب حضرو کے مقام پر پھر معرکہ آرائی ہوئی جس میں سلطان کے بہت سے آدمی مارے گئے لیکن جب خود سلطان نے انند پال کے تیس ہزار کھوکھر (راجپوت) سپاہیوں پر ایک نئے انداز سے بجلی کی طرح لپک کر حملہ کیا تو اُن میں بھگدڑ مچ گئی۔ ہزاروں سپاہی قتل ہو گئے اور جو کسی طرح بچ رہے وہ میدانِ جنگ چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ انہی میں سے ایک انند پال کا ہاتھی بھی تھا، جو اپنے ہی سپاہیوں کو روندتا ہوا انند پال کو کسی طرف لے بھاگا اور پھر ایسا غائب ہوا کہ آج تک اُس کا تاریخوں میں کہیں سراغ نہ مل سکا۔

سلطان محمود غزنوی نے فتح پانے کے بعد انند پال کے بیٹے لچھن پال (تری لوچن پال) کو لاہور (پنجاب) کی حکومت پر بحال رہنے دیا۔ صرف اتنا کیا کہ اُسے اپنا باجگذار بنا لیا۔ اور غزنی واپس چلا گیا۔ اس جنگ میں سلطان کو بہت سے بیش بہا خزانے اور بکثرت مال غنیمت ہاتھ آیا۔ اس کے علاوہ بہت سے جواہرات بھی ہاتھ آئے جو مندروں کی مورتیوں کے اندر پائے گئے۔

باوجود اس فیّاضی کے سلطان نے شکست خوردہ دشمن کو پھر لاہور (پنجاب) کے تخت پر ایک، باجگذار کی حیثیت سے بٹھا دیا اور اس سے کوئی تعرض نہ کیا۔ لیکن بدباطن ہندوؤں کے دلوں سے اس پر بھی اسلام دشمنی اور بغض و حسد نہ گیا۔ چنانچہ ہندوؤں کی قدیم ریاست کانگڑہ نے جس میں کانگڑہ، ہوشیارپور اور جالندھر وغیرہ کے علاقے شامل تھے۔ سلطان کے خلاف لڑنے کے لیے پھر منصوبے قائم کر لیے۔ جے پال کے زمانے میں یہاں کا راجہ چونکہ اُس کا باجگذار تھا اس لیے جے پال کو جب کبھی سلطان کے خلاف معرکہ پیش آتا تو کانگڑہ کے سپاہی اُس کی مدد کے لیے ہتھیار لے کر نکلتے اور سلطان کے خلاف لڑتے اور جب شکست ہوتی تو سلطان کے خلاف سخت غم و غصہ اور بغض و حسد لے کر واپس آتے۔ اب اُن کے سینوں میں بغض و حسد کی چنگاریاں سلگتے سلگتے اُس جوالا مکھی مندر کے شعلوں سے بھی اونچی نکل گئیں جو کانگڑہ کی پہاڑی پر ہندوؤں کے نہایت مضبوط قلعے کے قریب ہی واقع تھا اور تقدّس کا درجہ رکھتا تھا اور اس کے پاس ہی نگر کوٹ کا شہر واقع تھا جس کی تمام کاشت کے لائق زمین مندر کے پجاریوں اور پنڈتوں کے اخراجات کے لیے وقف تھی۔ سلطان محمود نے انھیں بھی آمادۂ جنگ پایا تو ۴۰۱ھ سنہ ۱۰۱۰ء میں پھر فوج لے کر

نگرکوٹ کے مقام پر راجپوت فوجوں سے نبرد آزما ہوا جس میں راجپوتوں نے شکست کھائی اور پجاریوں اور پنڈتوں نے گڑگڑا کر جان کی امان مانگی، جسے سلطان محمود ایسے نیک دل فاتح نے بہ طیب خاطر قبول کر لیا۔ اور اُن کے ساتھ نہایت فیاضی کا سلوک کیا۔

لیکن بدفطرت ہندوؤں کا چلن بڑا عجیب و غریب واقع ہوا ہے وہ بار بار مار کھانے اور معافی مانگنے کے باوجود بھی اپنی عادت سے باز نہیں آتے انھیں ذرا بھی موقع ملتا سلطان کے خلاف پھر منصوبے قائم کر لیتے اور مذہب کے سہارے تمام لوگوں کی ہمدردیاں پھر حاصل کر لیتے چنانچہ سنہ ۴۰۱ھ، سنہ ۱۰۱۰ء ہی میں پھر یہی سلطان کو معاملہ پیش آیا۔ اس مرتبہ ہندوؤں نے براہِ راست حملہ کرنے کی بجائے ملتان کے حاکم داؤد بن نصر قرامطی کو سلطان کے خلاف پھر اُکسایا جس کے نتیجے میں سلطان پھر آیا اور ملتان کی قرامطی حکومت کو ختم کر دیا اور حاکم کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گیا اور قید خانے میں لے جا کر ڈال دیا۔

ابھی کوئی دو تین سال گزرنے پائے تھے کہ تھانیسر کی جنگ پیش آ گئی۔ بالآخر سلطان کو دشمنوں کا پیچھا کرنے کے لیے سنہ ۴۰۶ھ سنہ ۱۰۱۵ء میں آگے بڑھنا پڑا پھر کشمیر کی مہم پیش آئی۔ کشمیر کا راجہ سنگرام جو سمجھتا تھا کہ سلطان کے خلاف پنجاب کے راجہ کی معرکہ آرائی ایک مذہبی جنگ ہے اور وہ اسی اعتبار سے راجہ کی مدد کو پہنچتا تھا وہ باوجود ہزار شکستوں کے ابھی تک ذہنی طور پر شکست کو شکست نہیں سمجھتا تھا۔ چنانچہ سلطان نے آتے ہی راجوری (کشمیر) کے قریب ایک قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ مگر برفباری کے باعث اسے کامیابی نہ ہو سکی۔ قصہ مختصر یہ کہ ہندوؤں نے چین سے نہ بیٹھنے بٹھانے کی جو قسم کھا رکھی تھی اس کے سبب سلطان کو غزنی سے بار بار

آنا پڑتا تھا۔ رہا یہ کہ سلطان یہاں خود کیوں نہیں ٹھہرتا تھا تو اس کا جواب یہ ہے ملکی فتوحات کے شوق میں نہیں آتا تھا، بلکہ جب ہندو قوم اپنے مذموم اور ناپاک ارادوں سے اُسے مجبور کر دیتی تھی تو اُسے چاروناچار دفاع کے لیے نکلنا پڑتا تھا۔ بصورت دیگر سلطان کا یہ اقدام اگر توسیع مملکت کے شوق میں ہوتا تو وہ ہرگز یہاں سے واپس نہ جاتا اور نہ فتح یاب ہو کر مغلوب دشمن انند پال کے بیٹے ترنی لوچن پال کو تخت پر بٹھاتا۔

لیکن بایں ہمہ سلطان محمود کی مخالفت میں نہ صرف پنجاب بلکہ سارا ہندوستان پیش پیش رہا۔ شمالی ہند کی کئی راجپوت ریاستیں اُس کے خلاف کئی مہمات میں باقاعدہ حصہ لیتی رہیں تو اُن کی نظر میں سلطان کا ایک سچا مسلمان ہونا اور غزنی کی اسلامی حکومت کا دن بدن ترقی پکڑتے چلے جانا کسی قیمت پر بھی نظر انداز کیے جانے کا لائق نہ تھا وہ اسے اپنی ذات اور اپنے مذہب کے لیے سخت خطرہ سمجھتی تھیں۔ یہی سبب ہے کہ سلطان کو اُن کا سر کچلنے کے لیے بار بار آنا پڑتا تھا۔ مگر افسوس نام نہاد مورخوں نے بغیر تحقیق و تلاش اور تفحص کیے سلطان کو صرف تعصّب کی راہ سے ہدفِ ملامت بنایا ہے اور سلطان کے خلاف اس قدر کذب و فریب کی راہیں کھولی ہیں کہ اُن سے متاثر ہو کر بعض فن تاریخ سے ناآشنا مسلمان بھی انہی راہوں پر چلنے لگے اور اُن کے ہم نوا بن گئے۔ افسوس انھوں نے یہ نہ جانا کہ ہندوؤں نے سلطان محمود کے مجاہدات کو جو لوٹ مار کی مہمات قرار دیا ہے۔ اس میں صرف اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مذہبی دشمنی کے جذبات کارفرما ہیں حقائق سے ان کا دُور کا بھی تعلق نہیں۔ پھر اس کے بعد انگریزوں نے بھی جو

اس معاملے میں ان کی ہم نوائی کی ہے اس میں بھی وہی جذبات کار فرما ہیں جس میں ایک طرف تو مذہبی دشمنی ہے۔ دوسری طرف سیاسی مصلحت یعنی انگریزوں نے سلطنت ہند کے مسلمانوں ہی سے چھینی تھی۔ اس لیے مصلحت اسی میں تھی کہ حکومت کی فضا کو سازگار کرنے کے لیے ہندوؤں کی ہم نوائی کی جائے اور ان کے مقابلے میں مسلمانوں کو ہر معاملے میں پیچھے دھکیل دیا جائے۔ حتیٰ کہ ان کی زرّیں تاریخ کے دلکش نقوش اتہامات کی سیاہی سے داغدار کر دیے جائیں۔

رسّی جل گئی پر بل نہ گیا، کے بمصداق شمالی ہند کی ریاستیں بدستور اس فکر میں تھیں کہ جیسے تیسے بن پڑے سلطان کو ختم کر دیا جائے اور اس کی سلطنت غزنی اُن کی لونڈی بنے۔ بالآخر سلطان نے بھی طے کر لیا کہ ایک ایک کر کے تمام ریاستوں کو فتح کر لیا جائے کہ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ چنانچہ ۴۰۹ھ (۱۰۱۸ء) میں سلطان نے دریائے جمنا کو پار کر کے برن (بلند شہر) پر حملہ کیا اور یہاں کے راجہ نے جلد ہی سلطان کی اطاعت کر لی۔ اس کے علاوہ سلطان محمود غزنوی علیہ الرحمہ کے ہاتھ پر اپنے دس ہزار آدمیوں سمیت مسلمان بھی ہو گیا۔ اس کے بعد سلطان نے متھرا پر فتح پائی۔ پھر قنوج کا رُخ کیا، جہاں راجپوتوں کی بے حد طاقتور اور ایک عظیم الشان ریاست قائم تھی۔ والیٔ قنوج راج پال تیس ہزار سوار اور پانچ لاکھ پیادہ فوج لے کر مقابلہ پر آیا۔ مگر آتے ہی منہ کی کھائی اور گرفتار ہو گیا۔ سلطان نے اس کے اقرارِ اطاعت اور خراج ادا کرنے کے وعدے پر اسے چھوڑ دیا۔

مگر شمالی ہند کے دوسرے راجاؤں نے والیٔ قنوج کے معافی مانگنے

اور اطاعت وخراج کے ادا کرنے کا اقرار کرکے رہائی پا لینے کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا۔ وہ اسے اپنی توہین کے مترادف سمجھتے تھے۔ چنانچہ کالنجر کے راجہ گنڈا نے راج پال کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے اُس پر حملہ کرکے قتل کر ڈالا۔ راج پال چونکہ سلطان محمود کا باجگزار تھا اس لیے اُس کے قتل کرنے کا صاف مطلب یہ تھا کہ راجپوتوں نے اپنی شکست کو تسلیم نہیں کیا تھا بلکہ سلطان کی غیرت کو للکارا تھا۔ لہٰذا راجپوتوں کے غرور و سرکشی کا جواب دینا اور آقا ہونے کی حیثیت سے راج پال (جو سلطان کا باجگزار تھا اُس) کا انتقام لینا، سلطان کے لیے ضروری ہوگیا۔ چنانچہ سلطان نے واقعہ کی اطلاع پاتے ہی کالنجر پر چڑھائی کردی۔ ہر چند کالنجر و گوالیار اور دوسری کئی ایک راجپوت ریاستوں کی فوجوں نے متحد ہوکر سلطان کی فوج کا مقابلہ کیا۔ لیکن فتح اُن کے مقدر میں نہیں تھی۔ چنانچہ انھیں شکست فاش ہوئی اور میدانِ جنگ سے بھاگ نکلیں۔

اب سلطان محمود نے سنجیدگی کے ساتھ غور کیا کہ اہلِ ہند شکست پر شکست کھانے کے باوجود کیوں چین سے نہیں بیٹھتے، کیوں بار بار سرکشی و بغاوت پر آمادہ ہوتے ہیں۔ اور فوجیں لے لے کر حملے کرتے ہیں۔ بالآخر سلطان اس نتیجے پر پہنچا کہ پنجاب کا حکمران ہی اس تمام فتنہ و فساد کی جڑ ہے۔ قصّہ یہ تھا کہ پنجاب کا حکمران اس قدر احسان فراموش تھا کہ اُسے سلطان کے خلاف سازشیں کرنے اور دوسری راجپوت ریاستوں کو جنگ وجدل پر آمادہ کرنے میں کبھی شرم وحیا اور غیرت نہیں آئی۔ پھر وہ ڈھیٹ بھی اتنا تھا کہ ہر شکست کے بعد اطاعت قبول کرنے اور معاف کیے جانے کی درخواست پیش کردیتا۔ اور

سلطان ازراہ ترحم اسے نہ صرف معاف کر دیتا بلکہ پنجاب کی حکومت بھی اسی کو پھر سونپ دیتا۔ اب حاکم پنجاب کی ریشہ دوانیاں اور سازشیں حد سے گزر گئیں۔ قنوج اور کالنجر کی لڑائیوں میں بھی زیادہ تر اسی کی سازشوں کا دخل تھا۔ اب (ترلوکن پال) پچھمن پال مر چکا تھا اور اس کا بیٹا راجہ بھیم پنجاب کا حاکم تھا۔ آخر کار سلطان نے اس کی بڑھتی ہوئی حرکتوں کو دیکھ کر پنجاب کی علیحدہ حکومت ختم کر کے اسے غزنی کا ایک صوبہ بنا لیا۔ حاکم پنجاب راجہ بھیم پال سلطان محمود سے شکست کھانے کے بعد بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور اجمیر کے راجہ رائے اجمیر کے پاس پہنچ کر ۴۱۷ھ، ۱۰۲۶ء میں مر گیا۔

سلطان محمود نے پنجاب کا پہلا مسلمان (حاکم) گورنر اپنے مشہور عالم وفادار غلام ایاز کو مقرر کیا اور لاہور دارالحکومت قرار پایا۔ اور یہاں فوجی چھاؤنیاں قائم کی گئیں تاکہ اسلامی فوجوں کو ضرورت کے موقع پر آگے بڑھنے میں آسانی رہے سلطان محمود کے تمام تر مجاہدات خود ہندوؤں (راجپوت راجاؤں) ہی کے زعم باطل کی چھیڑ چھاڑ پر مبنی ہیں۔ ورنہ ایک سلطان محمود فاتح کیا دنیائے اسلام کے تمام فاتحین اسلامی تعلیمات کی تربیت کے طفیل ہمیشہ امن پسند، صلح کل، منصف مزاج اور عدل پرور ثابت ہوئے ہیں۔

۴۱۳ھ، ۱۰۲۱ء میں لاہور پر ایاز کی حکومت قائم کرنے کے بعد ۴۱۴ھ، ۱۰۲۱ء میں سلطان نے گوالیار اور کالنجر پر بھی قبضہ کر لیا۔ پھر اس کے بعد آخر میں سومنات کے مندر کی مہم سر کرنے کا وہ مشہور واقعہ ۴۱۶ھ، ۱۰۲۵ء میں پیش آیا جس کی فتح نے ثابت کر دیا کہ سلطان محمود ایک سچا مسلمان اور

بُت شکن فاتح تھا۔ یہ مندر کاٹھیاواڑ گجرات کے ایک شہر سومنات میں واقع ہے۔ اور اسی مناسبت سے سومناتھ مندر کے نام سے مشہور ہے۔

کہا جاتا ہے کہ سومناتھ کا مندر سلطان محمود کے پہلے حملے سے ایک سو برس پہلے سمندر کے کنارے پر تعمیر ہوا تھا۔ اور سمندر کی موجیں لہریں اس سے آ آ کر ٹکراتی تھیں اور جس سے ہندوؤں نے یہ عقیدہ قائم کر لیا کہ یہ مندر اس قدر مقدّس ہے کہ خود جل ماتا (سمندر کی) لہریں اس کا منہ دھلانے یا غسل (اشنان) کرانے آتی ہیں۔ پھر جوں جوں وقت گزرتا گیا اس مندر کے تقدّس کی عجیب وغریب روایات سارے ہندوستان میں دور دور تک پھیل گئیں اور مختلف راجپوت حکومتوں کی طرف سے اس کے انتظامات کے لیے گراں قدر نذرانے اور بھاری بھاری ہدیے آنے لگے۔ حتّٰی کہ سلطان محمود غزنوی کے حملے کے وقت اس مندر میں بے شمار دولت تھی اور دس ہزار گاؤں اس کے اخراجات کے لیے وقف تھے۔ مندر کی دیکھ بھال اور پوجا پاٹ کے لیے ایک ہزار برہمن ملازم تھے اور پانسو نوجوان رقاصہ تھیں جو مندر کے سامنے پجاریوں کی ضیافت طبع اور بتوں کی خوشنودی کے لیے دن رات محوِ رقص رہتی تھیں۔

ہندوؤں کا خیال تھا کہ جو شخص سومناتھ کے مندر پر حملہ کرنے کی کوشش کرے گا وہ وہیں بھسم ہو کر رہ جائے گا۔ رہے وہ منادر جو سلطان محمود کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوئے۔ اُن کے بارے میں ہندوؤں کا خیال تھا کہ اُن سے چونکہ سومناتھ دیوتا خفا تھے اس لیے انھیں سلطان محمود کے ہاتھ سے بچانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ یہ ساری توہمات کی باتیں سلطان محمود چونکہ سن چکا تھا، اس لیے جب کبھی اس

کی راہ میں کوئی مندر، بُت خانہ آیا۔ اُس نے ہندوؤں کے معتقدات باطلہ پر ضرب کاری لگانے کے لیے اُسے ڈھا دیا۔ ورنہ صرف مٹی کے بے حس وحرکت گھروندوں اور مجسموں کو توڑنے اور مندروں کے در و دیوار کے ڈھا دینے میں کیا رکھا تھا؟ مقصود یہ تھا کہ ہندوؤں پر جھوٹے خداؤں کا جو طلسم بندھا ہوا ہے اُسے توڑ دیا جائے۔ چنانچہ اب جو ہندوؤں نے سومناتھ کے مندر کی تقدیس وطہارت کے قصے پھیلانے شروع کیے اور سلطان کو اپنے دیوتاؤں کے ناراض ہونے کی دھمکیاں دینا شروع کیا تو سلطان کا خدا کی راہ میں جہاد کرنے کا شوق پہلے سے بھی سوا ہو گیا۔ چنانچہ سلطان تیس ۳۰ ہزار سے کچھ اُوپر فوج لے کر سومناتھ کی فتح کے لیے چل کھڑا ہوا۔

راستے میں جتنے ایک چھوٹے موٹے قلعے آتے گئے۔ اُن سب کو فتح کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ سومناتھ کے مندر تک پہنچتے پہنچتے سلطان کو بیسیوں معرکے سر کرنے پڑے، جن میں کم و بیش کوئی بیس ایک ہزار ہندوؤں سے معرکہ آرائی ہوئی۔

سومناتھ کی مندر کی حفاظت کے لیے ہندوستان کے تمام راجے اور مہاراجے اپنی اپنی فوجیں لیے پہلے سے موجود تھے اور جم غفیر اُن ہندوؤں کا بھی موجود تھا جو تماشائی کے طور پر آئے تھے اور سمجھتے تھے کہ سومناتھ بُت نے سلطان محمود کو سزا دینے اور تباہ و برباد کرنے کے لیے یہاں بلایا ہے۔ چنانچہ وہ ۶ جنوری ۱۷ ۴۱۷ھ ۱۰۲۶ء میں سومناتھ کے میدان میں پہنچ گیا اور دوسرے دن جمعہ کی نماز سے پہلے پہلے قلعہ سومناتھ کا محاصرہ کر لیا اور تیروں کا ایسا مینہ برسایا کہ قلعے کی مضبوط آہنی دیوار توڑ لیے

میں کامیابی حاصل کرلی۔ اس کے بعد نماز جمعہ ادا کرنے تک مزید کارروائی ملتوی کردی۔

اس دوران میں ہندوؤں نے بہت ہاتھ پیر مارے، مندر میں گئے بتوں کے سامنے گڑگڑا کر روئے اور پھر ایسے جوش وخروش کے ساتھ حملہ کیا کہ مسلمان پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوگئے۔ لیکن جب سلطان نے پھر انداز بدل کر حملہ کیا اور فرزندان توحید کے لہو کو گرمایا تو مسلمانوں نے سنبھل کر ایسا بھرپور حملہ کیا کہ سومناتھ کی فوجیں حملے کی تاب نہ لا کر میدان جنگ سے بھاگ نکلیں اور سلطان محمود نے کمال شجاعت سے آگے بڑھ کر قلعہ پر قبضہ کرلیا۔ اس جنگ میں سومناتھ بت کے پچاس ہزار متوالے ہندو سپاہی قتل ہوئے۔ اب اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب مقتولین کی تعداد اتنی ہے تو اُن کی فوجوں کی تعداد کتنی ہوگی۔

اب سومناتھ کی فتح کے بعد سلطان کے دل کی مراد پوری ہونے کا موقع آیا وہ ایک سچے مسلمان کی طرح مندر کی طرف بڑھا۔ مندر کے پجاری اُس کے ارادے کو بھانپ گئے اور آگے بڑھ کر التجا کی کہ سومناتھ کے بت کو مسمار نہ کیا جائے وہ اس کے لیے بڑی سے بڑی رقمیں دینے کو تیار تھے۔ مگر سلطان اُن کی پیش کش کو ٹھکراتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُن پجاریوں کے خداؤں کا جھوٹ واضح کردے۔ جن کے نام سے وہ اکثر اُسے ڈراتے دھمکاتے رہتے تھے۔ اُن کی گردنیں اُڑا کر ظاہر کردے کہ وہ صرف مٹی کے گھروندے اور بے حس وحرکت مجسمے ہیں۔ اُن میں کسی پر غیض وغضب ڈھانے کی تو کیا خود اپنے آپ سے ایک مکھی تک کے اُڑانے کی بھی سکت نہیں۔ پجاریوں نے ان عقل

کے اندھوں نے اپنے خداؤں کے لیے پھر التجا کی۔ لاکھوں روپے قدموں میں لاکر ڈھیر کر دیے مگر سلطان کا غیظ و غضب اور بڑھ گیا اور تعجب کیا کہ یہ کیسے لوگ ہیں جو اپنے خداؤں کے وجود کے لیے گڑگڑا رہے ہیں۔ سلطان نے کہا اسلام نے اُسے بُت شکن بنایا ہے بُت فروش نہیں اور پھر تیزی سے آگے بڑھ کر سومناتھ بُت کی تیشے سے گردن اڑا دی۔ اللہ اکبر اُس وقت تو ہم پرست تماشائیوں کی کیا حالت ہو گی۔ وہ نظارہ بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ جب سلطان نے صرف اسی پر بس نہیں کیا بلکہ گردن اُڑانے کے بعد اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ قدرتِ خدا بُت شکنی کا انعام بھی اللہ تعالیٰ نے سلطان کو موقع ہی پر عنایت فرمایا۔ جتنی رقم پجاریوں نے اُسے بُت کے مسمار نہ کرنے کی خواہش میں پیش کرنے کی کوشش کی تھی اُس سے کہیں ہزار گنا زیادہ مال و دولت سلطان کو بُت شکنی کر کے بُت کے اندرونی کھوکھلے حصے سے ہاتھ آ گیا۔ سلطان کے تو یہ وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اُسے اس قدر دولت صرف ایک بُت کے توڑنے ہی سے حاصل ہو جائے گی۔ جس کے حاصل ہونے کی امید اتنی بڑی مقدار میں کسی بڑے سے بڑے خزانے سے بھی نہیں کی جا سکتی۔

ہندوؤں کا دعویٰ تھا کہ سومناتھ بُت کے حکم سے سمندروں میں طوفان آتے ہیں۔ اُس کی پوجا سے قوموں کی تقدیریں پلٹ جاتی ہیں۔ لیکن جب آزمائش کا موقع آیا تو وہ سلطان کی ایک ہی ضرب سے بکھر کر ٹوٹ گیا۔ جس کے کچھ حصے لاکر غزنی کی جامع مسجد کے سامنے پھینک دیے گئے اور کچھ حصے سلطان کے محل کے سامنے پڑے رہے۔ کہا جاتا ہے سومناتھ بُت

کا قد پانچ گز کا تھا۔ وہ دو گز کے قریب زمین میں گڑا ہوا تھا اور تین سو گز کے لگ بھگ زمین سے باہر تھا۔ وہ اندر سے کھوکھلا تھا جس میں ایک برہمن چھپ کر بیٹھ جاتا تھا اور عقل کے پیچھے لٹھ لیے پھرنے والے ہندوؤں کو بے وقوف بناتا تھا۔ پھر جب وہ ٹوٹ گیا تو بندر توں، برہمنوں کے ڈھول کا پول بھی کھل گیا۔

سومناتھ کی شکست کے بعد چونکہ ہندوؤں کے مذہبی جذبات کو سخت صدمہ پہنچا تھا اس لیے سلطان کو واپسی پر جبکہ وہ غزنی کی طرف جا رہا تھا۔ راجپوت راجاؤں اور سرداروں نے ہارے ہوئے جواری کی طرح راستے میں چھیڑ چھاڑ اور پریشان کرنے کی پھر کوشش کی مگر پھر منہ کی کھائی۔ مختصراً یہ کہ ۴۱۷ھ، ۱۰۲۶ء میں گجرات کی فتح کو مکمل کیا اور اسی سال ملتان کے ڈاکوؤں، قزاقوں کی سرکوبی کی۔ پھر اُسے آخری معرکہ ۴۱۹ھ، ۱۰۲۷ء میں سندھ کے جاٹوں سے پیش آیا جو اس کے غزنی کو مال غنیمت لے جاتے ہوئے راستے میں مزاحم ہوئے۔ سلطان محمود نے جاٹوں کو سزا دینے کے لیے دریائے سندھ کے ساحل پر پہنچ کر چند جنگی کشتیوں کا ایک بیڑا تیار کرایا جس میں ایک طرف تو بحری راستے سے تیر اندازوں کو بھیج دیا اور دوسری طرف سے دریا کے دونوں کناروں کے ساتھ بری راستے سے پیادہ فوج روانہ کر دی۔ جاٹوں کو جب سلطان کے قریب آ پہنچنے کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے اپنے بیوی بچوں کو کسی محفوظ مقام پر بھیج دیا اور خود سلطان کا مقابلہ کرنے کے لیے چار ہزار جنگی کشتیوں میں سوار ہو کر چل دیے۔ مختصراً یہ کہ جب دونوں بحری فوجوں کا مقابلہ ہوا تو سندھ کے جاٹ حملے کی تاب نہ لا کر بھاگ نکلے مگر خشکی کے راستے سے جو سلطانی فوج قدم بڑھاتی ہوئی جا رہی تھی اُس نے راستے میں بہت سے سپاہیوں کو

پکڑ لیا اور گاجر مولی کی طرح کاٹ کر پھینک دیا۔ اب اس کے بعد سفر بخیر و خوبی تمام ہوا اور سلطان غزنی واپس پہنچ گیا۔

وفات

سندھ کے جاٹوں کی سرکوبی کے دوران میں سلطان بیمار پڑ گیا۔ ہر چند اُس نے کمال استقامت اور شجاعت سے کام لیتے ہوئے بیماری کا حال ظاہر نہیں ہونے دیا تاہم مرض غزنی پہنچ کر پہلے سے سوا ہو گیا۔ بہتیرے علاج معالجے اور دوا دارو کیے مگر کچھ افاقہ نہ ہوا۔ آخر کار چار برس تک موت و حیات کی شدید کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد ۴۲۱ھ ۱۰۳۰ء میں سلطان محمود اللہ کو پیارا ہو گیا۔ سلطان کی ہمت اور مردانگی کا اندازہ کچھ اس بات سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ وہ باوجود شدید بیماری کے اپنے تمام فرائض منصبی پورے طور پر انجام دیتا رہا اور دم واپسیں تک ایک لمحہ بھی اپنے فرائض سے غافل نہیں ہوا۔

سلطان صلاح الدین ایوبی

نام و نسب

صلاح الدین ابن نجم الدین بن ایوب ابن شاذی بن مروان بن علی بن عشرہ بن حسن بن علی بن احمد بن علی بن احمد بن علی بن عبدالعزیز بن ہدبتہ بن حصین بن حرث بن سنان بن عمر بن مُرّہ بن عوف حمیری۔

سلطان کے نسب سے متعلق مورخین میں اختلاف ہے۔ علامہ خلکان کی رائے میں وہ قبیلہ درین (غیر عرب) سے تھا۔ علامہ ابنِ کثیر کا خیال ہے کہ وہ کُرد نسل سے تھا اور بعض مؤرخوں کے نزدیک وہ عرب کے ایک قبیلے سے تھا جس کا مورث اعلیٰ "عوف حمیری" تھا۔ وہ لوگ جو اسے غیر عرب کہتے ہیں اس کا سلسلہ نسب پیش نہیں کرتے اس لیے ظن غالب ہے کہ مذکورہ بالا نسب نامہ ضرور درست ہو گا۔ آگے اللہ بہتر جانتا ہے۔

سلطان کا باپ نجم الدین آذربائیجان کا رہنے والا تھا۔ وہ جوانی کے دنوں میں بغداد چلا آیا، جہاں اپنی ذہنی صلاحیت اور جسمانی قابلیت سے اُسے قلعہ تکریت کی قلعداری کا منصب مل گیا۔ لیکن ابھی اُسے کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ بعض ناموافق حالات کے باعث اسے قلعہ داری چھوڑنی پڑی اور وہ مصیبت اور پریشانی کے عالم میں اپنے چھوٹے بھائی اسدالدین شیرکوہ کو ساتھ لے کر موصل کے حاکم اتابک شہید زنگی کے پاس چلا گیا۔ اور جوہر قابل ہونے کی

وجہ سے شام و دمشق کے درمیان واقع ایک شہر کے قلعہ بعلبک کا حاکم بنا دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس شہر اور قلعہ کا نام بعلبک قدیم زمانے کے ایک دیوتا اور اس کے مندر بعل پر رکھا گیا۔

اتابک کے معنی اتالیق کے ہیں۔ اصل میں حکومت اُن غلاموں کی تھی۔ جنھیں سلجوقیوں نے اپنی وسیع و عریض سلطنت کے دُور و دراز علاقوں میں فوج کے مختلف مناصب پر مقرر کرنے کے لیے خریدا تھا یا وہ تحفے کے طور پر سلجوقیوں کے دربار میں پیش کیے گئے اور سلجوقیوں نے انھیں فوج کے بڑے بڑے عہدے دے کر "ذرہ نوازی" کی اور اسلامی مثال پھر سے زندہ کر دی۔

آگے چل کر جب سلاطین سلاجقہ کمزور ہو گئے اور آپس کی لڑائیوں اور خانہ جنگیوں سے جب سلطنت کی بنیادیں ہلنے لگیں تو یہی غلام جنھیں اتابک کہا جاتا ہے۔ شہزادگان سلاجقہ کے سیاسی اتالیق بن گئے اور پھر تھوڑے ہی دنوں بعد اپنی حیثیت سے فائدہ اُٹھا کر سلجوقیوں کی سلطنت کے مالک بن گئے اور اتابکان زنگی میں عمادالدین زنگی کا نام سرفہرست ہے کیونکہ یہی وہ پہلا حکمران تھا جس نے زنگیوں کے سلسلہ حکومت کی حلب و موصل میں بنیاد رکھی۔

ولادت

سلطان صلاح الدین، تکریت نام ایک شہر میں جو بغداد اور موصل کے درمیان دریائے دجلہ کے مغربی کنارے پر آباد ہے۔ ۵۳۲ھ میں پیدا ہوا جس زمانے میں اس کے باپ نجم الدین کو قلعداری سونپی گئی تھی۔ اس کی عمر گیارہ ایک سال کی تھی۔

سلطان ابتدا ہی سے نڈر، دلیر اور جری تھا عقلمند لوگ اس کی پیشانی دیکھ کر اکثر کہا کرتے تھے کہ نجم الدین یعنی دین کے ستارے کے گھر میں آفتاب پیدا ہوا ہے۔ وہ ضرور ایک دن اپنی شجاعت اور بہادری کا ساری دنیا سے لوہا منوائے گا۔ یہ واقعہ ہے کہ صلاح الدین بچپن ہی میں اسلحہ جنگ کا اس پھرتی اور چالاکی سے استعمال کرتا اور چھوٹی سی ہی عمر میں گھوڑے کا ایسا شہسوار بن گیا کہ بڑے بڑے بہادر اور سورما حیرت سے دیکھتے رہ جاتے۔

یہ زمانہ مصر میں فاطمیوں کی خلافت اور بغداد میں عباسیوں کی خلافت کا تھا۔ ۵۵۸ھ میں مصر کے وزیر شاور اور مصر کے سابق وزیر ضرغام کے درمیان معرکہ آرائی ہوئی جس میں شاور نے شکست کھائی اور وہ بجائے مصر کے پھر دمشق کے حاکم عماد الدین کے بیٹے نور الدین زنگی کے پاس چلا گیا۔ نور الدین زنگی نے اس کی بڑی عزّت افزائی کی اور اس کی مدد کے لیے اسد الدین شیرکوہ

کو فوج دے کر مصر کی طرف روانہ کر دیا۔

اسدالدین شیر کوہ چونکہ اس وقت بوڑھا ہو چکا تھا اس لیے نورالدین زنگی نے اس کے بھتیجے صلاح الدین کو بھی اس کے ہمراہ کر دیا۔ یہ لوگ ۵۵۹ھ میں مصر جا پہنچے۔ ضرغام کے بھائی ناصرالدین سے بڑی خوں ریز جنگ ہوئی جس میں ناصرالدین نے شکست کھائی اور اس کا بھائی ضرغام ایک لشکر کثیر کے ساتھ مارا گیا اور میدان شاور کے ہاتھ رہا۔

اس لڑائی کے بعد اسدالدین شیر کوہ، اپنے بھتیجے صلاح الدین کے ہمراہ ۷ ذی الحج ۵۵۹ھ میں دمشق واپس آ گیا اور شاور نہایت شان و شوکت سے مصر میں وزارت کا کام پھر سے کرنے لگا۔ شاور نے سلطان نورالدین زنگی سے وعدہ کیا تھا کہ لڑائی میں کامیاب ہونے پر فوج کشی کا خرچ اور مصر کی آمدنی کا تیسرا حصہ اسدالدین شیر کوہ کو پیش کرے گا۔ لیکن اب وہ اپنے وعدے کو بھول گیا اور اس خیال سے کہ اس کی بدعہدی کی سزا دینے کے لیے اسدالدین شیر کوہ کہیں اس پر حملہ نہ کر دے۔ اس نے فرانس کو اپنا دوست بنا لیا۔

جب سلطان کو شاور کی بدعہدی اور فرانس کے عیسائیوں سے دوستی کا پتہ چلا تو اس نے اسدالدین شیر کوہ اور اس کے ساتھ اس کے بہادر بھتیجے صلاح الدین کو فوجیں دے کر پھر مصر کی طرف روانہ کر دیا۔ اور خود فرانس کی طرف چل پڑا۔

اسدالدین شیر کوہ اور صلاح الدین نے مصر اور فرانس کی فوجوں کا خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ حتیٰ کہ سب کو مار بھگایا۔ اب یہاں سے فارغ ہو کر اسدالدین نے اسکندریہ کا رُخ کیا اور اسے فتح کر کے صلاح الدین کو یہیں چھوڑ کر خود آگے

بڑھ گیا اور شہر صعید میں جا کر ٹھہر گیا۔

دو مہینے بعد شادر نے اسکندریہ کے عیسائیوں سے مل ملا کر اور شیر کوہ کے خلاف سازش کر کے اسکندریہ پر چڑھائی کر دی۔ شیر کوہ کو جب اس کارروائی کا پتہ چلا وہ صعید سے اس کے مقابلے کو آ گیا۔ آخر کار فیصلہ اس پر ہوا کہ اسکندریہ کو پچاس ہزار دینار سالانہ کے بدلے میں واپس کر دیا جائے چنانچہ شیر کوہ اور صلاح الدین نے اس پر رضامندی ظاہر کی اور وہ اسکندریہ چھوڑ کر دمشق کو واپس چلے گئے۔ جہاں صلاح الدین اور شیر کوہ کا سلطان نورالدین زنگی نے ان کی شجاعت اور بہادری پر آفرین کہتے ہوئے پُرجوش استقبال کیا۔

شادر نے جس کی بدعہدی گھٹی میں پڑی تھی ان دونوں چچا اور بھتیجے کے واپس چلے جانے کے بعد پھر یہ کارروائی کی کہ عیسائیوں سے ایک معاہدہ کر کے انھیں مصر میں اندرون شہر کا سارا نظم و نسق سونپ دیا۔ علاوہ ازیں ایسے عالم میں جبکہ سلطان نورالدین زنگی عیسائیوں سے لڑ رہا تھا۔ شام کے عیسائی بادشاہ کو پیغام بھیجا کہ اس وقت سلطان عیسائیوں سے مصروف پیکار ہے تم مصر کی طرف چلے آؤ اور قبضہ کر لو یہ موقع اچھا ہے۔ چنانچہ شام کے عیسائیوں نے ۵۶۴ھ میں مصر کے مضافات پر قبضہ کر کے مصر کو گھیرے میں لے لیا۔

جب شادر نے دیکھا کہ مصر کے عیسائی اپنے مطلب ہی کے لوگ ہیں اگرچہ خود شادر ہی نے انھیں مصر آنے کی دعوت دی ہے۔ تاہم وہ جب مصر پر قبضہ کر لیں گے تو اُسے بھی مصر کی وزارت پر نہیں رہنے دیں گے۔ تو اُس نے تمام شہر میں جگہ بجگہ آگ لگوا دی اور خاص خاص تاجروں اور امیروں

کو مصر خالی کر کے قاہرہ چلے جانے کا اشارہ کر کے مصر کی ساری رونق اور زیب و زیبائش کو تباہ و برباد کر دیا۔

جب فاطمی خلیفہ عاضد الدین اللہ نے مصر کی اندرونی حالت کا یہ نقشہ دیکھا۔ اور مصر کی بیرونی حالت یہ تھی کہ شہر سے باہر عیسائیوں کی فوجیں ڈیرے ڈالے پڑی تھیں اور انھوں نے مصر کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ تو اس نے سلطان نورالدین کے نام اپنے ہاتھ سے ایک خط لکھا کہ مصر پر جو کچھ گزر رہا ہے وہ آپ کو خوب معلوم ہے۔ اب نئی مصیبت ایک اور پیش آگئی وہ یہ کہ عیسائیوں نے مصر کا محاصرہ کیا ہوا ہے اور چاہتے ہیں کہ مصر پر ان کا قبضہ ہو جائے۔ ایسے نازک موقع پر جبکہ خلافت سخت خطرے میں ہے میں آپ سے دینی حمیت پر مدد چاہتا ہوں۔ اور وعدہ کرتا ہوں کہ اگر مصیبت مصر سے ٹل گئی تو سلطنت کا تیسرا حصہ مدد کرنے کے صلے میں آپ کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ شیرکوہ کو مصری افواج کا افسر اعلیٰ مقرر کیا جائے گا۔

سلطان نورالدین زنگی نے قطع نظر اس کے کہ خلیفہ نے اسے بہت سا معاوضہ دینے کے چند ایک وعدے کیے ہیں۔ صرف یہ دیکھ کر کہ عیسائیوں کے ہاتھوں مصر کے مسلمانوں کی زندگی سخت عذاب میں مبتلا ہے۔ اس نے بلا تامل شیرکوہ کو ساٹھ ہزار فوج دے کر مصر بھیج دیا۔ اور ہر سوار کو سفر کے خرچ کے لیے بیس بیس دینار نقد ادا کیے، اور دو لاکھ درہم شیرکوہ کے ساتھ کر دیئے۔ اس کے علاوہ صلاح الدین کو بھی اس کے ہمراہ کر دیا۔ غرض چچا،

بھتیجا یہ دونوں ایک لشکرِ جرّار لیے پھر مصر پہنچ گئے۔

عیسائیوں نے جب اپنے مخبروں کی زبانی سُنا کہ شیرکوہ اور اس کا بھتیجا صلاح الدین لشکرِ جرار لیے پھر مصر کی طرف آرہے ہیں تو انھیں اپنے سر پر قضا کھیلتے نظر آنے لگی۔ وہ اُن کے خوف سے ایسے متاثر ہوئے کہ بغیر مقابلہ کیے مصر چھوڑ کر بھاگ نکلے اور شیرکوہ اور صلاح الدین ساٹھ ہزار کا لشکرِ جرار لیے فاتحانہ شان سے مصر میں داخل ہوگئے۔

خلیفہ عاضد الدین اللہ نے ان کا پُرجوش استقبال کیا۔ شاور وزیرِ مصر، جو اس موقع پر خلیفہ کے ساتھ کھڑا تھا اُس کے خبثِ باطن نے پھر چاہا کہ وہ شیرکوہ اور صلاح الدین کو دعوت کے بہانے بلا کر اُن کا کام تمام کر دے لیکن شاور کے خداترس اور فرشتہ سیرت بیٹے نے اُسے روک لیا اور اس طرح وہ اپنے ناپاک ارادے میں ناکام رہا، حتیٰ کہ اس کے اس مذموم ارادے کا خلیفہ اور شیرکوہ کو بھی علم ہو گیا۔ چنانچہ خلیفہ نے دغاباز، خود غرض اور محسن کش وزیرِ مصر شاور کو فی الفور قتل کروا دیا اور اُس کا سر قاہرہ کے دروازے پر ٹنکا دیا، تاکہ لوگ عبرت پکڑیں۔ اور شیرکوہ نے موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے قاہرہ کے بازاروں میں یہ خبر پھیلا دی کہ خلیفہ نے شاور کا مکان لوٹ لینے کا حکمِ عام دے دیا ہے۔ اتنا سننا تھا کہ چاروں طرف سے لوگ دوڑے اور شاور کے سجے سجائے مکان کو جو لاکھوں روپوں کی قیمتی اشیا سے آراستہ پیراستہ تھا۔ دل کھول کر لوٹ لیا۔ اور وہ مکان جو مصر و قاہرہ جیسے عالی شان شہروں میں اپنی مثال نہ رکھتا۔ دیکھتے دیکھتے نمونۂ عبرت بن گیا۔

جیسا کہ خلیفہ نے اپنے خط میں وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے ضرور صلہ دے گا۔ اب اس کے پورا کرنے کا موقع آ گیا۔ خلیفہ نے مصر کی وزارت کا قلمدان اسد الدین شیرکوہ کے سپرد کیا اور اپنے ایک فرمان میں اسے ان الفاظ میں یاد کیا۔

"الملک المنصور امیر الجیوش اسد الدین شیرکوہ۔"

شیرکوہ دربار خلافت سے فارغ ہو کر جب ایوان وزارت میں آیا تو یہاں خدا کی بارگاہ میں دوگانہ شکر ادا کیا اور اپنی بہادر فوج اور اس کے افسروں کو انعام و اکرام دے کر ان کی عزت افزائی کی۔

مگر افسوس شیرکوہ کو وزارت پر فائز ہونے کے بعد کچھ زیادہ دن تک جینے کا موقع نصیب نہ ہو سکا۔ کہ خدا کی بارگاہ سے فرمان قضا آ پہنچا اور وہ ۵۶۴ھ میں دنیا سے چلا گیا۔ مگر جاتے ہوئے اپنی غیر معمولی شجاعت اور تدبر کی دھاک ضرور دلوں پر بٹھا تا گیا۔

مصر کی وزارت

شیرکوہ کی وفات کے بعد اگرچہ مصر کی وزارت کے بہت سے دعویدار پیدا ہوئے۔ تاہم فاطمی خلیفہ عاضد الدین نے تمام دعویداروں کو نظر انداز کرتے ہوئے مصر کی وزارت کا قلمدان صرف صلاح الدین ہی کے سپرد کیا۔ اور ملک الناصر کا خطاب دیا۔

اس زمانے میں جب صلاح الدین کو مصر کی وزارت ملی جو خلیفہ کے بعد سلطنت کا سب سے بڑا منصب ہے۔ اس کی عمر بتیس ۳۲ برس کی تھی۔ صلاح الدین نے وزارت کی مسند پر بیٹھتے ہی سب سے پہلے یہ کام کیا کہ اس کے چچا شیرکوہ نے

جس قدر دولت جمع کی ہوئی تھی وہ سب کی سب شام کے لشکر میں تقسیم کردی اور مصر کے خزانے سے بھی مصر کی فوج کو تالیف قلوب کے لیے مال و دولت اور جاگیریں عطا کیں۔ اس کے علاوہ فوجی افسروں کے عہدوں میں بھی ترقیاں کیں۔

صلاح الدین کی وزارت میں جو سب سے بڑا کارنامہ انجام دیا گیا وہ یہ تھا کہ رعیت کی جان و مال کی حفاظت اور ان کے حقوق کا خاص خیال رکھا گیا۔ اُن پر عدالت کے دروازے ہمہ وقت کھول دیے، جس سے مظلوموں اور دادخواہوں کی دادرسی فی الفور ہونے لگی۔ ان کاموں سے عوام کے دلوں میں صلاح الدین کی محبت نے گھر کر لیا۔ غرض ہر شخص اُس کا دل سے جاں نثار بن گیا۔

مصر میں ان دنوں فاطمی خلیفہ کے شیعہ ہونے کے سبب اسماعیلی شیعوں کا بہت زور تھا۔ صلاح الدین نے وزارت پر فائز ہوتے ہی اس کے مقابلے میں سنت والجماعت کے مسلک کو فروغ دیا جس سے خوش ہو کر خلیفہ بغداد نے صلاح الدین کو ایک خلعت فاخرہ اور "حامیٔ اسلام" کا خطاب دیا۔ علاوہ ازیں شاعروں نے بھی اس کے خوب قصیدے لکھے۔ حتیٰ کہ اس کا نام دنیا میں شہرت اور دلوں میں محبت اس حد تک پکڑ گیا کہ جمعہ کی نماز کے خطبوں میں لیا جانے لگا۔

مگر دولت فاطمیہ مصر کے بعض ارکین جو صلاح الدین کو اپنا حریف و رقیب سمجھتے تھے۔ وہ اس کی دن پر دن عوام میں بڑھتی ہوئی مقبولیت اور اثر و رسوخ کو دیکھ کر انگاروں پر لوٹنے لگے۔ انھوں نے صلاح الدین کو اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے خلیفہ عاضد فاطمی کے معتمد خاص مؤتمن کو اپنے ساتھ ملا لیا اور صلاح الدین کے خلاف چپکے چپکے تدبیریں کرنے لگے۔ مؤتمن

کو یہ لالچ دیا گیا کہ مصر کی وزارت کا قلمدان آئندہ اسی کے سپرد کیا جائے گا۔ چنانچہ وہ اسی امید پر صلاح الدین کے حاسدوں کی سازش میں شریک ہو گیا۔

حاسدوں نے صلاح الدین کے خلاف عیسائیوں کو اکسانے کے لیے ان کے نام ایک سانڈنی سوار کو خط دے کر روانہ کیا۔ اتفاق سے ایک سرکاری سانڈنی سوار جو حکومت کے انتظامی صیغوں سے متعلق تھا۔ شہر قاہرہ کے ایک مقام سے گزر رہا تھا کہ اُسے حاسدوں کا سانڈنی سوار مل گیا۔ سرکاری سانڈنی سوار نے اسے وضع قطع، چال ڈھال اور لباس کے اعتبار سے جو اجنبی محسوس کیا۔ تو اسے شک ہوا۔ کہ یہ کوئی جاسوس معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ اُس نے اس کی جامہ تلاشی لی۔ اس کا شک بالکل صحیح ثابت ہوا۔ وہ خط جو مؤتمن نے عیسائیوں کے نام لکھا تھا۔ اس کے جوتے کے تلے میں چھپا ہوا محفوظ نکل آیا۔ اور اس طرح خدا کی قدرت نے حاسدوں کی سازش کا بھانڈا پھوڑ دیا۔

سرکاری سانڈنی سوار نے وہیں اس کی مشکیں کس لیں اور اسے گرفتار کر کے صلاح الدین کے روبرو لے آیا۔ صلاح الدین نے جب اس کا جرم معلوم کیا اور مؤتمن کے ہاتھ کی تحریر دیکھی تو سخت حیرت ہوئی۔ ادھر جب مؤتمن کو پتہ چلا کہ اس کا بھید کھل گیا تو وہ قصر خلافت میں دوڑ کر چلا گیا اور جان بچانے کے لیے چھپ کر بیٹھ گیا۔

قاعدہ ملکی یہ تھا کہ کوئی شخص چاہے کتنا ہی بڑا مجرم کیوں نہ ہو۔ اگر قصر خلافت میں پہنچ جائے تو اس پر ہاتھ نہیں اُٹھایا جا سکتا۔ اگرچہ مؤتمن اس قانون سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے قصر خلافت میں تو بھاگ کر چلا آیا لیکن آخر

کب تک یہاں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ ایک روز اُس نے یہاں سے بھی نکل بھاگنے کا منصوبہ تیار کر لیا۔ لیکن بدقسمتی سے جونہی اُس نے قصرِ خلافت سے باہر قدم نکالا وہ بہادر ترکمانی سپاہی جو اس کے گرفتار کیے جانے پر مقرر تھے اُس پر ٹوٹ پڑے اور اُس کو گرفتار کرتے ہی قتل کر ڈالا۔

خلیفہ کو بھی جب اپنے معتمد خاص کی شرارت اور سازش کا پتہ چلا تو وہ انگشت بدنداں رہ گیا۔ اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اُس نے اس موذی سے اُس کو بچا لیا، جو ایک دن نہ صرف اس کے لیے بالکل سارے مصر کی تباہی و بربادی کا باعث ہوتا غرض صلاح الدین نے اپنی بیدار مغزی سے اس آنے والے طوفان کو ٹال دیا۔ اور فوراً قصرِ خلافت میں پہنچ کر اُن تمام ملازموں کو برطرف کر دیا جو خلیفہ کی حفاظت پر مقرر تھے اور ان کے بجائے دوسرے قابلِ اعتماد محافظ مقرر کیے۔

مؤتمن کے قتل کیے جانے کے بعد اس کے گروہ کے لوگوں نے اس کے خون کا انتقام لینے کے بہانے سے تمام شکست خوردہ لوگوں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور صلاح الدین کے خلاف ایک اور گہری سازش کر کے اُسے مصر کی وزارت سے ہٹانے کی پھر کوشش کی۔ ان کے کئی ہزار آدمی دارالوزارت کی طرف بڑھے جہاں اُن کے اور سرکاری فوج کے جوانوں کے درمیان سخت معرکہ ہوا طرفین سے کئی سو آدمی مارے گئے۔ اسی دوران مصر کے فوجیوں نے سازشیوں کے محلہ منصورہ میں اُن کے گھروں کو آگ لگوا دی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سازشی میدان چھوڑ کر اپنے گھروں کی طرف بھاگ نکلے اور مصری فوج نے اُن کا تعاقب کر کے انھیں وہیں جا لیا اور سازشی حاسدوں کو انہی کی آگ میں جھونک دیا۔

اور جلا کر خاک کر ڈالا۔

اس ہنگامہ میں جو سازشی گروہ کے لوگ بچ گئے تھے وہ بلاد جیرہ کی طرف بھاگ نکلے لیکن راستے میں قاہرہ سے کچھ ہی دُور انھیں صلاح الدین کا بڑا بھائی شمس الدولہ توران شاہ مل گیا۔ اس نے انھیں گھیر لیا اور کہا کہ مصر کی دولت یوں لوٹ کھسوٹ کر نکل جانا آسان نہیں۔ چنانچہ پھر قتل عام ہوا جس میں سینکڑوں سازشی (سوڈانی) پھر مارے گئے۔ اب جو لوگ اتفاق سے بچ گئے تھے وہ بالکل تھوڑے ہی سے تھے۔ چنانچہ بے ضرر سمجھ کر چھوڑ دیے گئے اور وہ بلاد جیرہ کی طرف جا نکلے۔

صلاح الدین ابھی اس فتنہ کو فرو کرنے پایا ہی تھا کہ دوسری طرف سے اُس کے خلاف پھر اُن عیسائیوں نے سر اُٹھایا جو سمجھتے تھے کہ مصر کا وزیر نوعمر اور ناتجربہ کار ہے۔ چنانچہ مصر اور شام کے عیسائیوں نے اندلس اور صقلیہ کے عیسائیوں کو اپنے ساتھ ملا کر مصر پر قبضہ کرنے کی ٹھان لی اور اس کے لیے پیش قدمی کر کے مصر کے ایک شہر دمیاط کا محاصرہ کر لیا۔

صلاح الدین نے یہ حالات دیکھ کر سلطان نورالدینؒ والیٔ شام کو اطلاع دی۔ نورالدین نے بلا تأمل اپنی تجربہ کار فوجیں آراستہ کر کے مصر کی طرف روانہ کر دیں اور خود نورالدین عیسائیوں کی توجہ کو مصر سے ہٹانے کے لیے عیسائیوں کی سرحد میں جا گھسا۔ جب شام کی فوج مصر پہنچی تو عیسائی فوج کے چھکے چھوٹ گئے۔ اور ہوش و حواس جاتے رہے۔ آخر کار اسے دمیاط کا محاصرہ اُٹھانا پڑا اور مصر کی طرف پیش قدمی کرنے کی بجائے پیچھے ہٹ گئے۔ اس

دوران میں سلطان نورالدین نے بھی عیسائیوں کی سرحدوں میں گھس کر انھیں خوب ڈرایا اور بہت سا مالِ غنیمت اس کے ہاتھ آیا۔

مختصراً یہ کہ اس دوسری اور عظیم سازش کو ناکام بنانے کے بعد شامی فوجیں واپس چلی گئیں اور مصر کی فوجیں مسرّت و شادمانی کے شادیانے بجاتی ہوئی مصر میں داخل ہو گئیں۔ اس موقع پر خلیفہ عاضد جس نے اپنا سارا ذاتی مال و دولت صلاح الدین کے سپرد کر دیا کہ جس طرح چاہے فوج کے انتظامات پر صرف کر دے۔ خدا کی نصرت شاملِ حال دیکھ کر بے حد خوش ہوا۔ ادھر صلاح الدین نے بھی اپنے آقا اور محسن سلطان نورالدین کا دلی شکریہ ادا کیا، جس کے عین وقت پر کمک کے پہنچانے سے عیسائیوں کی فوجوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ اور تمام عیسائیوں نے جان لیا کہ صلاح الدین جسے وہ ایک نوعمر، ناتجربہ کار اور بے حقیقت وزیر سمجھتے تھے۔ کتنا بڑا مدبّر و منتظم اور بہادر و با اثر ہے۔

فتوحات

مسلمانوں کی باہمی نااتفاقی کے سبب جو علاقے مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے اور عیسائیوں پر صلیبی نشان بلند کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے جب اُن کے واپس لینے کی آرزوئیں صلاح الدین کے دل میں چٹکیاں لینے لگیں تو ۵۶۶ھ میں صلاح الدین ایک فوجی منتظم اور سپہ سالار کی حیثیت سے میدانِ جہاد کی طرف بڑھا۔ اور ایک ایک کر کے وہ تمام علاقے لیتا چلا گیا جو مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔

صلاح الدین نے سب سے پہلے عسقلان کا رُخ کیا۔ عسقلان پہلے مسلمانوں کے پاس تھا۔ لیکن ۵۴۸ھ میں عیسائیوں نے اُسے مسلمانوں سے چھین لیا تھا۔ عسقلان سے کچھ ہی فاصلے پر شاہ فرانس اور مختلف عیسائی گروہوں کے لشکروں کے درمیان اس کی معرکہ آرائی ہوئی۔ شاہِ فرانس اور عیسائی لشکر میدان چھوڑ کر بھاگ نکلا اور صلاح الدین فتح و نصرت کے شادیانے بجاتا ہوا عسقلان کی مہم کو یہیں چھوڑ کر ایلہ پر حملہ کی تیاری کرنے کے لیے مصر واپس چلا گیا۔

ایلہ

صلاح الدین نے بحری سامان درست کرنے اور فوج کے انتظامات مکمل

کرنے کے بعد ایلہ کا رُخ کیا۔ ایلہ جو بحیرہ قلزم کے ساحل پر واقع ہے۔ ربیع الاول ۵۶۶ھ میں صلاح الدین کے قبضے میں آگیا۔ یہ صلاح الدین کی پہلی فتح تھی۔ اس موقع پر اس نے بڑی شان و شوکت کے ساتھ ایلہ پر اسلامی علم بلند کیا۔ اور جہازوں پر عام خوشی منائی گئی۔ اس موقع پر ایک بات خاص طور پر ذکر کے قابل ہے وہ یہ کہ ایلہ کے باشندوں کا خیال تھا کہ اب مسلمان فاتح ہو کر ضرور ہمارے مال و اسباب کو لوٹیں گے اور ہمارے ساتھ نہایت سخت سلوک روا رکھیں گے۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ مسلمانوں نے اُن کے ساتھ نہایت کریمانہ برتاؤ کیا اور ایک بات بھی اُن کے خیال کے مطابق مسلمانوں سے نہیں ہوئی تو اس سے انھیں بے حد تعجب ہوا چنانچہ صلاح الدین، ایلہ کا مناسب انتظام و انصرام کرنے کے بعد مصر واپس چلا گیا۔

ایلہ کو فتح کرنے کے بعد جب صلاح الدین مصر میں ایک فاتحانہ شان سے واپس آیا تو اُس نے آتے ہی سب سے پہلے یہ کیا کہ عین اُس وقت جب فاطمی خلیفہ عاضد بیمار پڑا تھا۔ اُس کے نام کی بجائے عباسی خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھے جانے کا حکم دے دیا اور مصر کے تمام شیعہ قاضیوں کو موقوف کر کے اُن کی جگہ سُنّی قاضیوں کو مقرر کیا جو مسلک کے لحاظ سے شافعی تھے۔ جس کے سبب مصر کے ہر شہر اور قصبے میں شافعی مسلک سے تعلق رکھنے والے سُنّی قاضیوں کے تقرر سے شیعوں کے اثرات کم ہو گئے اور سُنّی زور پکڑتے گئے۔

صلاح الدین کی مجلس میں علماء و فضلا اور فقہا ہمہ وقت موجود رہتے تھے۔ وہ ان کی بڑی قدر افزائی کرتا تھا جس کے باعث اُن کا مصر کی علمائ

پر اثر بہت وسیع ہو گیا۔

کرک

ایلہ کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد صلاح الدین نے کامل دو برس مصر کے اندرونی نظم و نسق کا جائزہ لینے اور اس کی خرابیوں کو دور کرنے میں صرف کیے۔ بحری اور بری فوجوں کو درست کیا اور ایک حد تک مالیات کے صیغے کی بھی اصلاح کی۔ اس کے بعد ۵۶۸ھ شوال کے مہینے میں شام کی جانب شہر کرک پر چڑھائی کی۔ مگر بعض ملکی معاملات کی پیچیدگیوں کے سبب اُسے محاصرہ اُٹھانا پڑا اور اندرون ملک کے اُلجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے کے لیے مصر واپس آنا پڑا۔

بات یوں تھی کہ جب سے خلافت عباسیہ کا خطبہ پڑھے جانے کا حکم دے کر صلاح الدین نے مصر سے فاطمی خلافت کو ختم کیا۔ اور عدالتوں میں شیعہ قاضیوں کے بجائے سنّی قاضیوں کو مقرر کیا گیا تب سے شیعوں نے صلاح الدین کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کر لیا اور کوشش کی کہ مصر میں خلافت عباسیہ کو مٹا کر ازسرِ نو خلافت فاطمیہ کو قائم کیا جائے۔ چنانچہ ان کے بعض با اثر افراد مثلاً قاضی عویرش، عبد الصمد کاتب، عمارہ بن ابو الحسن یمنی وغیرہ نے شام کے اُن عیسائیوں کو جو مدت سے مصر پر قبضہ کر لینے کے لیے دانت لگائے بیٹھے تھے۔ انھیں صلاح الدین کے خلاف اُبھارا اور چپکے چپکے باہمی صلاح و مشورہ کر کے ایک خط شام کے عیسائیوں کے نام بھیجا جس میں لکھا تھا کہ مصر کے

لوگ صلاح الدین سے سخت بیزار ہیں۔ اس موقع سے فائدہ اُٹھاؤ اور فوراً چلے آؤ۔ ہم سب تمھاری مدد کے لیے تیار ہیں۔

چنانچہ شام کے عیسائی اس خط کے آنے پر مصر پر حملہ کرنے کے انتظامات میں لگ گئے اور صلاح الدین جو کرک کی فتح کرنے کے لیے لشکر لے کر نکلا تھا۔ اُن معاملات سے بالکل بے خبر تھا۔ قدرت خدا کہ انھی دنوں ان فتنہ پردازوں میں سے بنی شاؤر اور بنی رزیک میں سخت اختلاف پیدا ہو گیا۔ اور اس جماعت کے ایک شخص زین الدین نے ان کی سازشوں سے صلاح الدین کو آگاہ کر دیا۔ مگر صلاح الدین نے کمال حکمت عملی سے کام لے کر سازشیوں سے فی الحال کوئی تعرض نہ کیا بلکہ زین الدین کو "پرچہ نویسی" کی خدمت پر خفیہ طور پر مقرر کر کے سازشیوں سے توڑ لیا اور خفیہ طور پر اپنے ساتھ ملا لیا۔

اس دوران میں شام اور صقلیہ کے عیسائیوں نے اپنا اپنا سامان درست کر کے حملہ کرنے کی تیاری مکمل کر لی مگر اس سے پہلے کہ شام کے عیسائیوں کی طرف سے مصر پر حملہ کیا جاتا انھوں نے ایک قاصد صلاح الدین کے پاس کچھ تحفے تحائف دے کر بھیجا، مگر اصل مقصد اُس کا یہ تھا کہ وہ تحائف پیش کرنے کے بہانے مصر پہنچ کر حالات معلوم کرے اور مکمل اطمینان حاصل کر لے کہ مصر کے سازشیوں نے صلاح الدین کے خلاف عیسائیوں کے حملہ آور ہونے کے لئے کیا راستہ بالکل صاف کر لیا ہے، لیکن صلاح الدین کو اس قاصد کے حلیے بشرے اور دیگر تمام ضروری باتوں کی اطلاع ہو چکی تھی اس لیے قاصد نے جونہی سرزمین مصر پر قدم رکھا مصر کے خفیہ سپاہیوں نے اُسے فوراً گرفتار کر لیا۔

قاصد کی گرفتاری کے بعد صلاح الدین کے خلاف سازشیوں کے تمام ارادے ظاہر ہوگئے۔ چنانچہ ان کے سرغنہ قاضی عویرش، عمارہ شاعر اور عبد الصمد کاتب وغیرہ سازشی اور باغی لوگ پھانسی کے تختے پر لٹکا دیئے گئے۔ ان کے علاوہ مصر کے جو امراء اور فوج کے افسر اس سازش میں شریک تھے انھیں ملک بدر کر دیا گیا۔

شام کے عیسائیوں کو جب ان حالات کا پتہ چلا کہ باغیوں کی سازش پکڑی گئی۔ وہ جہاں تہاں تھے وہیں کے وہیں رہ گئے۔ اُن میں بالکل ہمّت نہ رہی کہ وہ مصر پر حملہ کرتے۔ البتہ صقلیہ کے عیسائیوں کو ان حالات کا علم نہ ہو سکا۔ چنانچہ وہ مصر پر قبضہ جمانے کے ارادے سے چل نکلے۔ ان کے پاس ڈیڑھ ہزار سوار اور پانچ ہزار پیادہ فوج تھی۔ اس کے علاوہ چھ جہاز سواری کے اور چالیس کشتیاں سامان رسد کے لیے ہمراہ تھیں۔ یہ لوگ اچانک اسکندریہ جا پہنچے اور سر پہ رات آ پہنچنے کے سبب لڑائی کو اگلے دن پر ملتوی کر کے خیمے ڈال کر سو رہے۔

مسلمانوں کے لیے یہ موقع خوب مفید ثابت ہوا۔ انھوں نے راتوں رات ہر طرح کا جنگی سامان درست کر لیا۔ اور صبح ہوتے ہی فجر کی نماز ادا کر کے عربی باجوں کی دھوم دھام کے ساتھ میدانِ جنگ میں پہنچ گئے۔ عیسائیوں نے چونکہ رات کو خوب شراب پی تھی اس لیے وہ جلد بیدار نہ ہو سکے۔ شراب کے خمار نے انھیں بہت کچھ بے دست و پا کر کے بستر پر گرا یا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ عربی باجوں کے شور نے انھیں بیدار کیا کہ ہشیار ہو جاؤ۔ اب تمھاری قضا سر پر آگئی ہے۔ چنانچہ وہ ہڑبڑا کر اُٹھے۔ اور جلدی جلدی تیار ہو کر مقابلے کو نکل آئے اور گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ لڑائی

صبح سے شروع ہوکر ابھی ظہر و عصر کے درمیان تک جاری تھی کہ اتنے میں شور بلند ہوا۔ کہ صلاح الدین ایک لشکر لے کر اسکندریہ آ پہنچا۔ عیسائیوں کا اتنا سننا تھا کہ صلاح الدین آ گیا۔ اس کی ہیبت عیسائی فوج کے دل پر کچھ ایسی طاری ہوئی کہ اس کے لیے میدان جنگ میں کھڑے رہنا سخت دشوار ہو گیا حتیٰ کہ فوج میں بھگدڑ مچ گئی جیسے بھاگ نکلنے کا موقع ملا وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ جو لوگ خوف کے مارے بے حال ہو گئے یا لڑتے لڑتے جن کے بھیپھڑے پھول گئے تھے اور وہ بھاگ نہ سکتے تھے وہ گرفتار کر لیے گئے۔ مگر جب عیسائیوں کو اصل بات کا پتہ چلا کہ صلاح الدین خود نہیں آیا بلکہ اُس نے اپنا ایک دستہ بھیجا ہے تو انھیں سخت پشیمانی ہوئی۔ اور کوشش کی کہ وہ کسی طرح میدان جنگ کا پانسہ پلٹنے میں کامیاب ہو جائیں۔ لیکن اب ان کی ہر تدبیر بے سود رہی۔ حتیٰ کہ تمام دن اور تمام رات لڑائی جاری رہی۔ تلواریں مارتے مارتے مسلمانوں کے ہاتھ شانوں تک سوج گئے آخر کار دوسرے دن صبح ہوتے ہوتے مسلمانوں نے عیسائیوں کے لشکر کا صفایا کر دیا۔ اور باقی جو لوگ بچ گئے تھے وہ مسلمانوں کے سامنے گڑگڑا کر معافی مانگنے لگے۔ اور مسلمانوں کی روایتی رواداری سے فائدہ اُٹھا کر رہائی پاتے ہی کشتیوں میں سوار ہو کر واپس چلے گئے۔

اسکندریہ کے مسلمانوں نے بڑی بے جگری سے عیسائیوں کا مقابلہ کیا۔ اور اس موقع پر خاص کر انھوں نے خدا کی بارگاہ میں دوگانہ شکر ادا کیا کہ اس نے باوجود اس کے کہ وہ تعداد میں بہت ہی تھوڑے تھے، عیسائیوں کے ایک لشکر جرار پر فتح بخشی۔

دمشق

سلطان نورالدین والیٔ شام جس کا دارالحکومت دمشق تھا ۵۶۹ھ/۱۱۷۴ء میں فوت ہو گیا۔ اور اس کا بارہ تیرہ سالہ نوعمر بیٹا ملک الصالح اسماعیل تخت نشین ہوا۔ عیسائی جن کے دلوں پر نورالدین کی ہیبت وصولت اور شجاعت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ اب یہ خیال کر کے کہ دمشق کے مسلمانوں میں سخت نااتفاقی پیدا ہو چکی ہے۔ ایک گروہ صلاح الدین کے حق میں ہے۔ دوسرا نورالدین کے نوعمر بیٹے اسماعیل کے حق میں ہے مسلمانوں کے خلاف نئے نئے منصوبے تیار کرنے لگے۔ یہ حالات دیکھ کر صلاح الدین ۵۷۰ھ میں دمشق جا پہنچا۔ ایسے موقع پر جبکہ مسلمانوں میں تخت نشینی کے مسئلہ پر سخت نزاع برپا ہو رہا تھا، صلاح الدین کی آمد مسلمانوں میں عید کی خوشی سے کم نہ تھی۔ تمام ارکین سلطنت اور عمائدین شہر نے صلاح الدین کا پُرجوش استقبال کیا۔

صلاح الدین کے قیام کے لیے دمشق میں ایک آراستہ پیراستہ محل میں انتظام کیا گیا تھا۔ لیکن وہ بجائے وہاں ٹھہرنے کے اپنے آبائی مکان میں آ کر ٹھہر گیا۔ اور اس کے بعد وہ ایک ایک کر کے تمام ارکین سلطنت سے ملاقی ہوا اور ان سے حالات دریافت کیے۔ عوام جو صلاح الدین ایوبی کو دل سے چاہتے تھے اُسے ایک نظر دیکھنے کے لیے سخت بے چین تھے۔ چنانچہ وہ دوسرے دن عوام سے بھی ملاقی ہوا۔ اور علماء، صلحاء اور غرباء و مساکین میں شاہانہ خلعتِ فاخرہ، ہزاروں روپے اور اشرفیاں تقسیم کیں۔

مصر میں عباسی خطبہ

مصر کی سرزمین جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ سب سے پہلے حضرت عمر فاروق رضؓ کے عہدِ خلافت میں سنہ ۲۰ھ میں فتح ہوئی اور حضرت عمرو بن عاص فاتح مصر ہی اس کے پہلے گورنر بنے جو حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں کافی عرصے تک اس عہدے پر کام کرتے رہے اور اس کے بعد حضرت عثمان ہی کے زمانے میں معزول کر دیے گئے۔ مختصراً یہ کہ سنہ ۴۰ھ تک سرزمین مصر خلافت راشدہ ہی کے زیرِ نگیں رہی۔ پھر جب سنہ ۴۱ھ میں امیر معاویہؓ کی امارت قائم ہونے سے اُمویوں کا زمانہ آیا تو حضرت عمروؓ بن عاص دوسری مرتبہ پھر مصر کے گورنر بنے اور تاحیات اسی عہدے پر فائز رہ کر سنہ ۴۳ھ میں انتقال کر گئے۔

حضرت عمروؓ بن عاص کے بعد اُن کے بیٹے عبداللہ بن عمرو مصر کے گورنر بنے۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد بعض مصلحتوں کی بناء پر امیر معاویہ نے اپنے بھائی عتبہ ابن ابی سفیان کو ان کے بجائے مصر کا گورنر بنا دیا۔ پھر جب سنہ ۴۴ھ میں ان کا انتقال ہو گیا تو عتبہ بن عامر مصر کے گورنر بنے۔ لیکن ملکی امور کا تجربہ نہ رکھنے کے باعث جلد ہی معزول کر دیے گئے۔ اب اُن کی جگہ سلمہ بن مخلد گورنر بنے جو مصر کی فتح میں حضرت عمرو بن عاص کے ہمراہ رہے اور یزید کے زمانے تک اسی عہدے پر رہ کر کام کرتے رہے۔ اُن کی طبیعت بڑی تیز تھی۔ حضرت عبداللہ بن عمرو عاص نے جب یزید کی بیعت کرنے سے انکار کیا تو سلمہ نے دھمکی دی کہ اگر جماعت کا ساتھ چھوڑو گے تو گھر میں آگ لگا دوں گا۔ سلمہ کے بعد پھر ایک شخص سعید کو مصر کا گورنر

بنایا گیا۔ جنھیں یزید کے مرنے کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیر نے ۶۴ھ میں مکے میں اپنی خلافت قائم کر کے مصر کی ولایت سے معزول کر دیا اور ان کی جگہ عبدالرحمان بن عتبہ گورنر بنا کر بھیجے گئے۔

عبدالرحمان بن عتبہ سے حکومت امویہ کے بانی دوم مروان بن حکم نے مقابلہ کیا۔ اور فتح پائی۔ مروان نے عتبہ کی جگہ اپنے بیٹے عبدالعزیز کو مصر کا گورنر مقرر کیا انہی عبدالعزیز کے بیٹے حضرت عمر بن عبدالعزیز تھے جنھیں تاریخ اسلام میں عمر ثانی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ عبدالعزیز کی عمر اُس زمانے میں کچھ زیادہ نہ تھی۔ عبدالعزیز نے تنہائی محسوس کرتے ہوئے مروان سے کہا کہ میں اس ملک میں کیونکر رہ سکوں گا جہاں میرا کوئی بھائی ہے نہ عزیز! مروان نے جواب دیا کہ سلوک و احسان کرو گے تو سب تمھارے بھائی ہو جائیں گے۔ عبدالعزیز کی ولایت مصر کا زمانہ پورے بیس[۲] برس رہا۔ ۸۶ھ میں عبدالعزیز نے وفات پائی اور خلیفہ عبدالملک بن مروان کا بیٹا عبداللہ بن عبدالملک مصر کا نیا گورنر بن گیا۔ اور ۹۶ھ میں اپنے انتقال تک اسی عہدے پر سرفراز رہا۔

مختصراً یہ کہ مصر میں امویوں کی حکومت کا آخری گورنر عبدالملک بن موسیٰ تھا۔ جب ۱۳۲ھ میں امویوں کا آخری خلیفہ مروان الحمار مصر کے ایک مقام بوصیر پر صالح بن علی عباسی کے ہاتھوں قتل ہو گیا اور عباسیوں کی حکومت قائم ہو گئی تو عہدِ عباسیہ کا صالح بن علی عباسی ہی کو مصر کی ولایت کا پہلا گورنر مقرر کیا گیا۔ اور پھر جب تک بغداد میں خلافت عباسیہ قائم رہی۔ مصر کی ولایت عباسیوں ہی کے زیرِ نگیں رہی۔ مختلف لوگ، مختلف اوقات میں مصر کے گورنر

بن کر آتے رہے اور جاتے رہے۔ غرض معتز باللہ تک مصر میں عباسیوں ہی کا خطبہ جاری رہا۔ پھر جب آئے دن کی سازشوں اور بغاوتوں کے سبب مرکز خلافت کمزور ہوگیا اور معتز باللہ نے ایک ترکی امیر بائیک کو مصر کی ولایت پر فائز کر دیا۔ اور اُس نے حاکم مصر کی حیثیت سے ایک ترکی غلام احمد بن طولون کو امیر الجیش مقرر کر دیا تو آگے چل کر ۲۵۸ھ میں قسمت کی یاوری سے مصر کے ایک خود مختار حکمران کی حیثیت اختیار کر لی۔ اور اس کی مصری حکومت کا نام دولتِ طولونیہ پڑ گیا۔

احمد ابن طولون کا قصہ یہ ہے کہ اس کا باپ طولون ایک ترکی غلام تھا جسے نوح بن اسد سامانی نے خلیفہ مامون الرشید کے پاس ۲۰۰ھ میں تحفے کے طور پر بھیجا تھا۔ خلیفہ نے اسے دانا و توانا دیکھ کر اپنے خادموں میں رکھ لیا۔ ۲۲۰ھ طولون کے یہاں یہی احمد پیدا ہوا، جس نے بچپن ہی میں قرآنِ حکیم حفظ کر لیا اور علم و ادب میں تکمیل بھی پالی۔ پھر جب وہ بیس برس کی عمر کو پہنچا تو اُس کا باپ طولون چل بسا اور بائیکباک نے اُسے اپنی فوج میں ملازم رکھ لیا۔ پھر جب امیر بائیکباک کو ۲۵۴ھ میں خلیفہ معتز باللہ عباسی نے مصر کا گورنر بنایا تو امیر موصوف نے احمد بن طولون کے حال پر بھی مہربانی فرمائی اور اُسے امیر الجیش بنا دیا۔ پھر جب خلافت عباسیہ کے سیاسی جھگڑوں میں ترکی امیر بائیکباک قتل ہوگیا اور مہتدی کی خلافت قائم ہوگئی تو خلیفہ نے اب مقتول حاکم مصر کی جگہ اباجور کو حاکم بنا دیا۔ اتفاق سے اباجور کی بیٹی احمد بن طولون سے بیاہی ہوئی تھی۔ اس لیے خسر نے قابلیت و صلاحیت کو سامنے رکھتے ہوئے مصر کی ولایت کے تمام اختیارات اپنے داماد (احمد بن طولون) کو سونپ دیے اور یوں اُس

کی سوئی ہوئی تقدیر جاگ اُٹھی۔

مصر پر طولون خاندان کی حکومت پورے ۳۷ برس، ۷ مہینے اور بیس ۲۰ دن قائم رہی۔ ۲۹۲ھ میں جب خلیفہ مکتفی عباسی نے مصر پر حملہ کیا اور طولون خاندان کا آخری حکمران ہارون بن خمارویہ قتل ہو گیا تو مصر پھر خلافت عباسیہ کے ماتحت آ گیا۔ اور عیسٰی نوشری کو مصر کا گورنر بنا دیا گیا۔ پھر آخر میں جب حاسدوں اور خارجیوں کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کی بدولت خلافت عباسیہ بالکل کمزور ہو گئی تو ۳۲۲ھ میں ابوبکر محمد بن طغج نے جسے خلیفہ راضی باللہ نے مصر کا گورنر بنا کر بھیجا تھا۔ خلافت عباسیہ کے مرکز کی کمزوری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے مصر پر قبضہ کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس کا مختصر حال یہ ہے کہ اس سے پہلے احمد بن کیلغ کو خلافت عباسیہ کی طرف سے مصر کی ولایت پر مامور کیا گیا تھا مگر اس ترکی غلام نے مصر پہنچ کر سرکشی اختیار کر لی۔ پھر جب اس کی سرکوبی کے لیے محمد بن طغج کو بھیجا گیا جس نے آتے ہی احمد کو شکست دی اور وہ بھاگ کر افریقہ کی مدعی علوی فاطمی خلافت میں چلا گیا تو محمد بن طغج نے اپنے لیے میدان ہموار دیکھ کر مصر پر اپنی ایک علیحدہ اور خود مختار حکومت قائم کر لی۔

امویوں کے زمانے میں حکومت پر عرب چھائے ہوئے تھے۔ عباسیوں کا زمانہ آیا تو انھوں نے عربوں کا زور توڑنے کے لیے ایرانیوں کی قدر افزائی شروع کر دی۔ پھر جب وہ عنایات خسروانہ کے طفیل منہ زور اور سرکش ہو گئے تو ان کا زور توڑنے کے لیے خلیفہ معتصم باللہ عباسی کے زمانے میں ترکوں کو حکومت کی بڑی کلیدی اسامیاں اور عہدے دیے جانے لگے۔ انہی دنوں جب خلیفہ ترکوں کو

بھرتی کر رہا تھا اُسے معلوم ہوا کہ ترکستان میں ایک رئیس جس کا نام جف ہے۔ بڑا قوی اور بہادر ہے۔ چنانچہ خلیفہ نے جف کو بلا کر عنایات خسروانہ سے نوازا۔ ٹھاٹھ باٹھ سے رہنے سہنے کو ایک جاگیر بھی عطا کی۔

جف کے یہاں ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام طغج تھا۔ ۲۴۷ھ میں جب اس کا باپ جف اور خلیفہ بغداد متوکل دونوں ایک ہی روز دنیا سے رخصت ہو گئے تو طغج بن جف جزیرے میں ابن طولون کے غلام لولو کے پاس چلا گیا۔ اور پھر خمارویہ طولونی نے حسنِ لیاقت کی بنا پر طبریہ کا امیر بنا دیا۔ اور جب خمارویہ طولونی قتل ہو گیا تو خلیفہ مکتفی نے اسے اپنے پاس بلا لیا۔ اُن دنوں عباس بن حسین وزارت کے منصب پر فائز تھا۔ اُس نے تھوڑے عرصے بعد کسی عداوت کی بنا پر طغج اور اُس کے جواں سال بیٹے ابو بکر محمد باپ بیٹا دونوں کو قید خانے میں ڈال دیا، جہاں طغج تو مر گیا۔ ابو بکر محمد بن طغج کسی طرح وہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور پھر اپنے بھائی عبید اللہ کی مدد سے ۲۹۶ھ میں عباس بن وزیر سے اپنے باپ کے خون کا بدلہ خون سے لے لیا اور بھاگ کر پھر بادیہ شام میں تکین خرزی کے پاس چلا گیا جو عباسیوں ہی کا ایک ترکی امیر تھا۔ لیکن بعد میں جب تکین سے اَن بن ہو گئی (اور اس سے پہلے حاجیوں کے ایک قافلے کو لٹیروں کے ہاتھوں لٹنے سے بچا کر خلیفہ مقتدر عباسی کی خوشنودی سے خلعت فاخرہ حاصل کر چکا تھا) تو خلیفہ نے اُسے اپنے یہاں بلا لیا۔ پھر جب راضی کو خلافت ملی اور ابو بکر کو مصر کی ولایت پر مامور کیا گیا تو اُس نے یہاں اپنی ایک علیحدہ حکومت قائم کر لی۔ خلافت کا مرکز چونکہ بے حد کمزور ہو چکا تھا،

اس لیے خلیفہ کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اس کی خود مختار حکومت کو تسلیم کر لے چنانچہ خلیفہ نے مجبوراً اُس کے استقلال کو مان لیا اور اخشید کے لقب سے متعز کیا جس کے معنی فرغانی زبان میں شہنشاہ کے ہیں۔

دولت اخشیدیہ میں مصر، شام، دمشق، حمص اور حلب وغیرہ علاقے شامل تھے۔ ابوبکر محمد بن طغج نے گیارہ سال تین مہینے حکومت کی اُس کا لشکر چار لاکھ سپاہ پر مشتمل تھا۔ ۳۳۴ھ میں اُس نے وفات پائی۔ دولت اخشیدیہ کا آخری حکمران حسن اخشیدی ہے جسے فاطمی ہونے کے مدعی خلیفہ معزالدین کے غلام جوہر نے افریقہ سے آکر شکست دی اور دولت اخشیدیہ کو ختم کر دیا۔ اور دولت فاطمیہ قائم کی۔

دولت فاطمیہ کی تفصیل کا اجمال یہ ہے کہ دولت بنی فاطمہ مصر کا بانی عبیداللہ ایک ایسا شخص ہے جس کے حسب و نسب کے بارے میں خود مؤرخوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ عبیداللہ کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ امام جعفر صادقؒ کے بیٹے اسمٰعیل کی اولاد سے ہے۔ لہٰذا فاطمی و علوی ہونے کی بنا پر وہی امامت کا مستحق ہے اور وہی امام مہدی ہے جس کے بارے میں اکثر حدیثیں بیان کی جا چکی ہیں۔

مؤرخین میں ایک تو وہ ہیں جو اس کے دعوے کو جھوٹا سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں۔ اُس نے اپنا حسب ذیل نسب نامہ جو پیش کیا ہے وہ بالکل وضعی ہے۔ عبیداللہ کا نسب نامہ یہ ہے: ابو محمد عبیداللہ بن محمد بن عبداللہ بن میمون بن محمد بن اسماعیل بن امام جعفر صادق بن امام محمد باقر بن امام علی زین العابدین بن امام حسین بن امام الاوّل حضرت علی ابن ابی طالب۔ اب یہ کہ اصل کے اعتبار سے وہ کیا تھا۔ مؤرخین کے ایک گروہ کی رائے تو یہ ہے کہ وہ ایک یہودی نژاد تھا۔ دوسرے کا

خیال یہ ہے کہ وہ عبداللہ بن میمون بن قداح کی اولاد سے تھا۔ اور اس نے پہلے یہ دعویٰ بھی کیا کہ وہ حضرت علیؓ کے بڑے بھائی حضرت عقیلؓ ابن ابی طالب کی اولاد سے ہے۔ مگر بعد میں اپنا حسب و نسب امام جعفر صادقؒ سے ملا لیا۔ لیکن اس بات پر کہ وہ ہرگز فاطمی نہ تھا۔ مؤرخین کے اس گروہ سے تمام اصحاب متفق ہیں۔

ان کے برعکس مؤرخین کا دوسرا گروہ ہے جس میں علامہ ابنِ خلدون ایسے بزرگ بھی شامل ہیں اور عبیداللہ کے دعوے کو صحیح تسلیم کرتے ہیں اور عباسیوں کو ملامت کرتے ہیں کہ اُن سے جب اپنے مقابل حریف کے خلاف کچھ نہ بن پڑا تو فاطمیوں کے بارے میں اعتراض اُٹھا دیا کہ وہ جھوٹے ہیں لیکن اس گروہ نے ان کے حسب و نسب کے درست ہونے کی چونکہ دلیل کوئی پیش نہیں کی۔ اس لیے بات کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی لہٰذا مؤرخین میں عبیداللہ کے فاطمی ہونے کا انکار برابر آج تک قائم ہے۔

بہرکیف عبیداللہ نے بہ یک وقت دو دعوے کیے۔ ایک یہ کہ وہ امام مہدی ہے اور دوسرے یہ کہ وہ فاطمی ہے۔ اُس نے حصول خلافت کے لیے اپنی کوششوں کا مرکز افریقہ میں قائم کیا۔ جہاں بربری قبائل کی جنگجوئی اور ضعیف الاعتقادی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ۲۸۰ھ میں قیروان میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ پھر جب ۲۹۵ھ میں بلا مبالغہ اُس کی طاقت کافی بڑھ گئی تو اُس نے کھلم کھلا اپنی خلافت کا اعلان کر دیا اور اب مصر پر قبضہ کرنے کی تدبیریں کرنے لگا۔ مگر اخشیدی چھائے ہوئے تھے اُن پر اُس کا زور نہ چلنا تھا۔ آخر مصر کی حسرت دل ہی دل میں لے کر ۳۲۲ھ میں فوت ہو گیا۔ اس نے اپنی زندگی کے پورے ساٹھ برس افریقہ ہی میں بسر کیے۔

عبیداللہ کے بعد اُس کا بیٹا ابوالقاسم نزار تخت نشین ہوا اور خلافت عباسیہ

کی تقلید کرتے ہوئے اُس نے اپنا لقب محمد قائم بامرللہ اختیار کیا۔ اور قیروان کے قریب اُس کے باپ کے آباد کیے ہوئے ایک علاقے کو جس کا نام امام مہدی ہونے کی مناسبت سے مہدیہ رکھا گیا تھا۔ اُسے مصر کے فتح کیے جانے تک عارضی دارالخلافہ قرار دیا۔ قائم بامراللہ کو بھی اپنے باپ کی طرح مصر پر قبضہ کر لینے کی بڑی آرزو تھی۔ لیکن وہ بھی دل ہی دل میں آرزو لے کر ۳۳۴ھ میں فوت ہو گیا۔

قائم بامراللہ کے بعد اُس کا بیٹا ابو تمیم مسعد، معزالدین اللہ کے لقب سے تخت خلافت پر بیٹھا اور اسی کے غلام جوہر نے آ کر دولت اخشیدیہ مصر کو ختم کیا اور بنی فاطمہ مصر کی بنیاد رکھی۔ ۳۵۸ھ میں مصر کے تمام امراء، وزراء اور علماؤ قضاۃ نے معزالدین اللہ کا استقبال کیا اور جمعہ کے دن جامع عمرو بن عاص میں فاطمی خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور عباسیوں کے سیاہ جھنڈے کی بجائے فاطمیوں کا سفید علم بلند ہوا۔ نیز اذان میں "حی علی خیر العمل" کے پکارنے کا حکم دیا گیا۔ علماء اعیان و سادات کے دستخط سے چونکہ عباسیوں کی طرف سے اس حکمران خاندان کے بارے میں ایک محضر تیار کرایا گیا تھا جس میں ثابت کیا گیا تھا کہ یہ لوگ فاطمی نہیں۔ چنانچہ سید عبداللہ بن طبا طبا شیعی نے اس محضر سے متاثر ہو کر معزالدین اللہ سے اس کے نسب کی تصدیق چاہی۔ اُس نے کہا اس کا جواب میں مجلس عام میں دوں گا۔ پھر جب مجلس قائم ہوئی، جملہ سادات و اشراف اکٹھے ہوئے تو معزالدین اللہ نے اپنی تلوار کھینچ لی اور کہا کہ یہ میرا نسب ہے۔ پھر سب کے آگے اشرفیوں کے توڑے لا کر ڈال دیے اور کہا کہ لو یہ میرا حسب ہے۔ دربار کے سب لوگ یک زبان ہو کر بولے ہم آپ کے خادم اور غلام ہیں۔

اس کے بعد فاطمی خلیفہ نے خلیفہ منصور عباسی کی تقلید میں بغداد کے نقشے پر مصر کے ایک ایسے نئے شہر قاہرہ کی داغ بیل ڈالی جو آج تک مصر کا دارالحکومت چلا آ رہا ہے۔ لکھا ہے کہ شہر قاہرہ کی تاسیس کے موقع پر جوہر نے ایک نجومی کو ایک بلند مقام پر کھڑا کیا اور داغ بیل پر ہر طرف رسیاں بندھوا کر ان میں گھنٹیاں لٹکا دیں۔ مقصد ان سے یہ تھا کہ جب وہ نیک ساعت آئے جسے نجومی نے تجویز کیا ہے تو اسی وقت وہ رسی ہلا دے تاکہ داغ بیل پڑ جائے۔ اتفاق سے ایک کوا اڑتا ہوا رسی میں اُلجھ گیا، جس سے گھنٹیاں بج گئیں اور داغ بیل پڑ گئی۔ نجومی یہ دیکھ کر چلایا۔ القاہرہ القاہر یعنی مریخ ستارہ سامنے ہے۔ غرض اسی مناسبت سے مصر کے موجودہ دارالحکومت کا نام قاہرہ پڑ گیا۔ جو صدیوں سے اسی حیثیت میں چلا آ رہا ہے۔

علاوہ شہر قاہرہ کے خلیفہ نے ایک عظیم الشان درس گاہ جامع ازہر بھی تعمیر کرائی جس کا شمار آج تک دنیا کی سب سے بڑی اور سب سے قدیم یونیورسٹی کے طور پر ہوتا چلا آ رہا ہے۔

معزالدین اللہ ۳۶۵ھ میں فوت ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا نزار بن معز ابومنصور تخت خلافت پر بیٹھا اور عزیز باللہ کا لقب اختیار کیا۔ ۳۸۶ھ میں اُس نے وفات پائی۔ اس کے بعد اُس کا بیٹا ابوعلی منصور تخت نشین ہوا۔ حاکم بامر اللہ لقب اختیار کیا۔ مؤرخوں نے لکھا ہے کہ حاکم بامر اللہ کی عقل میں کچھ فتور تھا جو اُس کے مرنے تک برابر قائم رہا۔ یہی سبب ہے کہ اس نے اہل مصر کو دن میں کاروبار کرنے کی ممانعت کر دی اور حکم دیا کہ رات کو دکانیں کھولیں۔ اور خود رات کو گھوم گھوم کر دیکھتا۔ اگر دن کے وقت کوئی دکان کھلی دیکھتا تو سخت

سزا دیتا۔

خلفائے بنی فاطمہ میں حاکم بامر اللہ اپنے ظلم و ستم اور جبر و استبداد کے لحاظ سے سب سے زیادہ بدنام ہے۔ اُس نے ۳۹۵ھ میں صحابۂ کرام کے نام پر گالیاں لکھوا کر مسجدوں، مقبروں اور عام راستوں پر لگوا دیں۔ پھر جب اُس کی مخالفت بڑھنے لگی، تو دو سال گزرنے کے بعد اُتروا دیں۔ کچھ علماء و فقہا کو اس نے تعلیم کی اشاعت کے لیے پہلے خود ہی مقرر کیا اور پھر خود ہی انھیں ناحق قتل کر ڈالا۔ وہ اس بات کا بھی مدعی تھا کہ حضرت موسیٰ کی طرح اللہ تعالیٰ مجھ سے بھی ہم کلام ہوتا ہے۔ چنانچہ روزانہ صبح کو جبل مقطم پر مناجات کے لیے جاتا تھا۔

اسی زمانے میں کسی بد باطن فرقہ باطنیہ کے ایک شخص نے اُسے ایک کتاب لکھ کر دی، جس میں بیان تھا کہ اللہ تعالیٰ کی رُوح پہلے حضرت آدم علیہ السلام میں آئی پھر حضرت علی ابن ابی طالب میں۔ اب ان میں سے روحِ الٰہی کا ظہور حاکم بامر اللہ میں ہوا۔ چنانچہ وہ اسی بنیاد پر خدا ہونے کا دعویٰ کر بیٹھا۔ اور مسجدوں میں کہلا بھیجا کہ جس وقت خطبے میں میرا نام لیا جائے سب لوگ سجدے میں گر جائیں۔ اس کے علاوہ راستوں اور سڑکوں پر سے گزرتا تو لوگوں سے سجدہ کراتا اور اپنے لقب بامر اللہ کو بامرہٖ کر دیا۔ غرض جاہلوں کی ایک جماعت نے اس کے دعووں کو تسلیم کر لیا اور اُس کی خدائی کی بھی قائل ہو گئی۔

اہلِ مصر جو کبھی فاطمیوں کے لیے دیدہ و دل فرشِ راہ کیے ہوئے تھے اور اُن کے ورودِ مصر کو بنی فاطمہ ہونے کی رعایت سے خیر و برکت کا باعث خیال کرتے تھے۔ اور جمعے کے خطبے سے عباسیہ خلافت کے نام کو نکال باہر کرنا چاہتے تھے

تھے۔ اب حاکم بامراللہ کی بے دینیوں کو دیکھ دیکھ کر سخت مشتعل ہوتے اور اس کا مذاق اُڑاتے۔ پھر جب اس نے مصریوں کو اپنے خلاف پایا تو سخت غضبناک ہو کر غلاموں کو حکم دیا کہ شہر کو آگ لگا دو۔ چنانچہ حکم کی تعمیل میں فوراً قتل و نہب اور آتش زنی شروع ہو گئی۔ حتیٰ کہ لوگ قرآن حکیم لیے کر مسجدوں میں پناہ گزیں ہوئے اور شہر کا تیسرا حصہ جل کر خاک ہو گیا۔

بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ حاکم بامراللہ کا فتورِ عقلی اس قدر بڑھا کہ اس نے حضور پیغمبر اسلام کے روضۂ مبارک سے نعش مبارک کو مدینہ سے قاہرہ میں منتقل کرانے کا ارادہ کر کے مدینے میں آدمی بھی روانہ کر دیے۔ مقصد اس سے یہ تھا کہ اس کا پایۂ تخت قاہرہ مقبول انام اور زیارت گاہ خاص و عام بن جائے۔ لیکن قدرت خدا اُسی روز مدینے میں ایک ایسی آندھی آئی کہ لوگوں کے دل دہل گئے۔ اور یہ لوگ اس سے خوفزدہ ہو کر واپس آ گئے۔ ۴۱۳ھ میں اسی موقع پر مصر کے ایک آدمی نے حجرِ اسود کو بھی توڑ کر لے جانے کی کوشش کی تھی اسے بھی حاکم ہی نے اس ناپاک ارادے کے لیے بھیجا تھا اس مصری نے جو ضرب لگائی تھی اس سے حجرِ اسود کے کچھ ریزے ٹوٹ کر گرے تھے جس کے آثار آج تک حجرِ اسود پر نمایاں ہیں۔

اواخر شوال ۴۱۱ھ میں حاکم اچانک غائب ہو گیا۔ عام خیال یہ ہے کہ اس نے اپنی بہن پر تہمت لگا کر اس کے قتل کا ارادہ کیا تھا مگر اس کی ہمشیرہ نے تہمت کے صدمے میں پیش قدمی کر کے اسے اپنے غلاموں سے قتل کرا دیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ مختصراً یہ کہ ان لوگوں نے شعارِ اسلامی کے خلاف جو نئے نئے طریقے رائج کیے اس نے مصریوں کو سخت بدظن کر دیا اور یہ نفرت اس حد تک بڑھی کہ آخری فاطمی خلیفہ عاضد جو

نہایت غالی شیعہ تھا اور سنیوں کے خون کو حلال سمجھتا تھا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کو اپنی مدد کے لئے مصر آنے کی دعوت پر مجبور ہو گیا۔

آخری رہی بات فاطمیوں کے حسب ونسب کی کہ وہ اصلاً فاطمی تھے کہ نہیں جیسا کہ مورخوں نے لکھا ہے۔ ہم اس سلسلے میں اپنی کوئی رائے پیش نہیں کریں گے۔ ہمارا کام تو واقعات کو صرف تاریخی نقطہ نظر سے پیش کرنا ہے اور بس:

مصر کے فاطمیوں میں کل ۱۴ خلفا ہوئے جن میں سے مہدی، قائم اور منصور تین افریقیہ میں گزرے اور بقیہ گیارہ مصر میں۔ ان کی مصر پر حکومت (خلافت) ۳۵۹ھ سے ۵۶۷ھ یعنی ۲۰۸ سال تک قائم رہی۔ آخری خلیفہ عاضد تھا۔ مورخین عام طور پر فاطمیوں کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے۔ سبب اس کا یہ تھا کہ خلفائے بنی فاطمہ مصر جہانبانی اور ملک داری میں حصہ نہیں لیتے تھے بلکہ مہمات سلطنت زیادہ تر وزرائے کرام کے سپرد کر کے خود عیش و عشرت میں پڑے رہتے تھے اور عباسیوں کی طرح چونکہ مصر کے فاطمیوں نے بھی اپنی خلافت اس دعوے پر قائم کی تھی کہ وہ قرابت رسول رکھتے ہیں۔ اور وہی اس کے صحیح مستحق ہیں۔ اس لیے اُن کے یہاں بھی عباسیوں ہی کی طرح شخصی و موروثی حکومت کا نقشہ قائم رہا اور اس سے وہی نتائج برآمد ہوئے جو شخصی حکومتوں سے لازماً پیدا ہوا کرتے ہیں۔

صلیبی جنگیں

بنی فاطمہ مصر کی خلافت کو مٹانے کے بعد ایک طرف اسماعیلی و باطنیہ فرقہ

کے شیعہ سلطان صلاح الدین ایوبی کو قتل کرنے کے درپے تھے اور وہ کئی مرتبہ سلطان پر ناکام حملے بھی کر چکے تھے اور دوسری طرف یہی لوگ اُن زخم خوردہ عیسائیوں کو بھی سلطان کے خلاف اپنے خطوط اور وفود بھیج بھیج کر اُکسا رہے تھے جو سلطان نورالدین زنگی اور اُس کے سپہ سالار سلطان صلاح الدین ایوبی کی تیغ خارا شگاف کے گھائل تھے۔

سلطان نورالدین زنگی علیہ الرحمہ کے بعد ایک نوعمر حکمران ملک الصالح اسماعیل ابن سلطان نورالدین زنگی جب تخت نشین ہوا تو شام کے عیسائیوں نے اسے کمزور پا کر اور بنی فاطمہ مصر کے شیعوں کی سازشیں دیکھ کر اسلامی مقبوضات پر بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارنے شروع کر دیے اور کوشش کی کہ سلطان نورالدین علیہ الرحمہ کی سلطنت پر قبضہ کر کے مصر کی ایوبی حکومت سے ٹکرا سکیں۔ سلطان ایوبی نے اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت پا کر ایک طرف اندرونی انتظامات مکمل کیے اور بیرونی معاملات کی خبر گیری کی اور دوسری طرف ملک الصالح اسماعیل ایسے نوعمر بارہ تیرہ سالہ حکمران کی بے تدبیری کے باعث اس کی کھوئی ہوئی دمشق کی حکومت اور ہاتھ سے نکلے ہوئے ایک ایک شہر کو پھر عیسائیوں سے واپس لینے کی ہمت کی۔

سلطانی فتوحات کے سلسلے میں صلیبی جنگوں کی معرکہ آرائی خاص کر قابلِ ذکر ہے جن کا آغاز مذہب کی بنیاد پر اوّل اوّل عیسائیوں کی طرف سے اُس وقت ہوا جب سلجوقی مسلمانوں نے قونیہ میں اسلامی حکومت قائم کی۔ اس موقع پر ایک فرانسیسی راہب بطرس نے ارضِ روم سے عیسائیوں کا تسلط اُٹھتے دیکھ کر

پاپائے روم اور بانس کے پاس جا کر فریاد کی کہ قونیہ میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو جانے سے ارض مقدس اور آثار مسیح خطرے میں پڑ گئے ہیں۔ تو اُس نے مذہب کے نام پر عیسائیوں کو مسلمانوں کے خلاف برانگیختہ کیا۔ اور ان کے دلوں کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اس قدر پُر غضب کر دیا کہ مذہبی یا صلیبی جنگ کے نام سے ان کی لڑائیوں کا سلسلہ سلجوقیوں کے زمانے سے لے کر ۴۹۰ھ سے ۶۹۰ھ سلطان صلاح الدین ایوبی کی اولاد کے زمانے تک پورے دو سو برس جاری رہا۔

اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے کے لیے عیسائیوں کی سب سے پہلی صلیبی فوج ۴۸۹ھ، ۱۰۹۶ء میں یورپ سے روانہ ہوئی۔ آگے آگے راہب تھا اور پیچھے پیچھے فوج۔ جا بجا لوٹ مار کرتی اور ہنگری اور بلغاریہ کے لوگوں سے لڑتی ہوئی ایشیائے کوچک (قونیہ) میں جا پہنچی، جہاں سلطان قلیج ارسلان کے ساتھ صلیبیوں کا مقابلہ ہوا۔ اور سلطان نے مردانہ وار مقابلہ کر کے سب کو ختم کر ڈالا حتیٰ کہ اس کے ہاتھ سے ایک بھی عیسائی زندہ بچ کر نہ جا سکا۔

دوسری مرتبہ صلیبی جنگ ۵۴۲ھ میں برپا ہوئی۔ سلطان نورالدین زنگی نے عیسائیوں کے ناپاک عزائم کے جواب میں اُن پر سخت حملے کیے۔ "رہا" جسے عیسائیوں نے اس سے پہلے سلجوقیوں کی جنگ میں سات اکھ عیسائیوں کی مدد سے فتح کر لیا تھا۔ سلطان نورالدین زنگی نے اپنے چند ہزار سپاہیوں کو ساتھ لے کر اُن سے پھر واپس لے لیا۔ اور عیسائیوں پر ان کی شجاعت کا ایسا رعب غالب آیا کہ وہ سلطان نورالدین زنگی کے مقابلے سے ہمت ہار

بھیجے اور اد جانیوس پاپائے روم سے فریاد کی کہ اہل مغرب کو امداد کے لیے بھیجے۔ چنانچہ اُس نے اطالیہ، فرانس، جرمنی، آسٹریا اور انگلستان وغیرہ تمام مغربی ملکوں میں مذہبی جنگ چھیڑ جانے کا اعلان کیا اور ان تمام ملکوں سے صلیب پر مرمٹنے والے عیسائی فدائی سلطان نورالدین زنگی کے پایہ تخت دمشق پر حملہ کرنے کے لیے پہنچ گئے۔ شاہِ فرانس لوئیس ہفتم اور شاہ جرمنی کونراڈ کے ہاتھ میں فوجوں کی کمان تھی انھوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا، لیکن اس کے باوجود سلطان نورالدین کے مقابلے سے تمام عاجز رہے۔ اور کچھ نہ کر سکے۔

پھر جب ۵۶۹ھ میں سلطان نورالدین زنگی نے انتقال فرمایا تو اسلام اور مسلمانوں کی خدمت اور حفاظت کے لیے صلیب پرستار عیسائیوں کے مقابلے میں پوری قوت کے ساتھ سلطان صلاح الدین ایوبی آ گیا اور اُن سے پورے چودہ برس تک مسلسل نبرد آزما رہا۔ حتیٰ کہ ایک ایک کر کے شام کے تمام شہر اُن کے ہاتھ سے نکال لیے اور بیت المقدس بھی واپس لے لیا۔

صلیب پرست عیسائیوں کے ساتھ سلطان کے مجاہدات کا آغاز ۵۷۰ھ میں ہوا جب عیسائیوں نے ایک لشکر جرار لے کر دمشق کا رُخ کیا۔ اور جو قصبے اور آبادیاں راستے میں آتی گئیں اُن میں لوٹ مار، قتل و غارت کرتے آگے بڑھتے گئے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی نے انھیں روکنے کے لیے اپنے بہادر بھتیجے فرخ شاہ کو ایک لشکر دے کر بھیج دیا۔ اور پھر خود بھی ایک لشکر لے کر عیسائیوں کے حملے کا جواب دینے کے لیے کسی دوسرے راستے سے چل دیا۔ مختصر یہ ایک طرف سے گھیرے میں لے کر فرخ شاہ نے

عیسائیوں کی سرکوبی کی اور دوسری طرف سے گھیر کر سلطان صلاح الدین ایوبی نے مزاج بحال کیا۔ پھر اس کے بعد وہ دونوں چچا، بھتیجا سلطان ایوبی اور فرخ شاہ عیسائیوں کے علاقے کی طرف بڑھتے چلے گئے اور اُن کے مشہور قلعہ بانیاس کا محاصرہ کر لیا۔ اگرچہ پہلے پہل عیسائیوں نے مسلمانوں کا خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا تاہم سلطان کے پُرجوش حملے کی تاب نہ لا کر بالآخر بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہزاروں عیسائی قتل ہو گئے اور ہزاروں گرفتار کر لیے گئے۔ اور قلعے پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا جس میں سے لاکھوں روپے کا مال واسباب مالِ غنیمت کے طور پر مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ علاوہ ازیں والی رملہ اور والی نابلس بھی دیگر عیسائیوں کے ہمراہ مسلمانوں کی قید میں آئے۔ سلطان نے جب ان دونوں کو اپنے حضور میں بلوایا تو ان سے ڈیڑھ لاکھ دینار فدیے کے طور پر وصول کیے اور اُن ہزاروں مسلمانوں کو جو عیسائیوں کی قید میں تھے ان کے حکم سے آزاد کرایا اور اس کے بعد عزت سے رخصت کر دیا۔ باوجود اس کے کہ ان عیسائی بادشاہوں نے جنگ رملہ میں مسلمانوں کے ساتھ سخت بدسلوکی روا رکھی تھیں۔ سلطان نے ان پر کوئی زیادتی نہیں کی بلکہ وہ جتنے دن مسلمانوں کی قید میں رہے۔ عزت اور حفاظت سے رہے۔ پھر اس کے بعد ۵۷۶ھ میں سلطان مراجعت فرمائے مصر ہوا۔

۵۷۷ھ میں سلطان نور الدین کا نوجوان بیٹا ملک الصالح اسمٰعیل انتقال کر گیا اور اس کے مرنے کے بعد سلطنت دمشق میں کچھ ایسی افراتفری پڑی کہ سلطان ایوبی کو زنگی حکومت کے تمام علاقے حلب، رہا، سنجار،

موصل اور دمشق وغیرہ اپنی سلطنت میں شامل کرنے پڑے۔ یہ زمانہ بے حد پُر آشوب تھا۔ ایک طرف فاطمیوں کے شیعوں نے صلیبی عیسائیوں سے مل کر اس کے خلاف سازباز کر رکھی تھی۔ دوسری طرف خود عیسائیوں نے پُرزور حملوں کی تیاریاں شروع کی ہوئی تھیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ خود مسلمانوں نے اپنی خواہشات اور ذاتی مفادات کے لیے اسلام کی خدمت اور مسلمانوں کی حفاظت کے فرض کو فراموش کر رکھا تھا یہی سبب ہے کہ ملک الصالح اسماعیل کے مرنے کے بعد سلطان کو خود مفاد پرست مسلمانوں سے بھی اُلجھنا پڑا۔

مختصراً یہ کہ ایک طرف مصر کے انتظامات اور دوسری طرف دمشق کے حالات کی خبرگیری، تیسری طرف مسلمانوں (بالخصوص فاطمی شیعوں) کی سازشوں اور مخالفتوں کا سدّباب کرنے کے بعد جب سلطان فارغ ہوا تو اُس نے سب سے پہلے اُن عیسائیوں کی سرکوبی کی طرف توجہ کی جو سلطان کو اندرونی معاملات میں اُلجھا ہوا دیکھ کر مسلمانوں پر ظلم و ستم ڈھا رہے تھے اور ان کی دست درازیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ چنانچہ ۱۸ جمادی الآخر ۵۷۹ھ میں سلطان نے بیسان پر چڑھائی کی یہاں کے عیسائی شہر خالی کر کے پہاڑوں پر چلے گئے اور وہیں سے تیر پھینکنے لگے۔ چار پانچ دن اسی حالت میں گزر گئے۔ بالآخر مسلمانوں نے بیسان پر قبضہ کر لیا۔

اس کے بعد سلطان جالوت نام ایک شہر کی سرحد میں داخل ہوا۔ یہاں پہنچ کر سلطان کو معلوم ہوا کہ عیسائیوں کا ایک بہت بڑا لشکر بڑے جوش و خروش کے ساتھ مسلمانوں کے مقابلے کو آ رہا ہے۔ سلطان نے اُسی وقت اپنے لشکر کی باقاعدہ صف بندی کر کے میمنہ، میسرہ اور لشکر کے قلب و مقدمہ کو درست

کیا۔ اگرچہ اس موقع پر عیسائیوں کے لشکر کی تعداد بہت زیادہ تھی جس میں اٹلی کے جانثار اور عیسائی سوداگر بھی شامل تھے۔ ایک مغربی مفکر لکھتا ہے۔ کہ مذہب کے نام پر لڑی جانے والی اس جنگ میں عیسائیوں کی اس قدر فوج اس سے پہلے فلسطین کے کسی میدان میں اکٹھی نہیں ہوئی۔ تیرہ سو نائٹ، سولہ سترہ ہزار پیادہ و سوار مسلح اور قواعد جنگ سے واقف تھے۔ اس کے علاوہ یورپ کے تمام بڑے بڑے لوگ، امراء اور شاہزادے بھی اس میں شریک تھے۔ مچاؤ لکھتا ہے کہ فلسطین کے قریب ہی صفوریہ نام کے ایک شہر میں بھی پچاس ہزار سپاہیوں کا لشکر لڑنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔

سلطان صلاح الدین کے لشکر کی کیفیت یہ تھی کہ اس کی فوج کا تھوڑا سا حصہ جسے اس نے مقدمہ کے طور پر آگے بڑھایا تھا صرف پانچ پانسو تیر انداز اور تیغ زن سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ اب اس سے اندازہ کر لیجیے کہ جب مقدمہ لشکر کی تعداد صرف پانسو تھی تو سپاہ کی کل تعداد کتنی ہوگی۔ قصہ کوتاہ یہ کہ نہر جالوت پر دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ لڑائی تمام دن جاری رہی۔ اب اس دوران میں عیسائیوں کو باوجود بکثرت ہونے کے مٹھی بھر مسلمانوں کی شجاعت و استقامت سے خطرہ محسوس ہونے لگا اور مسلمانوں کو اپنے تھوڑے ہونے اور دشمن کے زیادہ ہونے کا خیال ستا رہا تھا کہ عین اسی عالم امید و بیم میں سلطان اپنے لشکر کے قلب کو لے کر آ پہنچا اور آتے ہی نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ جس سے یک بیک فضا گونج اٹھی اور قصہ نے چاروں طرف سے عیسائیوں کو گھیر لیا۔

جس روز سلطان اپنے لشکر کو لے کر پہنچا تھا۔ اس کے آنے کا عیسائیوں کے

دلوں پر اس قدر اثر ہوا کہ وہ تمام دن خیموں میں پڑے رہے اور خوف کے مارے باہر نہ نکل سکے اور دوسرے دن لڑائی سے طرح دے کر اپنے اپنے مقامات کی طرف نکل بھاگے اور مسلمانوں نے کمال شجاعت سے آگے بڑھ کر اُن کے کتنے ہی قلعوں پر قبضہ کر لیا اور بہت سے قصبے اور علاقے اُن کے قبضے میں آ گئے۔ اور بیسان و طبریہ کو سرکش اور مغرور عیسائیوں سے بالکل پاک صاف کر دیا گیا۔

۵۸۰ھ میں سلطان ایوبی عیسائیوں کے ایک اہم فوجی اور مذہبی مرکز کرک پر فوج کشی کے ارادے سے بڑھا لیکن سلطان کے جاسوسوں کی غلط اطلاع پر کہ عیسائیوں کی ایک بہت بڑی جماعت مصر کے راستوں پر قبضہ جمانے کے لیے چل پڑی۔ سلطان کو اپنا ارادہ بدل دینا پڑا۔ اور وہ بجائے کرک پر حملہ کرنے کے مصر کی طرف چل پڑا۔ اور آگے پہنچ کر اُسے معلوم ہوا کہ جاسوسوں کی اطلاع غلط تھی اور عیسائیوں نے کرک کو اور زیادہ مضبوط بنانے کے لیے نمایاں کامیابی حاصل کر لی۔

عیسائیوں نے مسلمانوں کو دھوکا دے کر تباہ کرنے کی جو صورت نکالی تھی سلطان صلاح الدین نے اُس کا ازالہ اس طرح کیا کہ کرک سے توجہ ہٹا کر فوراً دوسرے شہر نابلس پر حملہ کر دیا، جس میں سینکڑوں عیسائی مارے گئے اور سینکڑوں گرفتار کر لیے گئے۔ پھر یہاں سے آگے بڑھ کر سبسطیہ پر قبضہ کر لیا اور وہاں صلیب کی بجائے اسلامی علم بلند کیا وہ مظلوم مسلمان جو سبسطیہ کے عیسائیوں کے ہاتھوں قید تھے۔ انھیں رہائی دلائی اور پھر دمشق واپس چلا گیا۔

۵۸۲ھ تک سلطان نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کی

روز بروز بڑھتی ہوئی عداوت اور مخالفت کو روکنے کے لیے جن شہروں کو فتح کیا اور ان پر اسلامی حکومت کے پھریرے لہرائے اُن میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں: طبریہ، عکا، زیب، معلیا، اسکندریہ، تبنین، ہونین، ناصرہ، غور، صفوریہ، فولہ، جنین، ارعین، دبوریہ، عضربلا، بیان، بلسطیہ، نابلس، لجون، ارسیما، سنجل، بیرہ، بافا، ارسوف، قیصاریہ، حیفا، صرفند، صیدا، بیروت، قلعہ ابی الحسن، جبیل، سنجدل یابا۔ جبل الجلیل، مجدل حباب، دارودم، عزہ، عسقلان، تل صیافیہ، تل احمر، اطرون، بیت جبریل، جبل الخلیل، بیت اللحم، لاب، ریلہ، قریتا القدس، صوبا، ہرمز، ضلع، عضرا، سقیف۔ ان مقامات پر باوجود فاتح ہونے کے مفتوحین نے سلطان کی حکومت کو دل سے پسند کیا۔ سبب اس کا یہ تھا کہ سلطان عدل پرور اور منصف مزاج تھا۔ سلطان نے صرف انہی عیسائیوں سے تعرض کیا جو مسلمانوں پر سخت ظلم و ستم ڈھاتے تھے اور مسلمانوں کے خلاف قتل و غارت گری اُن کی فطرت میں داخل ہو چکی تھی۔

سلطان جب کبھی سنتا کہ کسی مقام پر عیسائیوں نے مسلمانوں کو لوٹ لیا اور قید کر لیا۔ اُن کے ننگ و ناموس پر ڈاکہ ڈالا۔ اُن کے بیوی بچوں کو سخت مصیبت میں مبتلا کیا ہوا ہے تو اُس کے دل میں سخت ہیجان برپا ہو جاتا غیرت ملی کے جوش میں دانت پیسنے لگتا اور دل ہی دل میں کہتا کہ ذرا ٹھہرو تم سے ان زیادتیوں کا ایسا بدلہ لیا جائے گا کہ تم ہمیشہ یاد رکھو گے اور پھر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سربسجود ہو کر گڑگڑا کر دعا کرتا کہ اے اللہ مجھے اسلام کی حمایت اور مسلمانوں کی حفاظت کے لیے ہمت اور طاقت عطا فرما۔

۵۸۳ھ میں سلطان ایک بہت بڑے معرکے کے لیے تیار ہوا۔ پھر نصر من اللہ وفتح قریب پڑھتے ہوئے لشکر اسلام کی ترتیب دی۔ اپنے بیٹے ملک الافضل کو سپہ سالار مقرر کیا اور فوج کا ایک دستہ اپنے ساتھ لے کر اسلامی لشکر کو عکا کی طرف بڑھنے کا حکم دیا۔ اور خود بصرے کی طرف چل پڑا۔ پرنس ارناٹ والی ارناط نہایت بدعہد اور بدکردار تھا۔ وہ اکثر حاجیوں کے قافلے لوٹ لیتا اور مسلمان تاجروں کا مال واسباب چھین کر قید کر لیتا اور مسلمان عورتوں اور بچوں کو نہایت بے رحمی سے قتل کروا دیتا تھا۔ اس راستے سے چونکہ مسلمانوں کا ایک قافلہ نکلنے والا تھا اس لیے سلطان کے یہاں بروقت پہنچ جانے سے پرنس ارناٹ کے ہوش وحواس درست ہو گئے اور قافلہ صحیح سلامت وہاں سے گزر گیا۔

ادھر ملک الافضل کی سپہ سالاری میں جب اسلامی لشکر صفوریہ کے میدان میں پہنچا تو عیسائیوں کے دل مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے یہاں اکٹھے ہو گئے۔ دوسرے روز نماز فجر کے وقت مسلمانوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ پہلے نماز ادا کی اس کے بعد لشکر کی صفیں درست کر کے مقابلے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ ادھر پُرجوش عیسائیوں کا لشکر جرار بھی خیموں سے نکل آیا اور صفیں درست کر کے مقابلے کے لیے ڈٹ گیا۔ اب لڑائی شروع ہو چکی تھی مسلمانوں نے پانسو تیراندازوں کی ایک جماعت کو آگے بڑھا کر تیر برسانے شروع کیے جس سے ایک ایک کر کے عیسائیوں کے صلیبی سپاہی گرنے لگے۔ لیکن وہ ایک بہت بڑی تعداد میں آگے جمے کھڑے تھے اور چاہتے تھے کہ اور آگے بڑھ جائیں تاکہ مسلمانوں سے دست بدست لڑنے کی نوبت نہ آئے۔ مسلمانوں نے

اُن کے ارادوں کو بھانپ لیا اور فوج کے ایک حصّے کو تھوڑا سا پیچھے ہٹا کر اس کی جگہ نیزہ بازوں کو آگے بڑھا دیا۔ اور نیزہ بازوں نے اپنی فہم و فراست سے کام لیتے ہوئے بڑی دلیری اور شجاعت کے ساتھ آگے بڑھتے ہی عیسائیوں کو نیزوں کی نوک پر دھر لیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد نیزہ بردار حصّے کو پیچھے ہٹا کر شمشیر بکف بہادران اسلام آگے بڑھے۔ اور ان کی تلواریں دشمنوں کے سر پر بجلی کی طرح کوندنے لگیں۔ یہاں تک کہ دست بدست لڑائی ہونے لگی اور مکمل ایک پہر تک تلوار چلتی رہی اور میدانِ جنگ میں کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ حتیٰ کہ دوپہر کے وقت عیسائیوں کا حملہ کمزور ہو گیا اور اُن کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے۔ مسلمانوں نے دشمن کو جب اس حالت میں پایا تو نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے ذرا اور جوش سے حملہ کیا۔ اتنے میں مسلمانوں کی تازہ دم تھوڑی سی فوج اور بھی آ گئی اور اس نے آتے ہی اس جوش و خروش سے حملہ کیا کہ عیسائیوں کے ہوش و حواس جاتے رہے اور اُن میں بھگدڑ مچ گئی۔ غرض کامیابی نے آگے بڑھ کر مسلمانوں کے قدم چوم لیے اور عیسائی فوج باوجود بکثرت اور ساز و سامان سے لیس ہونے کے میدانِ جنگ سے بھاگ نکلی۔

فرانسیسی مورخین لکھتے ہیں کہ اس لڑائی میں عیسائیوں کو اتنا موقع بھی نہ مل سکا کہ وہ اپنے مقتولین کی لاشوں کو اُٹھا کر لے جا سکیں یا زخمی عیسائیوں کے لے جانے کا انتظام کر سکیں۔ اس لڑائی میں عیسائیوں کو غیر متوقع نقصان پہنچا۔ صرف تین عیسائی زندہ بچے جن سے لڑائی کے کچھ حالات معلوم ہو سکے۔ باقی سب کے سب یا تو قتل ہو گئے یا مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔

اب سلطان صلاح الدین اور ملک الافضل دونوں صفوریہ کے مقام پر آملے، جہاں سلطان نے فوج میں مالِ غنیمت تقسیم کیا اور ایک موثر تقریر بھی کی جس سے اسلامی لشکر کے دل اور بھی بڑھ گئے۔ اور آئندہ اس سے بھی زیادہ جانبازی دکھانے کا عزم کر لیا۔ ہر چند اس موقع پر تمام لشکرِ اسلام کی تعداد صرف بارہ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ لیکن جوشِ جہاد اور شوقِ شہادت نے اس کے حوصلے کو لاکھوں کی تعداد کا مقابلہ کرنے کو بڑھا رکھا تھا۔ اب سلطان نے عسقلان کا رُخ کیا۔ لیکن یہاں کے باشندے سلطان کی شجاعت اور دلیری سے کچھ اتنے مرعوب تھے کہ انھوں نے بغیر لڑے بھڑے سلطان کی اطاعت قبول کر لی۔

ہر چند سلطان نے اب تک چاروں طرف کے عیسائیوں سے کئی ایک لڑائیاں لڑیں اور اُنھیں شکستِ فاش دی اور دس ہزار مسلمانوں کو ان کی قید سے نکالا مگر عیسائیوں کا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف عام اتفاق اور جوش و خروش پھر دوسری صورت اختیار کر لیتا۔ چنانچہ وہ پھر بدعہدی کر کے مسلمانوں پر ظلم و ستم ڈھانے اور انھیں لوٹنے اور قتل و غارت گری کرنے پر پھر کمر باندھ لیتے۔ چنانچہ ایسے ہی لوگوں میں سے ایک رینا ڈری کرک اور انطاکیہ کا فرماں روا تھا جو مسلمانوں سے شکست پر شکست کھانے کے باوجود نہیں مانتا تھا وہ اکثر عرب کی سرحد پر حملے کرنے اور مسلمانوں کو لوٹنے اور قتل کرنے سے باز نہ آتا تھا۔ حاجیوں کے قافلے بھی اس کے ظلم و ستم کے پنجے سے محفوظ نہیں رہے۔ وہ اکثر مسلمانوں کو قید میں ڈالتا اور بہت سوں کو قتل کرا دیا تھا

سلطان نے اس سے پہلے کہ وہ اس کا مزاج بحال کرنے کے لیے آگے بڑھے۔ اتمامِ حجت کے طور پر اُسے تنبیہ کی اور فلسطین کے بادشاہ بالڈون سے اُس کی شکایت کی مگر بالڈون نے تعصب کی راہ سے تُسنی اَن سُنی کر دی۔ اس پر سلطان نے فلسطین پر چڑھائی کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ چنانچہ ربیع الآخر کی بائیسویں تاریخ ۵۸۳ھ میں سلطان بحیرۂ طبریہ کے مقام پر آ کر خیمہ زن ہوا، جہاں پہاڑ کے نیچے دُور دُور تک عیسائی سپاہ کے خیمے پھیلے ہوئے تھے۔

سلطان نے رات کی تاریکی میں اپنی فوج کو تین حصوں میں تقسیم کر کے عیسائی فوجوں کو تین طرف سے چپکے چپکے گھیر لیا اور پھر دوسرے دن صبح ہوتے ہی طبریہ کو فتح کر لیا۔ جب پرنس ارنلڈ اور ڈری منڈ کو پتہ چلا تو وہ فوراً طبریہ کی طرف بڑھے۔ ادھر سلطان بھی اُن کے آتے ہی میدان میں آ نکلا اور قربیہ لوبیا کے مقام پر معرکہ آرائی ہوئی۔ عیسائیوں نے پہلے تیروں سے لڑائی شروع کی، پھر دست بدست لڑنے لگے۔ حتیٰ کہ صبح سے دوپہر تک غضب کی تلوار چلتی رہی۔ پھر جب ظہر کی نماز کا وقت آیا تو اسلامی لشکر نے نصف نصف ہو کر نماز پڑھی۔ پہلے آدھی فوج لڑائی چھوڑ کر نماز میں مشغول ہوئی۔ پھر جب وہ فارغ ہو چکی تو دوسری آدھی فوج نماز پڑھنے آئی اس میں خود سلطان بھی تھا۔ عیسائیوں نے مسلمانوں کے نماز پڑھنے کا یہ منظر بڑی حیرت سے دیکھا۔ ڈری منڈ نے پادریوں سے کہا معلوم ہوتا ہے مسلمانوں کا یہی طرزِ عمل اُن کی فتح کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔

مختصراً یہ کہ تمام دن جنگ ہوتی رہی۔ نیچے سے ریتیلی زمین اور اُوپر

سے آسمان کی چلچلاتی دھوپ۔ اس پر مستزاد یہ کہ پانی کا کوسوں نام و نشان نہ ملتا تھا۔ مگر اس کے باوجود لڑائی جاری رہی۔ اگرچہ مسلمانوں کی تیغ خارا شگاف سے عیسائی دھڑا دھڑ زمین پر آ رہے تھے۔ لیکن اُن کی تعداد بہت زیادہ ہونے کے سبب اُن کا سلسلہ نہ ٹوٹتا تھا۔ ایک مرتا تھا تو فوراً دوسرا آ کر اس کی جگہ لے لیتا تھا۔ غرض اسی عالم میں تمام دن گزر گیا۔ رات کی تاریکی بڑھنے لگی۔ اور لڑائی دوسرے دن پر ملتوی ہو گئی۔

دوسرے روز صبح ہوتے ہی پھر لڑائی شروع ہوئی مسلمانوں نے نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہی تلواریں میان سے نکالیں اور ٹوٹ پڑے۔ عیسائیوں نے تھوڑی دیر تو مقابلہ کیا، مگر پھر قدم اُکھڑ گئے اور ریمنڈ اپنی فوج کو لے کر صور کی طرف نکل بھاگا۔ اور باقی دوسری فوج حطین کی طرف بھاگ نکلی مسلمانوں نے اس کا تعاقب کیا۔ اور تھوڑی ہی دُور جا کر ایک طرف سے سلطان کے بیٹے ملک الافضل نے اور دوسری طرف سے خود سلطان صلاح الدین نے انہیں گھیرے میں لے لیا۔ تین ہزار عیسائی گاجر مولی کی طرح کاٹ کر پھینک دیئے گئے۔ پرنس ارناٹ۔ ہنری والئ طبریہ۔ بادشاہ یروشلم اور بڑے بڑے پادریوں کو گرفتار کر لیا۔

تیسرے روز سلطان نے دربار منعقد کیا اور اس کے حضور میں سب سے پہلے شاہی قیدی لائے گئے۔ جن میں یروشلم کا بادشاہ۔ پرنس ارناٹ اور اس کا بھائی جافرے بھی تھا۔ جو یورپ کا سب سے بڑا بادشاہ تھا۔ اس کے بعد دوسرے عیسائی سردار اور پادری صاحبان لائے گئے۔ سلطان نے جافرے

(گوسے دی لوزینا) کی بڑی عزت کی۔ وہ اُس وقت بہت پیاسا تھا۔ سلطان نے اس کے لیے برف کا شربت منگوایا۔ اس پر جافرے کے بھائی پرنس ارناڈ نے بھی پیاس کی شدت ظاہر کی۔ چنانچہ اُس کے لیے بھی ایک گلاس منگوا کر دیا گیا۔ مگر سلطان نے یہ واضح کر دیا کہ یہ شربت آپ اپنی طرف سے پلا رہے ہیں۔ میرے نزدیک تو یہ شخص کسی رعایت کا مستحق نہیں۔ بات یہ تھی کہ پرنس ارناڈ نہایت بدعہد اور بدکردار تھا اُس نے ایک مرتبہ معاہدہ کر لینے کے بعد مسلمانوں کی ایک جماعت کو ناحق شہید کر ڈالا اور کہا تھا کہ میرے مقابلے میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کون مدد کرتا ہے دیکھتا ہوں۔ اب جو یہ گرفتار ہو کر سلطان کے حضور میں پہنچا اور سلطان اُس کے بارے میں قسم کھا چکا تھا کہ اگر وہ میرے ہاتھ آ گیا تو اسے ضرور اپنے ہاتھ سے قتل کروں گا۔ اس لیے سلطان پر اس کا قتل کرنا لازم آ گیا اور دوسرے کسی شخص کو پانی پلا کر قتل کرنا چونکہ اسلام کی سپاہیانہ روح کے منافی ہے لہٰذا سلطان کے لیے اس بات کا اظہار بھی ضروری ہو گیا کہ وہ اُسے اپنی طرف سے شربت نہیں پلا رہا بلکہ خود پرنس کا بھائی جافرے پلا رہا ہے۔ جب پرنس ارنلڈ پرنس (انو دوی شاتیلون) شربت پی چکا تو سلطان نے تلوار اُٹھائی اور کہا کہ دیکھ میں محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدد کے لیے آ رہا ہوں تو اگر اب بھی اطاعت قبول کر لے تو چھوڑ دوں گا۔ لیکن اس کی بدبخت روسیاہ کی قسمت میں قتل ہونا ہی لکھا جا چکا تھا اس لیے جونہی اس نے انکار کیا اس کی گردن تلوار کے ایک ہی وار سے دھڑ سے الگ ہو کر زمین پر آ رہی۔ جافرے اپنے

بھائی کے قتل سے سہم گیا۔ سلطان نے اسے تسلی دی اور اطمینان دلایا کہ وہ اسے قتل نہیں کرے گا۔ یہ تو غدار، بے دین اور بد عہد تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ انبیاء کی شان میں زبان چلاتا تھا۔ گستاخیاں کرتا تھا اس لیے یہ اسی سزا کا مستحق تھا۔

اب اس کے بعد سلطان طبریہ کے قلعے کی طرف متوجہ ہوا۔ شہر طبریہ اگرچہ مسلمان لے چکے تھے لیکن قلعے پر بدستور عیسائیوں ہی کا قبضہ تھا۔ اہلِ قلعہ سلطان سے امان کے طلبگار ہوئے۔ چنانچہ انھیں امان دے دی گئی۔ والیٔ طرابلس کی ملکہ جو اس قلعے میں پناہ گزیں تھی۔ اسے نہایت حفاظت اور احترام کے ساتھ اُس کے شوہر کے پاس بھجوا دیا گیا اور عیسائیوں کے ایسے دو سو قیدی قتل کر دیے گئے جن سے کسی نیکی، بھلائی اور اصلاح احوال کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ کئی مرتبہ بد عہدی کر چکے تھے اور سرکشی اور بغاوت سے بھی کبھی باز نہ آتے تھے۔ باقی عیسائی قیدیوں کے ایک گروہ کو تھوڑی بہت ڈانٹ ڈپٹ اور تنبیہ کر کے چھوڑ دیا گیا۔ اس کے بعد جو قیدیوں کا گروہ رہ گیا۔ اس کے بارے میں دمشق میں اپنے نائب کے نام لکھ بھیجا کہ یہ قیدی جو تمھارے پاس بھجوائے جا رہے ہیں ان میں سے جو مسلمان ہونا چاہے اُسے رہا کر دیا جائے جو مسلمان ہونے کی بجائے فدیہ ادا کرنا چاہے اس سے پچاس دینار فدیہ لے کر اسے چھوڑ دیا جائے اور جو قیدی نہ مسلمان ہونے کو تیار ہو، نہ فدیہ ادا کرے اُسے قتل کر دیا جائے۔

بیت المقدس

بیت المقدس جو ہمیشہ سے انبیاء علیہم السلام کا مسکن رہا ہے۔ ابتداء میں رومیوں کے پاس تھا جو عیسائی مذہب کے پیرو تھے۔ جیسا کہ پچھلے ابواب میں بیان کیا جا چکا ہے کہ حضرت ابو عبیدہ ابن الجراح کی سپہ سالاری میں مسلمان سب سے پہلے ۱۵ھ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں پہلی مرتبہ نبیوں کے مسکن بیت المقدس میں داخل ہوئے تو تثلیث پرستوں کے سر نگوں ہو گئے اور ۴۹۱ھ تک بیت المقدس پر مسلمانوں ہی کا قبضہ رہا۔

پھر جب مسلمانوں میں باہمی اختلافات پیدا ہو کر اپنی انتہا کو پہنچ گئے اور اسلام کی مرکزی حکومت کمزور پڑ گئی حتیٰ کہ چھوٹی چھوٹی آزاد اور خود مختار مسلمان ریاستیں قائم ہو گئیں تو انہی میں سے ایک خلافت بنی فاطمہ مصر تھی جس نے خلافت عباسیہ بغداد سے دشمنی اور عداوت رکھنے کے سبب اُن عیسائیوں کو جن کے دلوں میں بیت المقدس پر قبضہ کر لینے کی آرزو ایک مدت سے چٹکیاں لے رہی تھی۔ بلاد شام پر قبضہ جمانے کا کھلا راستہ دے دیا۔ یہاں تک کہ ۴۹۲ھ میں عیسائیوں نے مصر و بغداد کے شیعہ سُنّی مسلمانوں کی باہمی ناچاقی و نفاق سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے جمعے کے روز بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔ متعصب درندہ صفت عیسائی صلیبی نشان لیے ہوئے شہر میں گھس گئے اور مسلمانوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس بے دردی سے قتل کیا کہ اس کے بیان سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

ساٹھ ہزار مسلمان جو مسجد اقصیٰ میں تھے وہیں قتل کر دیے گئے۔ حالانکہ وہاں خونریزی کرنا ہر مذہب کے نزدیک حرام ہے لیکن فاتح عیسائیوں نے فتح کی خوشی میں اسے بھی روا رکھا۔ اس کے علاوہ حاملہ عورتوں کے بچے پیٹ سے نکال نکال کر قتل کیے گئے۔ اور ان عورتوں کو طرح طرح کی تکلیفوں اور ایذا رسانیوں سے قتل کیا گیا۔ علمائے اسلام کے کپڑوں پر تیل ڈال کر انھیں زندہ جلایا گیا۔ مختصراً یہ کہ مسلسل آٹھ روز تک مسجد اقصیٰ میں مسلمانوں کا قتل و نہب کا سلسلہ جاری رہا۔ بیت المقدس کے گلی کوچے اور بازار مسلمانوں کے خون سے سُرخ ہو رہے تھے۔ جا بجا مسلمانوں کی لاشوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ خود مسجد اقصیٰ اور اس کے صحن میں مسلمانوں کا خون گھٹنوں گھٹنوں بھر رہا تھا۔ عیسائیوں کی اس ناپاک فتح کے تیسرے روز جو انصاف کا دن تھا مسلمان قیدیوں کی قسمت کا فیصلہ سنایا گیا۔ جس سے باقی ماندہ ہزاروں مسلمان قیدی پھر قتل کیے گئے اور ہزاروں مسلمانوں کے بارے میں یہ حکم دیا گیا کہ وہ اونچے اونچے میناروں سے اپنے آپ کو خود گرائیں اور ان کی ہڈیاں چُور چُور ہو جائیں۔ غرض اس ناپاک فتح میں پورے ستّر ہزار مسلمان شہید ہوئے۔ اور بیت المقدس کا شہر مصر کی شیعہ فاطمی خلافت بغداد کی عباسی سُنّی خلافت کے باہمی بغض و عداوت رکھنے کے نتیجے میں پانسو برس کے بعد مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر پھر عیسائیوں کے پاس چلا گیا۔

اب سلطان صلاح الدین جو اپنے تمام حریفوں، دشمنوں اور سازشی حکمرانوں پر قابو پا کر دمشق اور مصر سے بیت المقدس تک کے تمام راستوں اور

اس کے شہروں پر قبضہ کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے تو رجب کے مہینے کی پندرھویں تاریخ ۵۸۳ھ میں بیت المقدس کے غربی جانب جا پہنچا۔ اس وقت عیسائیوں کا بیت المقدس پر نہایت مضبوط اور مستحکم قبضہ تھا اور شہر میں ایک لاکھ عیسائی اُس وقت موجود تھے۔ اور ان کا سب سے بڑا مذہبی پیشوا "پطرس اعظم" اور بڑے بڑے شہرت یافتہ سردار بھی موجود تھے۔ عیسائیوں کی مسلح فوج کی تعداد ساٹھ ہزار تھی جو طرح طرح کے ریشمی کپڑوں اور قومی وردیوں میں ملبوس تھے۔ اُن کے گھوڑوں کے ساز و یراق بھی بہت خوبصورت تھے۔ اور ان کے اسلحہ بھی نہایت چمکدار اور تیز تھے۔ اور ان سب میں سلطان صلاح الدین کے خلاف اتحاد تھا۔ پادریوں نے سلطان کی اسلام اور مسلمانوں کے لیے بڑھتی ہوئی سرگرمیاں اور فتوحات دیکھ کر عیسائیوں کو جوش دلانا شروع کر دیا اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف گرجاؤں میں وعظ کہنے لگے۔ گرجاؤں کی حفاظت پر نہایت پُرجوش عیسائیوں کو مقرر کیا گیا اور پادریوں کی حفاظت کے لیے بھی نہایت جوشیلے نوجوان محافظ مقرر کیے گئے۔ اس کے علاوہ سینکڑوں نوجوان مذہب کے نام پر مختلف خدمات کے لیے رضاکارانہ طور پر بھرتی ہو گئے۔ جن میں سے چار دستوں کو جنگی ساز و سامان سے مسلّح کر کے یروشلم کے آس پاس مسلمانوں کی نقل و حرکت معلوم کرنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ علاوہ ازیں شہر کے اندر خوراک، روزمرّہ کے بڑے بڑے ذخیرے محفوظ کر لیے گئے۔ عیسائیوں کو اپنی طاقت فوج کی کثرت، مال و دولت اور جاہ و حشمت پر کچھ اتنا گھمنڈ تھا کہ خدا کو بھولے ہوئے تھے۔

رجب کے مہینے کی سولھویں تاریخ کو ابھی گرجوں کی آواز بلند نہ ہوئی تھی

سلطان نے فجر کی نماز ادا کرتے ہی فوج کی صف بندی کرا دی اور بارہ ہزار سر بکف مسلمانوں نے نعرۂ تکبیر اس زور سے بلند کیا کہ یروشلم کے تمام در و دیوار گونج اُٹھے۔ اس کے بعد گرجوں میں بھی ناقوس بجنے لگے اور اسی دوران میں عیسائیوں کا ایک تیر انداز دستہ جو یروشلم کے باہر گشت لگاتا پھرتا تھا مسلمانوں کے ایک دستے سے بھڑ گیا۔ پہلے دونوں نے ایک دوسرے پر تیر چلائے اور پھر تلواریں چلنے لگیں۔ اگرچہ دشمنوں کے بہت سے آدمی مارے گئے، تاہم مسلمانوں کا بھی ایک ایسا افسر شہید ہوا جو سینکڑوں مسلمانوں کی جگہ اکیلا کام کرتا تھا۔ مسلمانوں کو اس کی شہادت سے بڑا صدمہ پہنچا اس کے بعد لڑائی رُک گئی۔

سلطان نے پانچ روز تک بہ نفسِ نفیس خود چل کر فصیل کا معائنہ کیا، مگر فصیل کو ہر جگہ سے مضبوط اور مستحکم پایا۔ اس کے علاوہ منجنیق نصب کرنے کے لیے بھی کوئی ایسی جگہ نہ پائی جو فنِ جنگ کے اعتبار سے کامیابی پانے کے لیے موزوں ہو۔ آخر کار خدا کے بھروسے پر اُسے شمالی جانب ایک مقام پر تجویز کیا گیا جس کے بالکل سامنے کلیسائے صیحون واقع تھا۔ اور نہایت چپکے چپکے رات کی تاریکی میں مورچے قائم کر لیے گئے اور صبح ہوتے ہوتے منجنیق نصب کر لیے گئے۔ ایک گروہ عیسائیوں کا اِدھر سے گزرا۔ مسلمانوں نے سب کا سب چھانٹ ڈالا اور ایک فرد بھی اُس کا زندہ باقی نہ چھوڑا جو عیسائیوں کو مسلمانوں کی اس کارروائی سے آگاہ کرتے۔ پھر صبح ہوتے ہی مسلمانوں نے منجنیق سے پتھر پھینکنے شروع کر دیے اور اس کے جواب میں فصیل سے عیسائیوں نے بھی پتھر برسانے شروع کر دیے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کو فصیل تک پہنچنا بے حد مشکل ہو گیا۔ غرض تین دن اسی طرح گزر گئے اور

عیسائیوں کا بال تک بیکا نہ ہوا۔ بالآخر چوتھے روز اسلامی فوج نے امیر عزالدین علیسیٰ بن مالک کے زیر کمان جنگ وجدل کے شعلے تیز تر کر دیے۔ جس سے سینکڑوں عیسائی مارے گئے لیکن اس موقع پر عیسائی بھی کچھ کم نہ تھے وہ بڑی بے باکی اور بے جگری سے لڑے۔ یہاں تک کہ اسلامی فوج کا سپہ سالار امیر عزالدین عیسیٰ بن مالک شہید ہو گیا۔

مسلمانوں کو امیر عزالدین کے شہید ہو جانے کا دلی صدمہ تھا، وہ پانچویں روز کچھ ایسے جوش وخروش سے لڑے کہ عیسائیوں کے ہوش اڑ گئے اور پسپا ہو کر شہر کے اندر جا گھسے اور محافظوں نے اس سے پہلے کہ مسلمان اُن کے تعاقب کرتے ہوئے یہاں پہنچیں۔ فوراً شہر کے دروازے بند کر لیے۔ اور فصیل کے اُوپر سے تیر چلانے اور منجنیق سے پتھر پھینکنے شروع کر دیے۔ ہر چند عیسائیوں نے مسلمانوں کا خوب مقابلہ کیا۔ لیکن بالآخر انھیں مسلمانوں سے صلح کرتے ہی بنی۔ چنانچہ انھوں نے صلح کی درخواست دے کر اپنے ایک سفیر کو سلطان کی بارگاہ میں روانہ کیا، جہاں اُس نے حاضر ہو کر سلطان کی خدمت میں صلح کی درخواست پیش کی۔ سلطان نے اس سے کہا اے سفیر تم ذرا اس بات پر غور کرو کہ جب تمھاری قوم (عیسائیوں) نے بیت المقدس کو فتح کیا تھا تو اُس وقت ستّر ہزار مسلمانوں کو کس قدر سنگ دلی، بے رحمی اور شقاوت قلبی سے شہید کیا حتیٰ کہ مسلمانوں کا خون اس قدر بہایا کہ اُس میں گھوڑوں کے پاؤں گھٹنوں گھٹنوں تک ڈوبتے تھے۔ مسلمان بچوں اور عورتوں کے ساتھ کس قدر بہیمانہ سلوک کیا گیا تھا۔ کہ جس کی یاد آج تک مجھے خون کے آنسو رلاتی ہے۔ مسلمانوں کا تمام مال و اسباب

کیونکر ضبط کیا گیا اور مسجدوں کے ساتھ کیا شرمناک کارروائی کی گئی۔ اب اس کی یاد سے میرا دل کیونکر ٹھنڈا ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ اب میں بھی عیسائیوں کے ساتھ وہی سلوک کروں گا جو انھوں نے ۴۹۲ھ میں مظلوم مسلمانوں سے کیا تھا لیکن جب عیسائیوں کے بڑے بڑے لوگوں نے اور زیادہ عجز و انکسار سے کام لے کر سلطان سے گڑگڑا کر صلح کے لیے کہا تو اس موقع پر سلطان نے عفو و درگزر کرنے کو انتقام لینے پر ترجیح دی اور حکم دیا کہ فی مرد دس دینار، فی عورت پانچ دینار اور فی بچّہ دو دینار فدیے کے طور پر لے کر بیت المقدس کے تمام عیسائیوں کو رہائی دی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ جو شخص اپنی رضا و رغبت سے مسلمان ہونا چاہے وہ اسلام قبول کر کے ہمارا بھائی بن سکتا ہے۔ اُس کے حقوق بھی وہی ہوں گے جو ہمارے ہیں۔

جب اسلامی لشکر فاتحانہ شان سے شہر میں داخل ہوا تو سپاہیوں نے دیکھا کہ عیسائی اشرفیوں کے صندوق لیے جا رہے ہیں انہوں نے سلطان سے جا کر کہا کہ فاتح لشکر ایسی غنیمت سے کیونکر محروم کیا جاتا ہے۔ سلطان نے جواب دیا کہ بدعہدی ہمارا شیوہ نہیں۔ ہم نے جو کچھ حکم دیا ہے کہ اہلِ بیت المقدس مقررہ رقمیں بطور فدیے کے ادا کر کے شہر سے نکل جائیں ہم انھیں رہا کرتے ہیں۔ ہم اس عہد پر قائم رہیں گے اور مقرر کی ہوئی رقم سے ایک حبّہ زیادہ وصول نہیں کریں گے۔

غرض ایک ہفتے کے اندر اندر عیسائیوں کے تمام بڑے بڑے خاندان بیت المقدس سے نکل گئے اور شہر میں اب مسلمانوں کے سوا کوئی دوسرا شخص

نظر نہیں آتا تھا۔ پہلے جمعہ کو سلطان نے معمولی طور سے بیت المقدس میں نماز پڑھی اور دوسرے جمعہ تک اسے ہر طرح کی تعمیر و آرائش سے بقعۂ نور بنا دیا اور مسجد اقصیٰ اور بیت المقدس کی عمارتوں پر عیسائیوں نے جو اپنا تصرف کر کے تصویریں، مذبح اور مستراح وغیرہ بنائے تھے انھیں توڑ تاڑ کر درست کیا اور کفر و شرک کی ساری باتیں مٹا ڈالیں۔ اور محمد بن ابوالحسن علی بن محمد بن یحییٰ عثمانی قریشی کو مسجد اقصیٰ کا خطیب مقرر کیا۔ اور وہ منبر جسے سلطان نورالدین نے زرِ کثیر سے مسجد اقصیٰ کے لیے تیار کروایا تھا مگر سلطان مرحوم کو اس کے بیت المقدس بھجوانے کی مہلت نہیں ملی سلطان صلاح الدین نے اسے دمشق سے منگوا کر مسجد اقصیٰ میں نصب کروا دیا۔ اور شعبان کی چوتھی تاریخ کو ۵۸۲ھ میں جمعہ کے دن خلیفہ بغداد الناصر الدین اللہ عباسی کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔

بیت المقدس کی فتح کے بعد شعبان کے مہینے کی چوبیسویں تاریخ تک سلطان اسی مقدس مقام پر مقیم رہا۔ اس دوران میں اُس نے یہاں کئی مدرسے شفاخانے اور مسافر خانے بنوائے اور ان کے مصارف کے لیے بڑی کشادہ دلی سے اوقاف مقرر کیے۔ علماء، فضلاء، صلحا، شعرا اور طلباء کے لیے خاص کر نہایت عمدہ انتظامات کیے گئے۔ علاوہ ازیں زائرین کے آرام و آسائش اور ان کی سہولتوں پر بھی خاص توجہ کی گئی۔

فتح بیت المقدس کے بعد باوجود اس کے کہ سلطان نے ظالم عیسائیوں کو معاف کر دیا وہ مسلمانوں سے اُلجھنے کے پھر منصوبے تیار کرنے لگے۔ اب اُن کے زخم بھر رہے تھے اور جنگ کی تیاریاں پھر نئے سرے سے ہو رہی تھیں۔ بالآخر

۵۸۸ھ تک سلسلے وار پھیلتی چلی گئیں۔ پھر جب عیسائی قطعی عاجز آ گئے اور اُن میں مسلمانوں پر غالب آنے کی ہمت باقی نہ رہی تو مجبور ہو کر شعبان کے مہینے کی بائیسویں تاریخ ۵۸۸ھ میں ایک مصالحت نامہ لکھ کر مسلمانوں کے حوالے کیا اور لڑائی ختم کر دی۔ اور طے پایا کہ اسلامی اور عیسائی ملکوں میں لوگ بلا روک ٹوک آتے جاتے رہیں گے۔ انھیں کسی سے کوئی خطرہ ہوگا نہ خوف۔ ہر شخص آزادی سے زندگی بسر کر سکے گا۔

اس کے بعد سلطان دمشق واپس آ گیا۔ اور دمشق اُسے کچھ ایسا پسند آیا کہ پھر کبھی مصر جانے کا خیال بھی نہ کیا حتیٰ کہ یہیں سلطان کا سارا خاندان رہنے سہنے لگا۔ اور ۵۸۹ھ میں صفر کے مہینے کی ستائیسویں تاریخ کو ستاون برس کی عمر میں سلطان اللہ کو پیارا ہو گیا۔

سلطان کے سترہ بیٹے اور ایک بیٹی مونسرہ خاتون تھی، مگر افسوس کہ سلطان کے انتقال کے بعد اس کے بیٹوں اور عزیز و اقارب میں خود غرضی، خود رائی اور تفرقہ نے مسلمانوں کی مجموعی طاقت کو پھر منتشر کر ڈالا۔ سلطان کا بڑا بیٹا ملک الافضل، دمشق، بلادِ ساحل، بعلبک، صرخد، بانیاس وغیرہ کی حکومت کرنے لگا اور اس کے چھوٹے بیٹے ملک العزیز نے جو سلطان کے انتقال کے وقت مصر میں تھا۔ مصر میں اپنی ایک علیحدہ حکومت قائم کر لی۔ غرض جو بات ایک اکیلے سلطان نے حاصل کر کے قائم کی تھی وہ اس کے سترہ بیٹوں اور لمبے چوڑے خاندان کے ہاتھوں سے بھی قائم نہ رہ سکی۔

سلطان شہاب الدین غوری

اسلامی ہند سے پہلے

پاک و ہند کے تاریخی حالات جناب مسیح سے چھ سو برس پہلے کے عرصے تک تو معلوم ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس سے آگے چل کر یہاں کے حالات مطلقاً معلوم نہیں ہوتے۔ نہ کسی مقامی ادب، رامائن اور مہابھارت سے، نہ کسی غیر ملکی سیاح کے سفرنامے یا کسی یادگار سے! وجہ یہ ہے کہ مذہب اور علم پر صرف برہمنوں کی اجارہ داری قائم ہو جانے سے نہ عوام میں علم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو سکا نہ خود برہمنوں ہی کو تاریخ لکھنے کی اہمیت کا کوئی اندازہ ہوا۔ ان واقعات کی روشنی میں لامحالہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ پاک و ہند کی مسلسل اور مربوط تاریخ کا سلسلہ پاک و ہند میں مسلمانوں کی آمد ہی سے شروع ہوتا ہے کیونکہ تحصیل علم اور اشاعت علم اسلام کے نزدیک دین کا عنصر ہے۔ اس لیے مسلمانوں میں علم کی راہیں ہر کس و ناکس پہ کھل گئیں اور انھوں نے دنیا کی تمام قوموں پر اپنے علم و فضل کی برتری قائم کرنے کے لیے تاریخ نویسی کے فن کو رواج دیا اور اس معاملے میں مسلمان بلاشبہ دنیا کی تمام قوموں پر بازی لے گئے اور تمام اقوامِ عالم کے استاد کہلائے۔

مستند تاریخی حوالوں سے جہاں تک پاک و ہند کے حالات کا پتہ چلتا ہے وہ یہ ہے کہ ۶۴۸ء میں جب راجہ ہرش وردھن کا انتقال ہو گیا تو راجہ ہرش وردھن

کے مرتبے اور فضیلت کا کوئی اور حکمران یا راجہ نہ ہونے سے ہندوستان میں سخت انتشار اور طوائف الملوکی پھیل گئی۔ حتیٰ کہ مرکزی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور ہندوستان میں چھوٹی چھوٹی علیحدہ اور آزاد ریاستیں قائم ہو گئیں۔ یہی سبب ہے کہ جناب پیغمبر اسلام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی نامہ مبارک جیسا کہ حضورؐ نے عرب کے قبائل کو اسلام کے حلقے میں لانے کے بعد دیگر شاہانِ عالم اور امرائے زمانہ کے نام لکھوایا تھا۔ ہندوستان کے کسی راجہ یا حاکم کے نام دیکھنے میں نہیں آتا۔ سبب اس کا ظاہر ہے کہ ان احوال میں حضورؐ کسی سے کیونکر مخاطب ہوتے۔ اور کس کے نام نامہ مبارک ارسال فرماتے؟

ہندوستان کی ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے حکمران عام طور پر اپنے آپ کو راجہ کہلاتے تھے۔ مسلمانوں کے آنے سے پہلے یہاں جن راجاؤں کی ریاستیں مشہور تھیں اُن میں قنوج، اجمیر، دہلی، مالوہ، گجرات، بندھیل کھنڈ، میواڑ اور بنگال وغیرہ ریاستوں اور حکومتوں کے راجے مہاراجے خاص کر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ لوگ اپنے آپ کو راجپوت نسل سے ظاہر کرتے ہیں۔ ہندی میں راجپوت کے معنی راجہ کے بیٹے کے ہیں۔ کہتے ہیں ہندوستان کے قدیم زمانے کے لوگ نسل کے چار سلسلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ برہمن، کشتری، ویش اور شودر۔ راجپوت نسل کے لوگ جنھیں دنیا نے اس نام سے تقریباً ساتویں عیسوی میں جانا پہچانا انہی کشتریوں کی اولاد ہیں، مگر بعض مورخ اس بیان کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ گپتا خاندان کے بعد ہندوستان میں جہاں دیگر بہت سے غیر ملکی حملہ آور آئے وہاں ہُن، گوجر اور جاٹ وغیرہ لوگ بھی آئے جو بہت بہادر، جفاکش اور جنگجو تھے۔

یہ لوگ بالخصوص راجپوتانے اور پنجاب میں آباد ہوئے۔ ان میں سے وہ لوگ جو سیاسی طور پر غلبہ پانے اور تخت و تاج اور حکومتیں حاصل کرنے لگے راجپوت کہلائے۔ اور باقی جو لوگ رہے وہ جاٹ اور گوجر وغیرہ ناموں ہی سے معروف رہے۔

بعض لوگ ہندوؤں کے مذہب کی روایات کے حوالے سے یوں کہتے ہیں کہ ایک جنگجو شخص نے ملک میں کسی تعصب کی بنا پر ہندوؤں کا قتل عام شروع کر دیا حتیٰ کہ آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ تہ تیغ ہو گیا اور جو تھوڑے بہت لوگ کسی طرح بچ نکلے وہ جان بچا کر یہاں سے راجپوتانے کو بھاگ کھڑے ہوئے اور وہاں پہنچ کر ان لوگوں نے جو کشتریوں کی نسل سے تھے یہ دعا کی کہ ملک میں امن اور مذہب ہندو کے قائم رکھنے کے انتظامات ہو جائیں۔ قدرتِ خدا کہ انھیں اشارہ ہوا کہ وہ ایک پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر آگ روشن کریں چنانچہ ان لوگوں نے ایسا ہی کیا اور اس کے ساتھ ساتھ چالیس دن تک وہاں بیٹھ کر خدا کی عبادت بھی کی۔ آخر جب مدت پوری ہو گئی تو اس آگ سے چار بہادر آدمی برآمد ہوئے۔ پری ہار، پنوار، چوہان اور چالوکیہ یعنی وہ چاروں نوجوان ہیں جو آگے چل کر اس قوم کے چار قبیلوں کے بانی ہوئے جو خود کو راجپوت کہلاتے ہیں۔ ہر چند اس بات سے یہ تو ظاہر ہے کہ یہ ہندو مذہب کا بے بنیاد قصہ اور من گھڑت واقعہ ہے تاہم اس سے یہ ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ راجپوت قوم کے لوگ، ملکی نہیں غیر ملکی ہیں۔ اصل میں واقعہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ لوگ ہندوستان میں آئے اور یہاں ان کے جنگجویانہ خصائل اور جفاکشی کے عادات و اطوار سے واقف ہوئے تو انھوں نے ان کی بہادری سے فائدہ اُٹھانے کے لیے انھیں اپنے ساتھ

ملا لیا اور ہندوؤں میں چونکہ بات بات پر مذہبی رسمیں ادا کی جاتی تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس موقع پر برہمنوں نے انھیں اپنے ساتھ ملانے کے لیے کوئی ایسی ہندو رسم بھی ادا کی ہو۔ جس میں آگ روشن کی گئی ہو۔ پھر بعد میں ہوتے ہوتے اس واقعہ نے ہندوؤں کے نزدیک اُن کے مذہب کی روایتی حیثیت اختیار کر لی۔ غالباً یہی وہ سبب ہے جس نے راجپوتوں کی نظر میں برہمنوں کو نہایت محترم اور قابل عزت بنا دیا اور وہ ہندو مذہب کے تمام رسم و رواج کی دل سے پابندی کرتے تھے۔

غرض یہ تھے وہ لوگ جن سے پہلے پہل سلطان محمود غزنوی کو پالا پڑا اور اس کے مرنے کے ڈیڑھ سو برس سے کچھ اوپر عرصے کے بعد ۵۶۸ھ ۱۱۷۳ء میں سلطان شہاب الدین غوری کو آنا پڑا۔ دریں ایام خاندان غزنوی کے افراد مزعومہ اور ذاتی مفادات میں مبتلا ہو کر آپس میں ایک دوسرے سے اُلجھ رہے تھے اور ان کی باہمی کشمکش سے ہندوؤں کو فائدہ پہنچ رہا تھا جس سے مسلمان سخت نقصان اُٹھا رہے تھے۔ ایسے حالات میں یہی مناسب تھا کہ غزنوی خاندان کے نااہل اور کمزور جانشینوں کو حکومت کے تخت سے علیحدہ کر کے کسی ایسے خاندان کو برسر اقتدار لایا جائے جس سے مسلمانوں کی اکھڑی ہوئی ہوا از سر نو پھر بندھ جائے اور عیار ہندوؤں کے اسلام اور مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کے تمام منصوبے ملیا میٹ ہو جائیں چنانچہ قدرت الٰہی نے اب ہند کے مسلمانوں کے لیے غوری خاندان کو منتخب کیا جس کا سرخیل روح رواں سلطان شہاب الدین غوری تھا اور وہ اس بات کا تہیہ کر کے ہندوستان آیا تھا کہ ہندوؤں کی آئے دن کی شرارتوں اور سازشوں کا قلع قمع کرنے کے لیے ہند کو اسلام کی مملکت بنا کر ہی دم لے گا۔

نام و نسب

سلطان معز الدین المعروف محمد شہاب الدین غوری بن بہاء الدین بن اعز الدین حسین بن سام ایک ایسی نسل سے تھا جو ایرانیوں اور عربوں سے مخلوط تھی۔ اور آل شنسب کہلاتی تھی۔ شنسب اس خاندان کا مورث اعلیٰ تھا جس نے حضرت علی ابن ابی طالب کے زمانے میں اسلام قبول کیا اور اس کی اولاد اُن تمام جھگڑوں سے ہمیشہ الگ رہی جو اجتہادی غلطی یا ملوکیت کے سبب مسلمانوں میں پیدا ہوئے۔

غوری خاندان عام طور سے افغان اور سوری قبیلے سے متعلق بیان کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں ضحاک تازی کے دو نواسے سہمی اور سام دربار فریدوں میں ملازم تھے۔ کچھ عرصے بعد وہ دونوں یہاں سے نہاوند چلے گئے، جہاں سام کے بیٹے شجاع کی شادی سوری کی بیٹی سے ہو گئی۔ پھر اتفاق ایسا ہوا کہ کسی بات پر چچا بھتیجے میں ٹھن گئی۔ شجاع اپنے بیوی بچوں کو لے کر کوہستان غور آ گیا، جہاں اس کی اولاد بڑھی، پھیلی اور اس علاقے کی حکومت بھی اسی کے ہاتھ میں آ گئی۔ آخر اسی نسل کا وہ شخص شنسب ہے، جس کے نام پر آگے چل کر اس کی اولاد آل شنسب کہلائی۔ کہتے ہیں کہ فولاد شنسبی اسی خاندان کا بہادر سردار بیان کیا جاتا ہے جس نے امویوں کی حکومت ختم کرنے میں ابو مسلم خراسانی کے ماتحت رہ کر بڑا کام کیا۔

ولادت

غور کا مقام جہاں اس کے خاندان کے لوگ رہنے سہنے کی نسبت سے غوری کہلائے۔ ہرات اور غزنہ کے درمیان واقع ہے۔ اس علاقے کو سلطان محمود غزنوی نے ۱۰۱۰ء میں فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ اسی مقام پر ۵۴۲ھ میں سلطان شہاب الدین غوری پیدا ہوا۔ سلطان کے دادا اعزالدین حسین جس نے ۴۹۳ھ/۱۰۹۹ء میں غورستان میں ایک آزاد اور خود مختار حکومت کی بنا رکھی تھی۔ پہلے پہل سلطان ابراہیم غزنوی کے دربار سے وابستہ تھا اور غزنوی خاندان ہی میں اس کی شادی ہوئی جس سے خدا نے اُسے سات بیٹے عطا کیے جن میں سے ایک کا نام بہاءالدین تھا۔ بہاءالدین کے آگے دو بیٹے تھے۔ ایک غیاث الدین، دوسرے معزالدین جو بعد میں سلطان شہاب الدین غوری کے نام سے تخت نشین ہوا۔

اعزالدین حسین نے سلطان بہرام شاہ غزنوی کے زمانے میں وفات پائی اس کے بعد اُس کا بڑا بیٹا سیف الدین سلطنت کا مالک بنا۔ جس نے غزنہ کو بھی اپنی حکومت میں شامل کر لیا، مگر کچھ عرصے بعد غزنوی امراء میں اس کے خلاف ناچاقی پیدا ہو گئی اور ان سب نے مل کر اُسے قتل کر ڈالا۔ سیف الدین کے دوسرے بھائی بہاءالدین نے اپنے مقتول بھائی کا بدلہ لینے کے لیے غزنہ پر حملہ کرنے کی ٹھان لی۔ لیکن ابھی میدانِ جنگ میں پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ راستے ہی میں فوت ہو گیا۔ بہاءالدین کے انتقال کے بعد اُس کے ایک اور بھائی

علاء الدین نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی اور غزنی کے سازشی امراء کی سرکوبی کے لیے غزنی میں سات روز تک قتل و غارتگری کا ایسا بازار گرم کیا کہ غزنی کا عظیم الشان شہر جس کی تعمیر میں سلطان محمود غزنوی علیہ الرحمہ نے خاص دلچسپی لی تھی راکھ کا ڈھیر بن کے رہ گیا اور اسی مناسبت سے علاء الدین کا نام جہانسوز پڑ گیا۔ غزنوی خاندان کا آخری حکمران خسرو شاہ تھا۔ وہ غزنی سے بھاگ کر لاہور آ گیا۔ جہاں بدفطرت ہندوؤں نے سومنات کے مندر کا انتقام لینے کے لیے اُسے کاٹنے کی کوشش کی۔

۵۷۰ھ ۱۱۷۳ء میں علاء الدین کا بھتیجا غیاث الدین غوری حکمران ہوا جس کے زمانے میں غزنی پر پورے طور سے غوریوں کی حکومت قائم ہو گئی اور اس لحاظ سے غزنی کا وہی فاتح کہلاتا ہے۔ ۱۲۰۳ء میں سلطان غیاث الدین فوت ہو گیا۔ وہ چونکہ بے اولاد تھا اس لیے اب اُس کا بھائی سلطان معز الدین المعروف محمد شہاب الدین غوری اُس کی جگہ تخت نشین ہوا۔ قبل اس کے کہ سازشی امراء سے فائدہ اُٹھا کر اہلِ ہند غزنی کی اسلامی حکومت کے لیے خطرہ بنیں۔ سلطان نے ایک ایک کر کے غزنی کی سلطنت کے تمام علاقے اپنی حکومت میں شامل کر لیے۔ پھر اس کے بعد وہ پنجاب (ہند) کی طرف بڑھا جہاں ملتان کے قرامطیوں نے اسلام کے دھوکے میں اسلام اور مسلمانوں ہی کو ہندوؤں کی ملی بھگت سے نقصان پہنچانے پر کمر باندھ رکھی تھی۔ ملتان کا قرامطی حاکم سلطان محمود غزنوی کے زمانے سے غزنی کی اسلامی حکومت کا باجگزار چلا آتا تھا جب سلطان شہاب الدین غوری کا زمانہ آیا تو اس نے ہندوؤں کی شہ

پا کر نہ صرف باجگذاری سے نکلنے کی کوشش کی بلکہ اُن کے ناپاک ارادوں کی تکمیل کے لیے اُن کا سرگرم کارکن بھی ہو گیا اور اس پر مستزاد یہ کہ مسلمان ہونے کا مدعی بھی تھا۔ بالآخر سلطان نے سنہ ۵۷۱ھ، ۱۱۷۵ء میں ملتان پر حملہ کر کے اُس پر قبضہ کر لیا اور قرامطی فرقے کے تمام لوگ ملتان سے بھاگ کر گجرات کے راجہ بھیم دیو کے پاس چلے گئے۔ اب سلطان یہاں سے آگے بڑھ کر اُچ جا پہنچا اور اُسے فتح کر کے پورے پنجاب پر تسلّط جمانے کے راستے ہموار کر لیے۔

فتوحات

اس زمانے میں پنجاب کا کمزور حاکم غزنوی خاندان کا آخری تاجدار خسرو ملک تھا۔ ۵۷۵ھ ۱۱۷۹ء میں سلطان نے اس سے پشاور لے لیا جہاں پنجاب کی آئندہ تسخیر کے لیے کامیاب فوجی اڈہ بنا کر جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ پشاور فتح کرنے کے دو سال بعد سلطان نے لاہور پر حملہ کیا۔ لیکن خسرو ملک میں لڑنے کی طاقت نہیں تھی۔ اُس نے خراج کی رقم ادا کر کے صلح کر لی۔ مگر ہندوؤں کی نگاہ میں غزنی کی اسلامی سلطنت برابر کھٹک رہی تھی اس لیے انھوں نے خسرو ملک کو سلطان کے خلاف پھر اکسایا اور اُس کے نتیجے میں خسرو ملک نے خراج دینا بند کر دیا۔ آخر ۱۸۵ھ ۱۱۸۴ء میں سلطان کو پھر پنجاب کا رُخ کرنا پڑا۔ اور آتے ہی خسرو ملک سے سیالکوٹ کا علاقہ چھین لیا۔ اور وہاں ایک اور فوجی چھاؤنی قائم کر کے پھر غزنی واپس چلا گیا۔ اب خسرو ملک نے سلطان کے چلے جانے کے بعد ہندوؤں کو ساتھ لے کر جو زیادہ تر کھوکھر راجپوت تھے۔ پنجاب سے سلطان کا تسلّط اُٹھانے کی پھر کوشش کی۔ سچ پوچھیے تو خسرو ملک چونکہ کمزور تھا اس لیے ہندو اُس پر غالب تھے۔ وہ جو چاہتے تھے سو وہ کرنے پر مجبور تھا۔ درحقیقت اُس نے انہی کے غلبے سے غوری کے خلاف یہ قدم اُٹھایا تھا جو بنظرِ تعمق دیکھا جائے تو خود ہندوؤں ہی کی طرف سے سلطان

کیلئے ایک دعوت مبارزت تھا۔ اب مجبور ہو کر سلطان نے بھی قطعی فیصلہ کر لیا۔ کہ وہ غزنویوں کی پنجاب سے کمزور حکومت کو ختم کر کے یہاں اسلام کی ایک مضبوط مملکت کی بنیاد رکھے گا اور غزنوی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شاطر و عیار ہندو جو غزنی کی اسلامی حکومت پر ارادے باندھ رہے ہیں اور للچائی ہوئی نظروں سے اُسے دیکھ رہے ہیں۔ اُن کا کلی استیصال کیے بغیر چین سے نہیں بیٹھے گا۔ چنانچہ ۵۸۲ھ، ۱۱۸۶ء میں سلطان نے لاہور (پنجاب) پر پھر حملہ کیا۔ خسرو ملک نے اگرچہ معرکہ آرائی کی تاہم شکست کھائی اور گرفتار ہو گیا۔ اور انجام کار اب سارے پنجاب پر سلطان شہاب الدین غوری کی حکومت قائم ہو گئی۔ فتح لاہور کے بعد بھٹنڈہ اور سرہند پر بھی سلطان کا قبضہ ہو گیا۔ اب اس کے بعد سلطان نے شمالی ہند کے تمام علاقے فتح کرنے کے انتظامات شروع کر دیے، کیونکہ فتنہ و فساد اور جنگ و جدل کے اصل بانی مبانی انہی علاقوں کی مختلف راجپوت ریاستوں کے راجے مہاراجے تھے، جو ابتدا ہی سے سلطان کے خلاف درپردہ کارروائیاں کرتے اور غزنویوں کے کمزور حکمران پنجاب کو اپنا آلہ کار بناتے چلے آ رہے تھے۔ اس لیے اب پورے پنجاب پر سلطان کا تسلط قائم ہو جانے سے وہ کھل کر سامنے آ گئے اور سلطان کے لیے لازم ہو گیا کہ وہ اپنے دفاع کے لیے جنگی تیاریاں شروع کر دے۔

محمد قاسم فرشتہ نے اپنی تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ جب ۵۸۷ھ / ۱۱۹۱ء میں سلطان سرہند اور بھٹنڈہ کو فتح کرتا ہوا سو میل آگے بڑھ گیا تو اُسے پتہ چلا کہ دہلی اور اجمیر کا طاقتور ترین راجہ پرتھوی راج چوہان جس کے کوئی ایک سو آٹھ

کے قریب راجے مہاراجے باجگزار تھے۔ اپنے علاقوں کو واپس لینے کے لیے سرہند کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ سلطان اپنی تھکی ہوئی چودہ ہزار فوج کو لے کر فوراً سرہند کی طرف پلٹ آیا۔ اور ترائن یا تراوڑی کے مقام پر دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ پرتھوی راج کی فوج دو لاکھ سواروں اور تین سو جنگی ہاتھیوں پر مشتمل تھی۔ شہاب الدین غوری کے ساتھ صرف چودہ ہزار سپاہی تھے۔ پرتھوی راج کی فوج تازہ دم تھی۔ شہاب الدین کا لشکر تھکا ماندہ تھا۔ ہر چند غوریوں نے خوب دادِ شجاعت دی۔ بڑی بے جگری سے لڑے لیکن شکست کھائی۔ اور بھٹنڈہ ہاتھ سے نکل گیا۔

اب زخمی حالت میں سلطان لاہور واپس آگیا، جہاں کئی ہفتے دوا دارو ہوتی رہی۔ آخر کار ترائن کی جنگ میں سلطان نے جو زخم کھائے تھے وہ تو تھوڑے دنوں بعد مندمل ہو گئے لیکن دل کے زخم جو شکست کے صدمے نے لگائے تھے برابر تازہ رہے۔ سیاسی نقطۂ نظر سے بھی دیکھیں تو بہ نسبت پہلے کے اب اسلامی حکومت کے لیے ہندوؤں کے خطرات پہلے سے کہیں زیادہ لاحق تھے۔ اب کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں رہی تھی۔ صاف نظر آتا تھا کہ اگر شکست کا بدلہ نہ لیا گیا تو ہندو اپنی فطرت سے باز نہ آئیں گے اور اپنی عادت اور طبیعت سے مجبور ہو کر پھر حملہ کریں گے۔

چنانچہ ایک سال کے بعد ۵۸۸ھ ۱۱۹۲ء میں سلطان ایک لاکھ بیس ہزار سپاہ لے کر تراوڑی کے میدان کی طرف پھر چل دیا۔ پرتھوی راج کو چونکہ اس بات کا پورا احساس تھا کہ اُسے پچھلے سال جو فتح حاصل ہوئی وہ

محض ایک حادثہ تھا، لہٰذا سلطان کے آنے پر بے حد پریشان ہوا۔ پرتھوی راج نے مذہب کے نام پر تمام ہندوستان کے لوگوں سے مدد کی التجا کی جس پر تقریباً ڈیڑھ سو راجپوت راجے مہاراجوں نے اپنی اپنی فوجیں میدان جنگ میں لاکر اتار دیں۔ اس مرتبہ پرتھوی راج کے ساتھ تین لاکھ سوار، تین ہزار جنگی ہاتھی اور بے شمار پیدل سپاہ تھی۔ گویا ہندوستان کے ہندوؤں کی متحدہ طاقت اُس کے ہمراہ تھی۔ اور ہر شخص اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پُرجوش ہوکر نکلا اور جان ہتھیلی پہ رکھ کر قسم کھائی کہ مرے یا مارے بغیر نہ رہے گا۔

اس سے پہلے کہ جنگ کا آغاز ہو سلطان شہاب الدین غوری نے اسلامی قاعدے کے مطابق پرتھوی راج کے پاس اپنے سفیر کی زبانی کہلوا بھیجا کہ اگر تم لڑنے کی بجائے اطاعت قبول کر لو اور جزیہ دینا گوارا کرو تو جنگ کو روکا جا سکتا ہے مگر پرتھوی راج نے اپنی فوج کی کثرت کے زعم میں تھا۔ لہٰذا اس کا نہایت درشتی سے جواب دیا۔ اب سلطان نے پیش قدمی کر کے پہلے سرہند پر قبضہ کیا۔ اس کے بعد ترائن کے میدان میں آ پہنچا۔ جہاں پرتھوی راج کی فوجیں پہلے ہی سے صف بستہ بنا کھڑی تھیں۔ سلطان نے آتے ہی اپنی فوج کو چار حصوں میں تقسیم کر کے لڑائی شروع کر دی۔ اور پرتھوی راج کی فوجوں پر ایسے بھرپور حملے کیے کہ تھوڑی ہی دیر میں اُن کے قدم میدان جنگ سے اکھڑ گئے اور بھاگ نکلیں۔ حتیٰ کہ مسلمانوں کی تیغ خاراشگاف سے پرتھوی راج بھی ایک گھوڑے پر سوار ہو کر میدان جنگ سے بھاگ نکلا لیکن ابھی مشکل سے تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ مسلمانوں نے تعاقب کر کے اُسے جا لیا اور قتل کر دیا۔

پرتھوی راج کے قتل کے بعد اب دہلی اور اجمیر کی سلطنت سلطان کے قبضے میں آگئی۔ علاوہ ازیں سرستی، ہانسی، ہمانہ اور سکرام وغیرہ مشہور قلعے بھی سلطان کی سلطنت میں شامل ہوگئے۔ سلطان نے اجمیر کے تخت پر ازراہ نوازش پرتھوی راج ہی کے بیٹے کو بٹھا دیا تاکہ اس کا قدیم خاندانی اعزاز قائم رہے اور اپنے وفادار غلام قطب الدین ایبک کو مفتوحہ علاقوں کا نائب مقرر کرکے غزنی واپس چلا گیا۔ اس دوران میں قطب الدین ایبک نے جو آگے چل کر سلاطین ہند کی حکومت کا بانی کہلایا اپنے آقا سلطان شہاب الدین غوری کے نائب کی حیثیت سے نظام سلطنت کو نہایت خوبی سے چلایا۔ میرٹھ کول اور دہلی کے اردگرد کے علاقوں کو فتح کرکے سلطنت کو خوب وسعت اور ترقی دی۔

۵۹۰ھ، ۱۱۹۴ء میں سلطان شہاب الدین غوری غزنی سے پھر ہندوستان آیا۔ اور اٹاوہ کے قریب چندوار میں قنوج کے راجہ کو شکست دے کر قنوج سے بنارس تک کا سارا علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ قنوج کا راجہ اس لڑائی میں سلطان کے ہاتھوں مارا گیا۔ ۵۹۱ھ، ۱۱۹۴ء میں سلطان کے نائب قطب الدین ایبک نے گجرات کے پایہ تخت پٹن کو فتح کرلیا۔ ۵۹۲ھ، ۱۱۹۵ء میں اس نے انہلواڑا پر بھی قبضہ کرلیا۔ پھر ۵۹۳ھ، ۱۱۹۶ء میں قطب الدین ایبک نے تیسری مرتبہ گجرات پر پھر حملہ کیا اور گجرات کے راجہ بھیم دیو کو شکست دے کر اس سے اس کے تمام علاقے چھین لیے۔ پھر اسی سال اس نے بیانہ کو بھی فتح کرلیا اور گوالیار کا محاصرہ کرلیا۔ مگر وہاں کے راجہ نے خراج دینا منظور کرلیا۔ پھر اس کے بعد قطب الدین ایبک نے اپنے ایک سپہ سالار اختیار الدین،

محمد بن بختیار خلجی کو بہار و بنگال کی تسخیر کے لیے بھیجا۔ خلجی نے صرف اٹھارہ آدمیوں کی مدد سے بہار کو فتح کر لیا اور اس کی باقی فوج ابھی اس کے پیچھے پیچھے آرہی تھی مگر وہ اس کے بہار پہنچنے سے پہلے پہلے ہی منظفر و منصور ہوا جب وہ بہار پہنچا تھا تو لوگوں نے خیال کیا کہ شاید وہ کوئی تاجر ہے جو گھوڑے خریدنے آیا ہے۔ لیکن جب اس نے بادشاہ کے محل کو گھیرے میں لیا تب اصل بات کا بھید کھلا۔ بادشاہ اس وقت کھانا کھا رہا تھا جب صورت حال سے اسے آگاہی ہوئی وہ جان بچانے کے لیے چپکے سے پچھلے دروازے سے نکل بھاگا۔ بہار کی فتح کے بعد اب خلجی نے بنگال کے دارالحکومت ندیا پر قبضہ کیا اور دوسری طرف کالنجر کا راجہ پرمل پر حملہ کیا۔ اس نے اطاعت قبول کر لی پھر اس کے بعد مہوبہ، کالپی اور بدایوں کو اسلامی سلطنت میں شامل کر لیا۔ سن ۶۰۲ھ ۱۲۰۵ء میں سلطان آخری مرتبہ پھر ہندوستان آیا۔ اس عرصے میں اسلامی ہند کی سلطنت پشاور سے بنگال تک پھیل چکی تھی۔

ہر چند تمام اسلامی ہند میں امن و امان قائم ہو چکا تھا لیکن پنجاب کے کھوکھروں نے سرکشی و بغاوت سے کبھی منہ نہ موڑا آخر سن ۱۲۰۵ء میں سلطان نے انھیں بھی سزا دینے اور کیفر کردار کو پہنچانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ چنانچہ سلطان تھوڑی سی فوج لے کر جہلم کے قریب پہنچا جہاں قطب الدین ایبک نے اس کا استقبال کیا اور پھر دونوں نے مل کر کھوکھروں کو شکست دی اور ان کی بہت بڑی تعداد قتل ہو گئی۔ اس مہم سے فارغ ہو کر سلطان لاہور چلا آیا۔ جہاں دربار منعقد کر کے قطب الدین ایبک کو اسلامی ہند کا ولی عہد نامزد کیا۔ اور اس کے بعد پھر عازم غزنی ہو گیا۔

غزنی کو واپس جاتے ہوئے جب سلطان جہلم کے قریب دمیک کے مقام پر پہنچا تو آرام کرنے کی غرض سے وہاں کچھ دیر کے لیے رُک گیا۔ مگر عین اُس وقت جب سلطان نماز پڑھ رہا تھا۔ چند کھوکھروں نے اچانک خیمے میں گھس کر چھری کے پے در پے وار کر کے سلطان کو شہید کر ڈالا۔ سلطان کی لاش غزنی لے جائی گئی اور وہیں دفن کی گئی۔ طبقات ناصری میں تاریخ وفات ۳ شعبان ۶۰۲ھ بمطابق ۱۵ مارچ ۱۲۰۶ء بیان کی گئی ہے یعنی پرتھوی راج کے قتل کے پورے چودہ برس بعد سلطان راہیِ ملک بقا ہُوا۔ ؎

شہادت ملک بحر و بر معزالدین
کز ابتدائے جہاں شہ چو او نیامد یک
سوم زغرہ شعبان بسال شش صد و دو
فتادہ در رہ غزنین بمنزل دمیک

(طبقات ناصری)

سلاطین ہند

اگرچہ خلافت راشدہ کے زمانے میں بھی کچھ عرب مسلمان سمندر کے راستے ہندوستان آئے لیکن ایک فاتح قوم کی حیثیت سے اُن کے یہاں آنے کا باقاعدہ شمار ۹۳ھ میں محمد بن قاسم کے حملے ہی سے ہوتا ہے۔ پھر جب محمد بن قاسم سندھ سے واپس چلا گیا تو ہندوستان سے عرب کے مسلمانوں کا اثر بہت کم رہ گیا حتیٰ کہ کئی سو برس کے بعد جب سلطان محمود یہاں پہنچا تو ہر طرف کفر و شرک کا دور دورہ تھا۔

سلطان محمود نے ظلمت کدہ ہند کو تاریکی سے روشنی میں لانے کی سترہ بار کوشش کی اور بالآخر ایک حد تک وہ کوشش کامیاب بھی ثابت ہوئی۔ لیکن سلطان کے انتقال کے بعد جب اُس کے جانشین آئے تو ان میں نہ وہ دل تھا اور نہ حوصلہ، وہ مزعومہ مفادات میں مبتلا ہو کر اپنی طاقت کھو بیٹھے۔ یہاں تک کہ سلطان کی نسل سے بارہ حکمران ہوئے اور اُن میں سے کسی کو بھی یہ سعادت میسر نہ آسکی کہ وہ ہندوستان کے در و بام کو اسلام کے نام سے آشنا کرا سکے۔ انجام کار غزنویوں کے بعد عنانِ حکومت غوریوں کے ہاتھ میں آئی۔ جن حالات سے غوری خاندان کا سرخیل رُوحِ رواں سلطان شہاب الدین غوری دوچار ہوا۔ بلاشبہ انھیں سامنے رکھتے ہوئے اُسے اسلامی ہند کا بانی مبانی کہا جا سکتا ہے۔

غوریوں کی حکومت ۵۸۲ھ سے ۶۹۲ھ تک قائم رہی۔ ان کے بعد سلاطین دہلی آئے، جنھیں ہندوؤں اور انگریزوں کی تقلید میں ہم میں سے بعض نا سمجھ لوگ بھی خاندانِ غلاماں کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان میں کل دس افراد تخت نشین ہوئے۔ ان میں التمش، رضیہ سلطانہ اور بلبن کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس خاندان کے بعد خلجی آئے جن کی حکومت ۶۸۹ھ سے ۷۲۰ھ تک قائم رہی ان میں علاء الدین خلجی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کے بعد تغلق آئے۔ تغلقوں میں کل آٹھ بادشاہ ہوئے، جنھوں نے ۸۰۱ھ تک حکومت کی۔ تغلقوں کے بعد خضر خانی حکمران ہوئے، جنھیں ایک لفظی غلطی کے دھوکے میں خاندانِ سادات کہا جاتا ہے۔ حالانکہ اُن کا ہرگز خاندانِ رسالت سے کوئی نسلی تعلق نہ تھا۔ خضر خانیوں نے تقریباً پچاس برس تک حکومت کی۔ ان کے بعد لودھی آئے، جن کا زمانہ حکومت

۸۵۴ھ سے ۹۳۵ھ تک قائم رہا۔ آخری بادشاہ ابراہیم لودھی تھا جسے سلطنت مغلیہ ہند کے بانی ظہیر الدین بابر نے پانی پت کے میدان میں شکست دی۔ بابر کے بعد اس کے جانشین ہمایوں کو ۹۴۶ھ میں شیر شاہ سوری نے شکست دی اور سوری پٹھانوں کی حکومت قائم کی جو تقریباً پندرہ برس تک قائم رہی۔ اس کے بعد پھر مغلوں کی حکومت آئی، جو تقریباً تین سو برس تک قائم رہی۔

الغرض سلاطین ہند میں آخری سلطان اورنگ زیب عالمگیر تھا جس کا ذاتی کردار سلاطین ہند کی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں رکھتا۔ سلطنت ہند کی آمدنی سے اورنگ زیب عالمگیر علیہ الرحمہ نے جس طرح سے اپنے آپ کو علیحدہ رکھا اور علم و تقویٰ کے اعتبار کو کہ کے جس انداز سے عالمگیر نے حکومت کی، حضرت عمر بن عبدالعزیز کے سوا ملوکیت کی اسلامی تاریخ میں اُس کی کہیں مثال نہیں ملتی۔ مختصراً یہ کہ جس طرح اسلامی ہند کا آخری سلطان زہد و تقویٰ اور علم و عمل کے اوصاف سے متصف تھا۔ اسی طرح اسلامی ہند کا بانی اور پہلا سلطان شہاب الدین غوری بھی پرہیزگاری دینداری اور ایک سچا مسلمان ہونے کے لحاظ سے کسی سے کم نہ تھا۔ وہ نہایت شجاع اور عدل پرور تھا۔ رعیت سے نہایت مشفقانہ سلوک کرتا اور اُن کے معاملات کا قطعی منصفانہ فیصلہ کرتا تھا۔ غزنی کا قاضی ہر ہفتے میں چار دن سلطان کی موجودگی میں امیر حاجب اور امیر داد کے مشترکہ اجلاس میں مقدمات و معاملات کی سماعت کرتا تھا اور اگر کوئی صاحب معاملہ براہِ راست سلطان کی توجہ کا طالب ہوتا تو سلطان اُس کے مقدمے کی سماعت خود کرتا اور منصفانہ بنیادوں پر فیصلہ کرتا۔ حکومت کے تمام قوانین شریعت اسلامی کے احکام کے مطابق نافذ کیے جاتے تھے۔

اس کے علاوہ سلطان خود بھی صاحب علم تھا اس لیے اہل علم و ادب کی بے حد قدر کرتا تھا۔ اکثر علماء، فضلا اور فقہاء اس کی مجلس میں پابندی سے شریک رہتے اور مختلف مسائل پر بحث اور گفتگو کرتے۔ سلطان چونکہ مسلک کے اعتبار سے شافعی تھا اس لیے شافعی مسلک کے بزرگوں بالخصوص امام فخرالدین رازی کو سلطان کی بارگاہ میں بڑا تقرب حاصل تھا۔ قرآن حکیم کی تفسیر کبیر انہی شہرۂ آفاق امام کی لکھی ہوئی تفسیر ہے۔ امام موصوف ہفتے میں ایک دن شافعی محل میں وعظ و تلقین فرماتے اور ان کے بیان سے کبھی کبھی روتے روتے سلطان کی ہچکی بندھ جاتی تھی۔

ہندوستان پر جب غوری کے حملے شروع ہوئے تو غزنی دربار کے بہت سے علما، فضلا اور شعراء سلطان کے ہمراہ ہندوستان آئے اور مستقلاً یہیں سکونت اختیار کر لی۔ انہی میں ایک بزرگ شیخ سراج الدین محمد بن عثمان جوزجانی ہیں جنھیں سلطان نے ۵۸۳ھ میں لاہور کی قضاۃ عسکر پر مقرر کیا۔ صاحب طبقات ناصری منہاج سراج انہی کے بیٹے تھے جنھیں سلطان نے خلیفہ بغداد ناصرالدین اللہ عباسی کی خدمت میں سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسی زمانے میں خواجہ معین الدین چشتی اجمیر علیہ الرحمہ وارد ہند ہوئے۔ جن کے فیوض و برکات عالیہ کا دور اب تک جاری ہے۔

آخر میں سلطان شہاب الدین غوری کے باب میں اتنا کہنا بس ہے۔ کہ توسیع مملکت کا وہ جنون جس میں ہندوستان کے تمام راجے مہاراجے ہمیشہ مبتلا رہے اور اسی سبب سے ان میں برابر تلوار چلتی رہی اور وہ ایک مرکز پر کبھی متحد نہیں رہ سکے۔ سلطان کی طبیعت میں ملک گیری کا یہ شوق کبھی پیدا نہیں

ہُوا۔ حق تو یہ ہے کہ ایک سلطان کیا تمام سلاطین ہند میں ایک بھی سلطان ایسا نہیں جس نے جارحیت کو روا رکھتے ہوئے بیٹھے بٹھائے ہندوؤں پر حملہ کیا ہو۔ یہ سراسر ہندوؤں ہی کا جوشِ جنون تھا کہ وہ امن پسند مسلمانوں کو خواہ مخواہ چھیڑتے رہتے تھے اور اُن کی سلطنت کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے تھے۔ اس پر اُن کی کمال ڈھٹائی مستزاد تھی۔ وہ سب کچھ کرنے کے باوجود صاف مکر جاتے اور سارا الزام مسلمانوں ہی کے سر تھوپ دیتے۔ مسلمانوں کی خطا صرف اتنی ہے کہ وہ مجبور ہو کر مدافعت کے لیے نکلتے اور ہندوؤں کی اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے تھے۔

ہندو کا لفظ جس کے معنی چور کے ہیں سنسکرت زبان کا ہے۔ ہندوؤں کے حالات، اطوار و خیالات اور اُن کی معاشرت کے طرز کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس اعتبار سے ہندوؤں کی ذات اسم بامسمیٰ ہے۔ اگر اس قوم میں کوئی خوبی ہے تو بات کہہ کر مکرنے، وعدہ کر کے پھرنے، حقائق کا چہرہ مسخ کرنے اور واقعات کو اپنے مطالب کے سانچے میں ڈھالنے کی ہے اور اس خوبی میں دنیا کی کوئی قوم ان سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ شہاب الدین غوری کے باب میں جس کی پرتھوی راج کے درمیان صرف دو جنگیں برپا ہوئیں۔ پرتھوی راج راسا ہندوؤں کی افتادِ طبیعت کا شاہکار اور اُن کی خوبیوں کا سب سے بڑھ کر زندہ، جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ شہاب الدین غوری کے ہندوستان پر حملے کے کیا اسباب تھے۔ مشتے نمونہ از خروارے کے مصداق ان مسائل سے متعلق چند بیانات ہم پرتھوی راج راسا سے پیش کرتے ہیں:-

حملے کے اسباب

سلطان شہاب الدین کا زمانۂ حیات سلطان محمود غزنوی سے ڈیڑھ سو برس بعد شروع ہوتا ہے۔ سلطان اپنے زمانے میں ہندوستان پر سترہ کامیاب حملے کر چکا ہے اور پنجاب میں اسلامی حکومت قائم کر کے غزنی کی راہ لیتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ غوری کو وہ کیا مسائل پیش آئے جن کی بنا پر اُسے ہندوستان پر حملہ کرنا پڑا۔ اس کا جواب خود ایک ہندو شاعر کی زبانی سنئے، جس نے اسی موضوع پر ایک منظوم کتاب پرتھی راج راسا لکھی ہے جو اکہتر ابواب پر مشتمل ہے اور اس میں بیان کیا گیا ہے کہ پرتھی راج نے سلطان شہاب الدین غوری کو بیس مرتبہ شکست دی جن میں چھ مرتبہ گرفتار کر کے ازراہ کرم صرف اس وعدے پر کہ وہ آئندہ ہندوؤں پر حملہ نہیں کرے گا۔ اسے رہا کیا مگر کفارے کے طور پر اس ضمن میں پرتھی راج نے صرف اتنا کیا ہے کہ سلطان غوری سے اپنے آپ کو تین مرتبہ جھکوا کر سلام کروایا۔ ع قیاس کن زگلستان من بہار مرا۔ بمصداق پرتھی راج راسا کا بیان ملاحظہ کیجیے:۔

"پرتھی راج اور غزنی کے بادشاہ میں عداوت کی بنا یہ ہوئی کہ شہاب الدین کے ایک بھائی میر حسین خان کو شہاب الدین کی پاتر چترریکھا سے محبت تھی اور شہاب بھی اسے بہت چاہتا تھا۔ مگر پاتر چترریکھا صرف حسین کو چاہتی تھی۔ جب غوری کو پتہ چلا تو اُس نے حسین کو روکا، مگر حسین نہ مانا۔ آخر غوری نے اُسے کہا کہ تم

میری حکومت سے راتوں رات نکل جاؤ، ورنہ قتل کر دیے جاؤ گے اس پر حسین غزنی سے نکل کر پرتھی راج کے پاس ناگور چلا گیا۔ پرتھی راج اُس وقت شکار میں تھا۔ حسین نے اپنے ملازم سندر داس کو پرتھی راج کے پاس بھیجا اور آپ ایک سایہ دار درخت کے نیچے خیمہ زن ہُوا۔

ادھر سندر داس نے پرتھی راج سے تمام کیفیت بیان کی راجہ نے اپنے وزیر کیماس سے مشورہ کیا اور کہا کہ حسین کو پناہ دینے یا نہ دینے میں دونوں طرح خرابی ہے۔ پناہ دینے میں تو غوری کا ڈر ہے اور انکار کرتے ہیں تو یہ بات اپنے دھرم کے خلاف ہے۔ راجہ کے وزیر نے اس پر بڑھاوا دے کر کہا ارجن جس طرح برہمن بن کر مور دج کے ہاں پناہ لینے گیا۔ اور بھگوان نے شیر بن کر گوشت مانگا۔ شرن گتا نے در دپدی کا چیر بڑھا دیا۔ ویسے ہی اب تم نے ایک پناہ گزین کو پناہ دے کر چھتری دھرم کی حفاظت کی ہے۔

غرض پرتھی راج نے حسین کی بڑی عزت کی اور ناگور کے جنوب میں اُسے جاگیر دے دی۔ اس کے علاوہ گھوڑے اور ہاتھی بھی دیے۔ اس کے تھوڑے دنوں بعد پھر شہاب الدین غوری کا سفیر عرب شاہ آیا اور اُس نے پاتر چتر ریکھا کو واپس مانگا۔ مگر حسین نے واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ اب وہ مایوس ہو کر پرتھی راج کے پاس گیا اور اس کی شکایت کی اور کہا کہ وہ حسین

کو اپنے یہاں سے نکال دے۔ یہ بات سن کر راجہ کا منہ غصے سے لال ہو گیا اور بھنویں چڑھ گئیں اور بولا کہ چھتری کا یہ دھرم نہیں کہ پناہ گزیں کو نکال دے۔ آخر لڑائی ہوئی جس میں حسین مارا گیا۔ چتر ریکھا پاتر حسین کے ساتھ زندہ جل مری۔ اور سلطان شہاب الدین غوری کو پرتھی راج نے گرفتار کر لیا۔ پانچ روز اسے اپنی قید میں عزت کے ساتھ رکھا۔ پھر اس سے تین مرتبہ سلام کروایا اور میر حسین خان کے بیٹے غازی خاں کے ہمراہ غزنی بھیج دیا اور چلتے ہوئے اُس سے وعدہ لیا کہ وہ آئندہ ہندوؤں پر حملہ نہیں کرے گا۔

نوٹ: ایک بیان غوری، کی وجہ تسمیہ کے بارے میں بھی ملاحظہ ہو: غزنی کے تخت پر غوری سے پہلے جلال شاہ بیٹھا تھا۔ اُسے ایک مرتبہ نجومیوں نے بتایا کہ تمھارے حرم میں ایک بچہ عنقریب پیدا ہونے والا ہے جو تمھاری حکومت کا تخت الٹ دے گا۔ شاہ کو یہ بات سن کر بڑی فکر ہوئی۔ چنانچہ اُس نے اپنے حرم پر کڑی نگرانی شروع کر دی۔ جونہی اُسے معلوم ہوتا کہ کوئی کنیز حاملہ ہے وہ اُسے فوراً قتل کر دیتا۔ حسنِ اتفاق سے ایک کنیز جو آئندہ بادشاہ غزنی کی ماں بننے والی تھی اپنے حمل کو چھپانے میں کسی طرح کامیاب ہو گئی۔ پھر جب وہ بچہ جننے والی ہوئی تو چپکے سے گورستان چلی گئی جہاں بچہ پیدا ہو گیا جو آگے چل کر گوری (غوری) کہلایا۔

پرتھوی راج راسا کے مؤلف کا مبلغ علم کتنا تھا اُس کا ایک اندازہ تو اس واقعہ سے بخوبی ہو گیا ہو گا۔ اب ایک نظر اس اجمال پر ڈالیے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتنا ایک صاف گو اور دیانتدار تھا۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ پرتھی راج اور سلطان غوری کے درمیان ترائن کے مقام پر صرف دو جنگیں ہوئیں، مگر راسا کا مؤلف ان کی تعداد بڑھا کر ۱۷ تک پہنچاتا ہے۔ اور آخر میں لکھتا ہے کہ پرتھی راج کو سلطان غوری جب گرفتار کر کے اپنے ساتھ غزنی لے گیا اور وہاں لے جا کر قید خانے میں ڈال دیا تو اُس کے پیچھے پیچھے پرتھی راج کا درباری شاعر بھی غزنی پہنچ گیا۔ وہ بھیم کے ہاں جا کر مقیم ہوا اور دیوی منتر کا جاپ شروع کیا۔ تھوڑی دیر بعد دیوی نمودار ہوئی اور اُس نے کہا تیری، شاہ کی اور پرتھی راج کی موت ایک ہی وقت میں واقع ہو گی۔ درباری شاعر نے بھیم کو اس سے آگاہ کیا بھیم نے اس سے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس پر منتر کا جاپ کر کے اُس نے بھیم کو بھی دیوی کے درشن کرا دیے اور وہ مطمئن ہو گیا۔

اس کے بعد پرتھی راج کا درباری شاعر پہلے پرتھی راج سے ملا اور اُس نے کہا کہ تم اپنے ہاتھ سے اپنے دشمن کو قتل کر سکتے ہو۔ بشرطیکہ تم میری ایک شرط مان لو۔ اُس نے پوچھا وہ

کیسے۔ میں تو اب اندھا ہوں اپنے دشمن غوری کو کیسے قتل کروں گا۔ شاعر نے کہا یہ مجھ پر چھوڑ دو۔ پھر اس کے بعد وہ سلطان سے ملا اور اُس سے پرتھی راج کے تیراندازی کے کمال کی اس قدر تعریف کی کہ سلطان نے دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ چنانچہ پرتھی راج دربار میں لایا گیا اور اُس نے آتے ہی کمان اُٹھا کر تیر کا ایسا نشانہ باندھا کہ وہ سیدھا جا کر سلطان کے تالو میں پیوست ہو گیا اور سلطان اُسی وقت مر گیا۔ قریب تھا کہ درباری اُسے پکڑیں شاعر نے چھری سے اپنا گلا کاٹ کر پرتھی راج کی طرف بڑھادی اور اُس نے بھی فوراً چھری سے خودکشی کر لی۔"

"تاریخ عالم کے اوراق گواہ ہیں کہ سلطان شہاب الدین غوری، پرتھی راج کی شکست کے چودہ برس بعد حج کے لیے جاتے ہوئے کھوکھروں کے ہاتھوں شہید ہوا، جسے محمد قاسم فرشتہ ایسے مشہور مؤرخ نے بھی اقتباس لفظی کے باعث کھوکھروں کے بجائے گکھڑوں کے ہاتھ شہید ہونا لکھا ہے جو غلط محض ہے۔ درحقیقت پرتھی راج راسا جسے ہندوؤں کے یہاں ایک مستند تاریخ تصور کیا جاتا ہے اور اس کی تحریر کی صحیفہ آسمانی سے کم توقیر نہیں۔ وہ ایک ایسی کتاب ہے جو سراسر جعلی اور وضعی ہے لیکن اس کے بارے میں دعویٰ یہی کیا جاتا تھا کہ وہ پرتھی راج کے زمانے کے ایک درباری شاعر چند بردائی کی لکھی ہوئی ہے۔ ایک طویل عرصے تک راسا نے ایک طرف نسا آئین کو دوسری طرف مؤرخین

کو اور تیسری طرف ماہرین لسانیات سخت دھوکے میں مبتلا کیے رکھا یہی سبب ہے کہ اس کتاب کو ہندی زبان کی قدیم ترین کتاب خیال کیا جاتا رہا اور ایک زمانہ اس کتاب کی قدامت، شاعری اور تاریخی مواد کا دیوانہ رہا۔ خاص کر تاریخی لحاظ سے راسا کو راجپوتانے کے اکثر راجپوت خاندان کے زمانے اور نسب کے سلسلے میں ایک نہایت قدیم ماخذ کے طور پر تسلیم کیا جاتا رہا حتیٰ کہ اہل مغرب نے بھی اس کتاب کی پرستاری شروع کر دی۔ چنانچہ جیمز ٹاڈ نے جو گزشتہ صدی کے پہلے راج میں راجپوتانے کی ریاستوں کا پولٹیکل ایجنٹ رہا اور اس نے دیسی ریاستوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان عہد نامے بھی مرتب کیے تھے۔ اسی ٹاڈ نے راجستان کی تاریخ بھی لکھی ہے جس کا ماخذ فقط یہی کتاب پرتھوی راج راسا ہے جو ۱۸۸۶ء تک برابر مقبول رہی۔ لیکن پھر اسی سال اس کے طلسمات ٹوٹنے لگے۔ اور کوی راج شیامل داس نے ثابت کیا کہ مذکورہ بالا کتاب سراسر جعلی اور وضعی ہے۔ اس کا تاریخی حقائق سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ علاوہ ازیں یہ کتاب سترھویں صدی عیسوی میں لکھی گئی ہے۔ اس لیے یہ بات بھی ڈنکے کی چوٹ کہی جا سکتی ہے کہ اس کتاب کے تمام واقعات اور مضامین محض خیالی اور فرضی ہیں۔ پھر ۱۸۹۳ء میں ڈاکٹر بیولر کو سیاحت کشمیر کے دوران ایک کتاب دستیاب ہوئی جس کا نام پرتھی راج وجے تھا۔ اس کتاب میں جو مضامین اور تاریخیں بیان کی گئیں تھیں وہ پرتھی راج راسا کے مضامین و تواریخ کے بالکل برعکس تھیں۔ اس کے علاوہ ان کی حرف بحرف ان بیانات سے تصدیق بھی ہو جاتی تھی جو پتھر کے کتبات پر کندہ تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر بیولر نے اپنی تحقیقات اور مشاہدات کی بنیاد پر ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے رسالے میں راسا پر ایک

محققانہ مضمون لکھ کر اس بات کی بہ زور تصدیق اور تائید کی کہ پرتھی راج راسا قطعی ایک بے معنی اور بے بنیاد کتاب ہے اور سوسائٹی کو چاہیے کہ اس کی اشاعت فوراً روک دے۔ چنانچہ ڈاکٹر موصوف کے لکھنے پر اس کتاب کی آئندہ اشاعت روک دی گئی۔

اگرچہ پرتھی راج راسا کی حمایت میں ہندوؤں نے بڑا شور و غل کیا۔ بہت سے مضامین لکھے گئے جن میں ایک شیام سندر داس سکریٹری ناگری پرچارنی سبھا نے بھی ۱۹۰۰ء میں ایک طویل مضمون لکھا تھا۔ تاہم ۱۹۲۸ء کے رسالہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی شاخ بمبئی جلد سوم میں ہلدر نے اپنے مضمون میں راسا کے بے بنیاد مضامین کی عالمانہ انداز میں تغلیط کی۔ پھر اسی سال پنڈت رام چندر نے راسا کی مخالفت میں ایک مضمون لکھا جو زیادہ تر اس کے لسانی پہلوؤں سے تعلق رکھتا ہے۔ اور آخر میں رائے بہادر پنڈت گوری شنکر اوجھا نے ۱۹۲۹ء میں راسا پر نہایت مبسوط و مدلل مضمون لکھ کر ثابت کر دیا کہ اس کتاب کا اوّل تا آخر ایک لفظ بھی ایسا نہیں جس پر اعتماد کیا جا سکے۔ یہ کتاب سراسر وضعی اور جعلی ہے اور اس کا لکھنے والا کوئی معمولی ساکوی ہے جس نے محض جلب منفعت اور ذاتی مفادات کے لیے اسے کسی راجہ کو اپنے دام تزویر میں لانے کے لیے سترھویں صدی عیسوی میں لکھا تھا۔ اگرچہ ابتداء میں یہ کتاب محض ایک ادبی تفنن تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ بعض وجوہ کی بنا پر جو خاص کر سیاسی مصلحت پر مبنی تھے اس کتاب کی مقبولیت بڑھتی چلی گئی اور اس کا مؤلف انجام کار مغرب کے اُن تمام بڑے بڑے مفکرین کو بھی گمراہ کرنے میں کامیاب ہو گیا جن کا نام دُنیائے علم و ادب میں بڑی تعظیم سے لیا جاتا ہے۔ در حقیقت راسا

کی تالیف کو بطور تاریخ کے تسلیم کرنا اور مستند جاننا اتنی بڑی غلطی ہے کہ جس کی مثال نہیں مل سکتی اور مغربی مصنفین جن کو اپنی تحقیق و تلاش پر بہت ناز ہے مدتوں اسی کے خرمن سے خوشہ چینی کرتے رہے۔ چنانچہ گرانٹ، ہیمز، گریرسن اور ہرنلے وغیرہ مغربی مفکرین کے نام اس ضمن میں خاص کر قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں کو ہندوؤں کی لے معنی اور بے سر و پا مزخرافات پر کس قدر اعتماد تھا۔ اس کا اندازہ کچھ اس بیان سے کیا جا سکتا ہے، جو بنارس کالج میں سنسکرت کے ایک مغربی پروفیسر ڈاکٹر رڈولف ہرنلے نے پرتھی راج راسا کے مطالعہ کے بعد اس کے مضامین سے متاثر ہو کر مسلمانوں کے خلاف پیش کیا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ حسن حسین کی سرگزشت، اس داستان کا موضوع ہے وہ کون تھا۔ مسلمان مورخ اس سوال کا جواب نہیں دیتے۔ وہ رسوائی کے ڈر سے اس واقعہ کو چھپاتے ہیں جب اس داستان کے ہیرو حسین کا سراغ نہیں ملتا۔ اسلامی تاریخیں اس باب میں بالکل پر سکوت ہیں تو دوسرے جنگ آزماؤں کے حالات جو اس قصے میں بیان کیے گئے ہیں کیونکر مل سکتے ہیں۔ چند برودائی کو اگرچہ پرتھی راج اور ہندوؤں کا طرفدار کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اس نے مسلمانوں کی طرح مخالف قصوں کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔

ع ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے

اس کتاب کا دجل و فریب آج گوشتہ پاک، بھارت جنگ میں آکاش وانی کے ہندوؤں کے لیے راحت بخش، روح افزا اور سرور انگیز بیانات جیتا جاگتا ثبوت ہیں، اور مغرب کی حماقت اور تعصب اس پر مستزاد ہے۔ مغرب کے ذرائع معلومات کس قدر وسیع اور تحقیق و تلاش کی راہیں کس قدر کشادہ ہیں۔ اس کا زندہ ثبوت بھی مغرب

کے اُن اخبارات سے مل سکتا ہے جو آکاش وانی کے نشریات خمریہ سے کالے ہو چکے ہیں۔ کیا اس پر بھی ہندوؤں کو اپنی صداقت اور مغربی مفکروں کو اپنی تحقیق و دیانت کا کبھی دعویٰ ہو سکتا ہے ؟

حاصل کلام یہ کہ "پرتھی راج راسا کے تمام بیانات سرتاپا غلط اور سب کے سب فرضی اور خیالی ہیں۔ پرتھی راج راسا کے مؤلف نے پرتھوی راج کی ماں کا نام کملا تحریر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ دہلی کے راجہ اننگ پال کی بیٹی تھی۔ رائے بہادر گوری شنکر نے لکھا ہے کہ پرتھی راج سے متعلق یہ واقعہ جس قدر مشہور ہے اُسی قدر غلط بھی ہے۔ ان ایام میں اننگ پال نام کوئی راجہ دلی کی گدی پر نہیں تھا نہ اُس کی کملا نام کوئی بیٹی پرتھی راج کے باپ سومیشور سے بیاہی ہوئی تھی۔ صحیح یہ ہے کہ بیسل دیو کے عہد سے دہلی کا اجمیر کے ساتھ الحاق ہو چکا تھا۔ رہا پرتھی راج کی ماں کا نام سو وہ کملا نہیں کپور دیوی تھا۔

سلطان محمد فاتح

نام و نسب

سلطان محمد فاتح ابنِ سلطان مراد ابن سلطان محمد اول ابن سلطان بایزید یلدرم ابن سلطان مراد اول ابن سلطان اورخان ابن ابوالملوک غازی عثمان خاں بانیٔ سلطنت ترکان عثمانیہ۔

غازی عثمان خان جس کے نام پر سلاطین روم و ترک عثمانی ترک کہلاتے ہیں۔ ساتویں صدی ہجری کے وسط میں اپنے باپ ارطغرل خاں اور مع اپنے قبیلے کے خراسان سے نکل کر آرمینیا پہنچا اور پھر یہاں سے ہوتے ہوئے روم کے دربار میں جا پہنچا۔

یہاں روم کے دربار سے مراد ایشیائے کوچک کی اسلامی ریاست ہے، جہاں سلجوقی خاندان کا آخری فرماں روا سلطان علاء الدین کیقباد حکومت کرتا تھا۔ حسنِ اتفاق سے جس زمانے میں عثمان خاں اپنے باپ اور قبیلے کے ہمراہ ایک میدان سے گزر رہا تھا۔ سلجوقیوں اور تاتاریوں کی سخت لڑائی ہو رہی تھی جب ارطغرل نے دیکھا کہ دونوں فریق طاقت کے لحاظ سے یکساں نہیں ہیں۔ اُن میں ایک طاقتور اور دوسرا کمزور ہے تو اس کی شجاعت کی حمیت جوش میں آگئی اور وہ اپنے قبیلے کے پانسو آدمیوں کو ساتھ لے کر کمزور فریق کی مدد کو پہنچ گیا اور اس بہادری سے لڑا کہ طاقتور فریق نے شکست فاش کھائی۔ یہ طاقتور فریق تاتاری تھے اور کمزور

فریق سلجوقی تھے۔

ارطغرل نے چونکہ اس آڑے وقت میں سلطان علاء الدین سلجوقی کی مدد کی تھی اس لیئے سلطان اس کا بے حد ممنون تھا چنانچہ جب ارطغرل اپنے بیٹے غازی عثمان خاں کے ساتھ اُس کے دربار میں پہنچا تو سلطان نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اسے اور اس کے قبیلے کو بڑے بڑے عہدے اور جاگیریں عطا کیں۔ اور ارطغرل خان کو سلجوقی افواج کا سپہ سالار اعلیٰ مقرر کیا۔

۶۸۷ھ میں ارطغرل کے انتقال کے بعد غازی عثمان خاں سلجوقی فوجوں کا سپہ سالار اعلیٰ بنایا گیا۔ وہ اپنے باپ کا سچا جانشین ثابت ہوا۔ سلطان علاؤالدین سلجوقی نے اس کی خدمات کے اعتراف میں ایک خلعت نشان، سفید نقارہ اور ترکی زبان میں فرمان بھیجا، جس میں غازی عثمان خاں کو خودمختار امیر مقرر کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ سلطان نے اسے "اوزبک" کا خطاب بھی دیا اور اس بات کی بھی اجازت دی کہ وہ اپنے نام کا سکہ جاری کرے۔

ارطغرل نے تو اپنی غیر معمولی شجاعت کی بدولت صرف زمین پر ہی قبضہ کیا تھا۔ عثمان خاں نے اپنی روایتی شجاعت کے ساتھ ساتھ ستودہ صفات کی بدولت سلطان کے دل پر بھی قبضہ کر لیا۔ سلطان کی اولاد میں صرف ایک بیٹی ہی تھی جس کا غازی عثمان خاں سے نکاح کر دیا اور اسے اپنی دامادی کا شرف عطا کر کے سلطنت کے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا۔ نیز سلطان نے جمعے کے خطبے میں اپنے نام کے ساتھ غازی عثمان خاں کا نام شامل کرنے کا بھی حکم دے دیا۔ غرض عثمان خاں سلطان کے جیتے جی ہی سلجوقیوں کے تخت و تاج کا وارث بن گیا۔

ایک مصری فاضل لکھتا ہے کہ سلجوقیوں کا آخری فرماں بعاشاہ قونیہ رکن الدین سوئم تھا جسے مغل بادشاہ غازان نے قونیہ پر حملہ کر کے قتل کر ڈالا اور چونکہ اُس وقت سلجوقی خاندان کا کوئی جائز وارث نہیں تھا اس لیے غازی عثمان خان تخت و تاج کا مالک بن گیا لیکن ہماری تحقیق میں فاضل مصری مؤلف کا یہ خیال صریحاً غلط ہے کیونکہ رکن الدین کا زمانہ ۶۵۵ھ سے ۶۶۶ھ مطابق ۱۲۵۷ء سے ۱۲۶۷ء تک رہا اور اس کے بعد تین سلاطین اور ہوئے جن میں سے ایک سلطان غیاث الدین کیخسرو، دوسرے سلطان غیاث الدین مسعود ثانی اور تیسرے سلطان علاء الدین کیقباد ثانی تھا اور یہی سلطان جس کا زمانہ حیات ۶۹۶ھ سے ۷۰۰ھ مطابق ۱۲۹۶ء سے ۱۳۰۰ء تک رہا سلجوقی سلطنت کا آخری فرمانروا تھا۔ اور اسی سلطان کے بعد غازی عثمان خاں بانیٔ سلطنت عثمانیہ کی حیثیت سے سلجوقیوں کے تخت پر رونق افروز ہوا۔

تخت نشین ہوتے ہی غازی عثمان خان کو سب سے پہلے انہی سلجوقی ترکوں سے نبرد آزما ہونا پڑا، جو دعویٰ رکھتے تھے کہ علاء الدین کیقباد کے تخت پر بیٹھنے کا صرف ہمیں کو حق پہنچتا ہے۔ یہ ہمارا ورثہ ہے۔ اس پر طرفہ یہ کہ یونانی جو ایشیائے کوچک میں عثمان خاں کے رقیب اور دشمن تھے در پردہ انھیں شہ دیتے رہے لیکن عثمان خاں کے حسن تدبیر اور زور شجاعت نے یونانیوں کے تمام ارادوں اور منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔

غرض یہی وہ زمانہ ہے جس میں عثمانی ترکوں اور یونانیوں کے درمیان ایک مستقل مخاصمت قائم ہوگئی۔ اور یونانیوں نے اسلام اور مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے

مٹانے کا تہیہ کر لیا۔ اور عثمان خاں نے بھی اسلام اور مسلمانوں کی وہ خدمت کی اور دشمنوں کا مقابلہ کیا کہ اس کے طفیل قیامت تک کے لیے سلطنت ترکان عثمانیہ کا نام روشن کر دیا۔

عثمان خاں ایک سچا مسلمان اور اسلام پر مر مٹنے والا سلطان تھا اس کی دینداری اور خدا ترسی کا اندازہ کچھ اُس وصیت سے ہو سکتا ہے جو اُس نے بستر مرگ پر اپنے بیٹے اورخان سے کی تھی۔ اُس نے کہا تھا۔ میں مرتا ہوں۔ لیکن مجھے اپنے مرنے کا کوئی غم نہیں کیونکہ تم جیسے لائق بیٹے کو اپنی جگہ پر چھوڑے جا رہا ہوں، جو میری قائم مقامی مجھ سے بہتر کر سکتا ہے۔ دیکھو ظاہر اور باطن میں اللہ کا خوف رکھنا۔ عدل گستری کو اپنا شیوہ بنانا کہ اسی سے سلطنت کی بنیاد مضبوط ہوتی ہے۔ رحم کرتے رہنا کیونکہ ہمارے رب کی صفت رحیم ہے۔ حقوق کے معاملے میں قوی اور ضعیف کو یکساں سمجھنا، شریعت کو رائج کرنا اور کتاب و سنت کے مطابق عمل کرنا۔ اگر میری اس وصیت پر عمل کرو گے تو یاد رکھو تم بھی اُن اولیاء میں سے ہو جاؤ گے جو اللہ کی رضا سے کامیاب ہوتے ہیں۔

غازی عثمان خاں نے ستائیس برس حکومت کی۔ وہ تمام رعیت میں محبوب تھا۔ عیسائی، یہودی اور مسلمان سبھی یکساں طور پر اُسے چاہتے اور اُس کا احترام کرتے تھے۔ اُس نے ۱۲ رمضان المبارک ۷۲۶ھ بمطابق سنہ میں وفات پائی اور وصیت کے مطابق سلطنت عثمانیہ کے نئے دارالحکومت بروصہ میں دفن کیا گیا۔ اس کا علم اور شمشیر آج تک ترکی حکومت میں محفوظ ہے۔ ترکی خلافت کے دنوں میں ہر عثمانی خلیفہ اسے تخت نشینی کے موقع پر تبرک طور پر اپنی کمر سے باندھا کرتا تھا۔

غازی عثمان خاں کی ساری زندگی جہاد میں گزری۔ ہر چند اس کے اور شاہ قسطنطنیہ کے درمیان بہت سی لڑائیاں ہوئیں تاہم خدا کے فضل و کرم سے ہر مرتبہ سلطان غازی عثمان خاں ہی کو کامیابی حاصل ہوئی اور اس نے شاہ قسطنطنیہ کے جو اس کا زبردست حریف تھا۔ بڑے بڑے اہم تر علاقے اور وسیع تر مقبوضات کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ حتیٰ کہ غازی عثمان خاں نے جس وقت وفات پائی اُس وقت اُس کی سلطنت بحر اسود کے ساحل تک پھیل چکی تھی۔

ولادت

غازی عثمان خاں کی چھٹی پشت میں ایک سعادت آثار صاحب تدبیر و شجاعت فرزند پیدا ہوا، جسے ترکان عثمانیہ کی تاریخ میں سلطان محمد فاتح کے نام سے غیر معمولی شہرت و اہمیت حاصل ہے۔

سلطان محمد ۲۶ رجب ۸۳۱ھ میں پیدا ہوا۔ اس کے باپ سلطان مراد خاں نے اس کی تعلیم و تربیت بڑے اہتمام سے کی۔ اور اس کے لیے بڑے بڑے لائق فائق علماء کو مقرر کیا گیا۔ یہ اسی بات کا نتیجہ تھا کہ سلطان محمد فاتح اپنی مادری زبان ترکی کے علاوہ عربی، فارسی، لاطینی، عبرانی اور یونانی وغیرہ پانچ زبانوں میں پوری مہارت رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ سلطان محمد فاتح کو تحریر و تقریر کے فن پر بھی پوری قدرت حاصل تھی۔

ابھی سلطان محمد کی عمر بمشکل تمام چودہ برس کی تھی کہ اس کے بڑے بھائی علاء الدین کی حکومت کے صدمے نے اس کے باپ سلطان مراد خاں کو دنیا سے دل برداشتہ کر دیا اور وہ سلطان محمد کو تخت پر بٹھا کر گوشہ نشین ہو گیا۔ لیکن ابھی چند ماہ بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ عیسائیوں نے یہ دیکھ کر کہ مراد خاں ایسے بہادر، نڈر اور عقلمند سلطان کی بجائے ایک چہاردہ سالہ طفل حکومت کے تخت پر بیٹھا ہے۔ سلطنت عثمانیہ پر قبضہ کرنے کے ارادے قائم کر لیے۔

چنانچہ شاہ ہنگری نے پوپ کے اس اشارے پر کہ مسلمانوں کے ساتھ بدعہدی

کرنے میں کوئی گناہ نہیں۔ عہد و پیمان کا لحاظ کیے بغیر عثمانی مقبوضات میں بلغاریہ پر حملہ کر دیا۔ شاہ ہنگری جس نے انجیل لے کر قسمیں کھائی تھیں اور دس برس کے لیے صلح کی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ وہ اس وعدے کی پابندی بطور مذہبی فریضہ کے کرے گا۔ جب پوپ کے ایلچی نے اور صاف صاف کہہ دینے پر کہ ہم تمھاری نجات کے ذمہ دار ہیں۔ تم بلا تردد مسلمانوں پر حملہ کر ڈالو۔ اس میں کوئی گناہ نہیں۔ مسلمانوں پر حملہ آور ہو گیا۔ تو پھر چارو ناچار سلطان مراد خاں کو بھی گوشہ خلوت سے نکلنا پڑا۔

اس سے پہلے کہ عیسائیوں کی طرف سے لڑائی کا آغاز ہو۔ ترکوں نے ایک دو شاخہ علم بلند کیا۔ جس کی ایک شاخ پر "صلح نامہ" آویزاں تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ عیسائیوں کو اپنے کیے گئے معاہدے کا احترام کرنا چاہیے اور وہ جنگ و جدل سے باز آجائیں۔ لیکن عیسائیوں کو اپنے ساز و سامان اور کثرت افواج پر بہت ناز اور گھمنڈ تھا۔ انھوں نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی اور جنگ و جدل شروع کر دیا۔

ابتدا میں عیسائیوں کا پلہ بھاری رہا اُن کے لشکر کے سردار بڑھ بڑھ کر دادِ شجاعت دیتے رہے۔ لیکن عین اُس وقت جب عیسائیوں کا جوش و خروش غضبناک صورت اختیار کر گیا، ترکوں نے کمال ہمت سے کام لے کر ان کے سرغنہ کا سر کاٹ لیا۔

اب ترکوں کے علم کی دوسری شاخ پر جب عیسائیوں نے شاہ ہنگری کا کٹا ہوا سر دیکھا تو اُن کے سارے ولولے اور حوصلے ماند پڑ گئے اور ان کے لشکر میں آپا دھاپی پڑ گئی۔ پھر جب کسی نے موقع پایا وہ جان بچا کر میدان جنگ سے بھاگ نکلا اور جو رہ گیا وہ ترکوں کی تلوار کی نذر ہو گیا۔

اس فتح کے بعد اب سلطان مراد ثانی نے دوسری مرتبہ پھر سلطان محمد کو

تخت پر بٹھا دیا اور گوشہ نشین ہو گیا۔ لیکن سلطنت ہنگری کے ایک جنرل جان ہونیاڈ نے کئی مغربی امراء کو اپنے ساتھ ملا کر بغاوت کر دی جس سے سلطان مراد کو پھر گوشہ خلوت سے مجبوراً نکلنا پڑا۔ تین دن زبردست معرکہ آرائی ہوئی۔ آخر کار چوتھے روز جنرل جان ہونیاڈ حسب سابق میدانِ جنگ سے پھر بھاگ نکلا۔

اس مہم میں کامیاب ہو کر واپس آنے کے بعد سلطان مراد خاں نے فتح کی خوشی میں ایڈریانوپل میں ایک عظیم الشان جامع مسجد تعمیر کروائی اور اس واقعہ کے دو برس بعد اسکندریہ نامی ایک نومسلم کی بیٹی سے سلطان محمد کی شادی ہو گئی۔ اس دوران میں سلطان محمد ولی عہد سلطنت کی حیثیت سے مختلف شعبوں میں چھ سال تک تجربات حاصل کرتا رہا۔ حتیٰ کہ پھر وہ ساعت بھی آ پہنچی کہ دو مرتبہ کی تخت نشینی و معزولی کے بعد اکیس برس کی عمر میں مستقل طور پر تخت نشین ہو گیا۔

تخت نشینی

سلطان محمد فاتح اپنے باپ سلطان مراد خاں کے انتقال کے بعد ۸۵۵ھ بمطابق سنہ میں تیسری مرتبہ مستقل طور سے تخت نشین ہوا۔ تمام ہمسایہ سلطنتوں کے سفراء مبارک باد دینے کے لیے آئے۔ مگر اناطولیا کے امراء نے اب بھی اسے ایک طفل چہاردہ سالہ ہی خیال کیا اور اس ارادے سے کہ ترکان عثمانیہ نے اُن کے جن مقبوضات کو فتح کر لیا ہے۔ اُنھیں ترکوں سے چھین لیا جائے میدان کارزار گرم کر دیا۔ اگرچہ اُن کے اور ترکوں کے درمیان کئی معرکے ہوئے۔ تاہم سلطان محمد فاتح ہی اُن پر غالب آیا۔

اس زمانے میں صورتِ حال یہ تھی کہ ایشیا میں ابن کرمان کے ملک شہر سینوب اور حکومت کے باقی تمام ممالک سلطنت عثمانیہ کی اطاعت و ارادت کے حلقے میں داخل تھے۔ یورپ میں قسطنطنیہ کی حکومت ایک آزاد عیسائی مملکت تھی اور بلاد مورہ کئی ایک یونانی اور لاطینی امرا میں تقسیم ہو چکے تھے۔ البانیہ پر اسکندربیگ کا قبضہ تھا۔ سرویہ سلطنت عثمانیہ کی باجگزار تھی، بوسینیا خود سر تھا۔ ان کے سوا ہر جگہ ترکان عثمانیہ کا تسلّط تھا۔

اگرچہ سلطان محمد فاتح نے چھ برس کی مدت میں بہت کچھ سیکھ لیا تھا اور وہ ایک آزمودہ کار جرنیل بن چکا تھا۔ لیکن شاہ قسطنطین یازدہم اُسے اب بھی ناتجربے کار ہی خیال کرتا تھا چنانچہ اُس نے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی اور اپنا ایک سفیر سلطان کے دربار میں بھیجا جس نے بڑے گستاخ لہجے میں یہ پیغام دیا کہ اگر سلطان نے اُس شہزادے کا جو سلطان بایزید یلدرم کی اولاد سے ہے۔ اور قیصر کی نظربندی میں ہے، وظیفہ نہ بڑھایا تو ہمارا شہنشاہ شہزادے کو تخت پر بٹھا دے گا اور جس طرح چاہے سلطنت عثمانیہ کو درہم برہم کر ڈالے گا۔

سلطان محمد اُس وقت سلطنت عثمانیہ کے دارالحکومت اڈریانوپل سے دور ایشیائے کوچک کے سرکش امراء کا مزاج بحال کرنے میں مصروف تھا اسے وہیں سفیر کا پیغام بھجوایا گیا۔ لیکن سلطان نے اس وقت کمال حکمت عملی سے کام لیا وہ بجائے غضب ناک ہونے کے خاموش رہا اور نہایت صبر و سکون کے ساتھ اس موقع کو ٹال دیا۔

ایشیائی مہم سے فارغ ہونے کے بعد سلطان نے باپ کی وصیت کے

مطابق قسطنطنیہ کے فتح کرنے کی تیاریاں شروع کردیں اور شاہ قسطنطنیہ کا حال یہ تھا کہ وہ پیغام پر پیغام بھجوا رہا تھا آخر کار سلطان محمد نے اسے دو ٹوک جواب دیا کہ شہزادہ کا وظیفہ قطعی طور پر منسوخ کر دیا۔ شاہ قسطنطین نے جب یہ جواب سنا تو آگ بگولا ہو گیا۔ اور سلطان کے پاس کہلا بھیجا کہ اب وہ وقت دور نہیں جب ترکی شہزادہ (ارخان) کو لاکر ایڈریانوپل میں سلطنت کے تخت پر بٹھا دیا جائے گا۔

شاہ قسطنطین کے اس بیہودہ بات کے جواب میں ترکی وزیر اعظم خلیل پاشا نے یونان کے دربار کو نہایت تحقیر کے ساتھ تنبیہ کی کہ تمہارے بادشاہ قسطنطین نے جو روش اختیار کی ہوئی ہے اس کی بہت جلد اسے کڑی سزا بھگتنی پڑے گی۔

فتوحات

سلطان محمد فاتح کی فتوحات میں قسطنطنیہ کی فتح سرفہرست ہے۔ فان کریمر ایک مغربی مفکر لکھتا ہے کہ ابتداء سے محمد فاتح تک مسلمانوں نے قسطنطنیہ پر انتیس ۲۹ حملے کیے لیکن ہمارے مورخوں کے بیان کے مطابق قسطنطنیہ پر مسلمانوں کے نو حملے ثابت ہوتے ہیں۔

مسلمانوں کا پہلا لشکر امیر معاویہ نے ۴۸ھ میں بری و بحری دونوں راستوں سے قسطنطنیہ بھیجا جس میں حضرت ابوایوب انصاری، عبادہ بن صامت، ابوالدرداء، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر اور عبداللہ بن عباس وغیرہ صحابہ کبار بھی شامل تھے۔ اس کا سبب وہ حدیث نبوی بیان کیا جاتا ہے جس میں رسول اللہ نے فرمایا کہ میری امت کا پہلا لشکر جو قیصر کے شہر پر حملہ کرے گا اُسے اللہ نے بخش دیا ہے۔ اس کے علاوہ رسول اللہ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ تم قسطنطنیہ کو ضرور فتح کرلوگے اور وہ فاتح بھی خوب ہے اور اس کا امیر بھی خوب ہے۔ یہ روایت امام حاکم اور امام احمد بن حنبل کی مسند اور ابن عبدالبر کی استیعاب میں موجود ہے۔

چنانچہ اسی بنیاد پر سب سے پہلے امیر معاویہ ہی نے قسطنطنیہ فتح کرنے کی کوشش کی اور اس کے لیے سفیان بن عوف اور یزید بن معاویہ کی قیادت میں اسلامی فوج کو قسطنطنیہ بھیجا تھا جس میں مذکورہ بالا اصحاب کبار بھی شامل تھے جن میں سے میزبان رسول حضرت ابوایوب انصاری وہیں شہید ہوگئے اور فصیل کے نیچے دفن کیے گئے۔

دوسرا حملہ ۹۸ھ میں سلیمان بن عبدالملک اموی کے عہد خلافت میں ہوا بعد میں تیسرا حملہ ہشام اموی کے عہد خلافت میں ۱۲۱ھ میں ہوا۔ چوتھا حملہ خلیفہ مہدی عباسی کے عہد خلافت میں ۱۶۵ھ میں ہوا جس کی قیادت ہارون الرشید نے کی تھی پانچوں حملہ ملک شاہ سلجوقی نے کیا۔ چھٹا اور ساتواں حملہ ترکان عثمانی میں بایزید یلدرم نے کیا۔ آٹھواں حملہ ۸۲۵ھ میں سلطان مراد خاں نے کیا اور نواں حملہ یہی آخری حملہ تھا جو سلطان محمد فاتح نے کیا۔

قسطنطنیہ کی فتح کے لیے سلطان نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ باسفورس کے ساحل پر جس کے بالمقابل دوسرے کنارے پر سلطان بایزید کا بنایا ہوا ایک قلعہ پہلے سے موجود تھا۔ ایک نیا قلعہ رومیلیا حصار کے نام سے تعمیر کروایا۔ اس کے بنانے میں تین مہینے لگے جس میں تین ہزار آدمی روزانہ سرگرمی کے ساتھ کام کرتے تھے جب یہ قلعہ مکمل بن چکا تو اس پر بڑی بڑی توپیں نصب کردائیں۔ اور محاصرے کا تمام سامان تیار کر لیا۔

اب دونوں طرف سے مقابلے کی تیاریاں زور شور سے جاری تھیں۔ شاہ قسطنطین پہلے پہل تو زمینداروں، کسانوں اور جاگیرداروں کو سلطنت عثمانیہ کے خلاف اُبھارتا رہا لیکن جب ترکوں نے اُن کی اچھی طرح سرکوبی کی اور اُن کے فسادات کا قلع قمع کر دیا، تو عیسائیوں کو مذہب اور آسمانی فرشتوں کی مدد کا حوالہ دے کر اپنے اردگرد جمع کرنا شروع کر دیا۔

ہر چند سلطان ہراساں نہیں تھا تاہم مطمئن وہ بھی نہیں تھا۔ وہ بھیس بدل کر اپنے لشکر میں جاتا اور سپاہیوں کے خیالات معلوم کرتا۔ دارالسلطنت کے

گلی کوچوں میں نکلتا اور عوام کے حالات معلوم کرتا۔ پھر اس کے بعد ماہرین جنگ سے مشورے ہوتے کہ شہر پر حملہ کس طرف سے کیا جائے۔ توپیں کس مقام پر لگائی جائیں اور سرنگ کہاں لگائی جائے۔ غرض یہ تمام باتیں جو رات کی تاریکی میں طے پاتیں ان پر دن کے اُجالے میں فرضی طور پر تجربہ کیا جاتا۔

جوں جوں دن گزرتا جاتا تھا سلطان محمد خاں کی جنگی تیاریاں زور پکڑتی جاتی تھیں، جنھیں دیکھ دیکھ کر شاہ قسطنطین کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ اس نے پوپ آف روما سے نہایت عاجزی کے ساتھ مدد کی درخواست کی جسے اُس نے شرط پر کہ گریگین چرچ اور کلیسائے روم کے درمیان شاہ قسطنطین کوئی فرق روا نہیں رکھے گا اس کی درخواست کو قبول کر لیا اور ایک لشکر جرّار قسطنطنیہ کی حفاظت کے لیے اُس کے پاس بھیج دیا۔ اس کے علاوہ پوپ نے دیگر عیسائی ملکوں سے بھی شاہ قسطنطین کی مذہبی فریضہ کے طور پر مدد کرنے کی التجا کی جس کے نتیجے میں اٹلی اور اسپین کے لوگ کثرت سے اس کی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ اور اٹلی اور اسپین کی حکومتوں نے بھی مذہبی اتحاد کی رعایت سے اپنی الگ الگ فوجیں بھیجیں۔

اِدھر سلطان محمد نے جب وسیع پیمانے پر سامانِ جنگ مکمل کر لیا تو چیدہ چیدہ سپہ سالار، توپ خانہ اور زبردست بحری بیڑا لے کر ۸۵۷ھ مطابق ۱۴۵۳ء میں ایڈریانوپل سے قسطنطنیہ کے محاصرے کے لیے نکل پڑا۔ جہازوں کا بیڑا جو تین سو بحری جہازوں اور بہت سی بار بردار کشتیوں پر مشتمل تھا۔ گیلی پولی میں تیار ہوا اور اس بیڑے کا افسرِ اعلیٰ سلیمان بک تھا جو اپنے زمانے کا نامور امیر البحر تھا۔ مختصراً یہ کہ بحری و بری دونوں راستوں سے قسطنطنیہ کا محاصرہ شروع ہو گیا۔

رومیوں نے مسلمانوں کے حملے سے بچنے کے لیے بڑے بڑے چودہ جہاز خلیج گولڈن ہار کے دہانے پر کھڑے کر دیے جس کے سبب مسلمانوں کو حملہ کرنے میں دشواری پیش آئی۔ سلطان نے یہ دیکھ کر بحری راستے کے بجائے بری راہ اختیار کی۔ سلطان محمد نے آبنائے باسفورس اور خلیج گولڈن ہار کے دوسرے سرے تک درمیانی پتھریلی زمین پر چھ میل تک لکڑی کے تختے ڈال کر انھیں روغن سے چکنا کر دیا اور پھر اُن کے ذریعے راتوں رات خلیج گولڈن ہار سے اسی کشتیاں گزار کر انھیں قسطنطنیہ کی فصیل کے نیچے پہنچا دیا۔

رومیوں کو اس تمام حیرت انگیز کارروائی کا صرف اُسی وقت پتہ چلا جب مسلمانوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور دیکھا کہ سلطنت عثمانیہ کا جنگی بیڑہ فصیل کے نیچے کھڑا ہے۔ ہر چند رومیوں نے قسطنطنیہ کی حفاظت کے لیے غلطہ سے استنبول تک سمندر میں زنجیریں باندھ دی تھیں۔ اور جینوا کے جنگی جہازوں نے ترکان عثمانی کے جنگی بیڑے کا راستہ بھی روکا تھا۔ تاہم سلطان محمد نے اپنی خداداد لیاقت اور ذہانت سے کام لے کر اس مہم کو بھی سر کر لیا اور صرف یہی نہیں بلکہ گولڈن ہار پر بلا کسی مزاحمت کے ایک پُل بھی تیار کر لیا جس کے ذریعے شہر کی فصیل کے کمزور حصہ پر مؤثر گولہ باری کی اور مسلمانوں کا رومی منہ دیکھتے رہ گئے۔

گولڈن ہار کے معنی انگریزی میں سنہری سینگ یا شاخ زریں کے ہیں۔ یہ اس خلیج کا نام ہے جو آبنائے باسفورس سے ایک شاخ کے طور پر قسطنطنیہ کے اندر چلی گئی ہے۔ گولڈن ہار کے دونوں جانب آبادی ہے۔ ایک کو غلطہ کہتے ہیں اور دوسری کو استنبول۔ گولڈن ہار اپنی قدرتی دلفریبی کے لحاظ سے اپنی

مثال آپ ہے۔

سلطان محمد نے ۲۹ مئی ۱۴۹۳ء کی صبح کو عام حملے کا وقت مقرر کیا تھا۔ اس رات سارے لشکر میں چراغاں کیا گیا اور ساری فوج دعا اور عبادت میں مصروف رہی۔ صبح ہوتے ہی فصیل کی طرف بڑھی۔ سلطان نے شہر کے کنارے کنارے فوج کو پھیلا دیا اور اپنا خاص جھنڈا سینٹ رومانس کے بالکل سامنے نصب کر کے فوج کو حملے کا حکم دے دیا۔

اب دونوں طرف سے ایک خون ریز جنگ شروع ہو گئی۔ جوش و خروش کا ایک طوفان امنڈا ہوا تھا۔ بہادران جنگ آزما بڑھ بڑھ کر داد شجاعت دے رہے تھے۔ ترکوں کی طرف سے توپوں اور بندوقوں کے ساتھ ساتھ منجنیقوں اور تیروں سے بھی حملے کیے جا رہے تھے۔ رومی بھی مکمل گرمجوشی دکھا رہے تھے۔ لیکن یہ حالت کچھ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی کہ رومی اپنی کمزوری کا احساس کر کے قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے اور ترکوں کے حملے کا شہر کی فصیل سے جواب دینے لگے۔

رومیوں نے ترکوں کے اس زبردست سیلاب کو روکنے کے لیے توپوں سے کام لینا چاہا لیکن پھر وہ کچھ فصیل کی حالت دیکھ کر رہ گئے۔ سلطان جو اس وقت ایک بلند پہاڑی پر کھڑے ہو کر حالات کا جائزہ لے رہا تھا اس کی عمیق نگاہوں نے معاملے کو فوراً بھانپ لیا۔ وہ سمجھ گیا کہ فصیل کے جس حصے پر رومیوں نے توپیں نصب کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ مگر وہ پھر کچھ دیکھ کر رک گئے۔ اصل میں وہ فصیل کا بہت کمزور حصہ ہے۔ چنانچہ سلطان نے فوراً حکم دیا کہ چوده دہانے تیار کیے جائیں۔ پھر جب وہ تیار ہو گئے تو حکم دیا کہ ان پر بڑی بڑی توپیں

چڑھا کر فصیل پر ایک ساتھ گولہ باری کی جائے۔

کہا جاتا ہے کہ سلطان نے قسطنطنیہ پر حملہ کرنے کے لیے سلطنت عثمانیہ کے دارالحکومت ایڈریانوپل میں جو ایک بڑی توپ تیار کرائی تھی وہ بارہ من وزنی پتھر کا گولہ ایک میل کے فاصلے پر پھینک سکتی تھی۔ اس توپ کو ایڈریانوپل سے یہاں تک لانے کے لیے پانسو جوڑیاں مضبوط اور توانا بیلوں کی لگی ہوئی تھیں۔ اور تین ہزار سپاہی اس کی حفاظت پر مقرر تھے۔

مختصراً یہ کہ اس توپ کے گولوں سے فصیل ٹوٹ گئی اور ترکوں کو کشتیوں سے نکل کر اس میں داخل ہونے کی امید پیدا ہو گئی۔ شہر پناہ کے گرد سو فٹ گہری خندق تھی جسے پاٹ کر ترکوں نے ایک اچھا خاصا راستہ بنا لیا اور پھر یہ سوچ کر کہ اب شام ہو گئی۔ صبح کو شہر میں داخل ہوں گے۔ رات کو وہیں پڑ رہے۔ لیکن رومیوں نے اس وقفہ سے فائدہ اُٹھا کر راتوں رات فصیل کی شکستہ دیواروں میں جتنے روزن اور رخنے پڑ گئے تھے اُن سب کو پھر درست کر دیا اور خندق کی حالت بھی پھر ویسی ہی کر ڈالی اس کے علاوہ ٹوٹے پھوٹے برج بھی تیار کر دیے۔ غرض دوسرے دن پھر معرکہ آرائی شروع ہو گئی۔

اس مرتبہ رومیوں نے یہ کوشش کی کہ وہ پُل جسے ترکوں نے گولہ باری کرنے کے لیے تیار کیا ہے اُسے ڈھا دیا جائے۔ مگر انھیں کامیابی نہ ہو سکی۔ البتہ ایسی دھواں دھار گولہ باری ضرور کی جس سے ترکوں کے سارے منصوبے درہم برہم ہو گئے۔ اس پر مستزاد یہ کہ رومیوں کو جنیوا نے سامان رسد سے بھرے ہوئے پانچ جہاز اور فوج مدد کے طور پر مزید بھیج دی۔

جب ترکوں نے اپنی پوری کوشش کے ساتھ شہر کے شمال کی فصیل پر پھر گولہ باری کی۔ تو رومیوں اور یونانیوں میں ایک کھلبلی مچ گئی، وہ سب کے سب سمٹ کر اسی جگہ پر آ گئے اور انھوں نے فصیل کے کمزور حصّے کو پھر سے مضبوط کر دیا۔ حتیٰ کہ سات ہفتے کی مسلسل گولہ باری بھی اسے کوئی نقصان نہ پہنچا سکی۔

پورے دو مہینے کی ناکام کوشش کے بعد اب ترکوں نے مغربی شہر پناہ کا رُخ کیا۔ بری توپ خانے نے دھواں دھار گولہ باری کر کے رومیوں کے چار بڑے بڑے مورچوں اور برجوں کو ڈھا دیا۔ اسی طرح سینٹ رومانس میں بھی بڑے بڑے رخنے اور روزن پڑ گئے۔ ترکوں کا توپ خانہ گولہ باری سے تباہی پر تباہی لا رہا تھا اور دیواریں پاش پاش ہو کر گر رہی تھیں۔ یہاں تک کہ تھوڑے ہی عرصے میں فصیل کا بہت سا حصّہ گر گیا اور وہ گہری خندقیں جو ترکوں اور شہر کے لوگوں کے درمیان حائل تھیں۔ انہی برباد شدہ دیواروں سے پٹ گئیں اور ترکوں کے لیے پھر شہر میں داخل ہونے کا راستہ قطعی طور پر صاف ہو گیا۔

راستہ ہموار پا کر اس سے پہلے کہ سلطان محمد ترکوں کو عام حملہ کرنے کا حکم دے۔ اس نے قیصر کو یہ پیغام بھجوایا کہ اگر تم شہر کو اپنے آپ صلح کے ساتھ ہمارے سپرد کر دو تو سلطان تمام رعیّت کو آزاد کر دے گا اور اس کے معاملات میں کوئی دخل نہ دے گا۔ اس کے علاوہ اس شہر کے بدلے میں تمھیں موریہ کی حکومت عطا کر دی جائے گی۔ لیکن قیصر نے سخت کمینہ پن کا ثبوت دیا اس نے قاصد کو بہت بُرا بھلا کہا اور سلطان کے پاس کہلا بھیجا کہ تم سے پہلے بھی بہت سے عثمانی سلاطین قسطنطنیہ فتح کرنے کی آرزو اپنے دل میں لے گئے۔ اب تم بھی یونہی ناکام

واپس چلے جاؤ گے۔ اس سے بہتر ہے کہ یہاں سے خراج لینا منظور کر کے سرخروئی کے ساتھ واپس چلے جاؤ۔

سلطان نے اس کے بعد ایک مرتبہ پھر مصالحت کے لیے قاصد بھیجا اور کوشش کی کہ قیصر بغیر لڑے بھڑے کشت و خون ہونے کے شہر ہمارے حوالے کر دے لیکن اس نے اس بار بھی نہایت سختی سے جواب دیا۔ اب سلطان نے مجبور ہو کر فوج کو عام حملے کا حکم دے دیا اور اپنی فوج میں منادی کرا دی کہ شاہی عمارات کے سوا تمام مال غنیمت فوج کا حصّہ ہے۔ اس کے بعد فوج کو مختلف حصص و طرفین بہمہ تقسیم کر کے ہر حصّہ پر الگ الگ افسر مقرر کیا۔ اور اعلان کر دیا کہ جو افسر سب سے پہلے فصیل پر جا پہنچے گا اُسے مملکت عثمانیہ کے سب سے زرخیز صوبے کا گورنر بنا دیا جائے گا۔ اس اعلان کے بعد پھر سلطان گھوڑے پر سوار ہو کر فوج کی صفوں میں نکلا اور اُن کی ہمّت بڑھائی۔

ادھر قسطنطین یازدہم نے سرفروش ترکوں کے جذبات کا جو عالم دیکھا تو اس نے مذہب عیسائیت کے نام پر اراکین سلطنت اور اہالیان شہر کو جمع کیا اور اُن سے مدد کی درخواست کی لیکن سب نے اُسے منہ پر دو ٹوک جواب دے دیا اور کہا کہ ہم تجھ ایسے بے ایمان کی حکومت سے ترکوں کی حکومت میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ اب قیصر کو اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنی مخصوص فوج لے کر ترکوں کے حملے کو روکے اور شہر کی حفاظت کرے۔ اس کے علاوہ اُس کا پر جوش مددگار جو نیا سٹانی جو اس کی مدد کے لیے جنیوا سے جہازوں کو لے کر آیا تھا، اس کے ساتھ ہو لیا۔

سینٹ رومانس کے برج اور پھاٹک جیسے ترک توپ خانہ نے ڈھا دیا تھا جو سیتمانی نے انھیں نہایت سرگرمی کے ساتھ از سر نو درست کر دیا اور اس کی حفاظت کے لیے ڈٹ کر کھڑا ہو گیا۔ قیصر نے قلعہ اور شہر کی حفاظت اپنے ذمہ لے لی اور اب ترکی حملے کا انتظار کرنے لگا۔

سلطان نے ۲۹ مئی ۱۴۹۳ء کی صبح کو عام حملے کا وقت مقرر کیا تھا۔ اس رات سارے لشکر میں چراغاں کیا گیا اور ساری فوج دعا اور عبادت میں مصروف رہی۔ صبح ہوتے ہی فصیل کی طرف بڑھی۔ بری فوج جو سینٹ رومانس کی طرف پیش قدمی کر رہی تھی۔ ان میں سب سے آگے غیر منظم فوج تھی اور اس کے پیچھے منظم یعنی تجربے کار فوج تھی۔ پھر اس کے بعد "ینی چیری" ترک سپاہ کا مخصوص دستہ تھا جس کی کمان خود سلطان محمد خاں کے ہاتھ میں تھی۔

دو گھنٹے کی گھمسان لڑائی کے بعد ترکوں نے سینٹ رومانس کے دروازے میں گھسنا شروع کیا۔ آگے آگے غیر منظم فوج کے سپاہی تھے جو اندر داخل ہوتے جاتے تھے اور یونانی و رومی انھیں اپنی شدید ترین آتشبازی سے ہلاک کرتے جاتے تھے حتیٰ کہ پوری غیر منظم فوج سینٹ رومانس میں داخل ہو گئی۔ اس کے بعد جب راستہ صاف ہو گیا تو منظم فوج بھی اندر چلی آئی۔ حسن اتفاق سے منظم فوج کے پہلے ہی وار میں قیصر کا پُرجوش مددگار "جو سیتمانی" مارا گیا اور ساری ترک فوج کو سینٹ روماس میں گھسنے کا کھلا موقع مل گیا۔

ترکی فوج کا ایک بہادر جس کا نام حسن تھا اپنے ساتھ اٹھارہ آدمیوں کو لے کر برج پر چڑھنے لگا۔ بدقسمتی سے یونانیوں کے ایک جم غفیر گروہ نے دیکھ لیا اور

قتل کرڈالا۔ لیکن حسن کی یہ قربانی رائیگاں نہیں گئی۔ اس دوران میں جبکہ حسن اور ان کے درمیان جنگ ہو رہی تھی۔ ترکی فوج کی باقی صفوں کو موقع مل گیا اور اس نے بعجلت برجوں پر چڑھ کر تمام دمدموں پر قبضہ کر لیا۔

عین اس وقت کہ جب بری فوج قسطنطنیہ کے شہر میں داخل ہو رہی تھی ترکوں کی بحری فوج نے خاص قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ اب یونانی و رومی سمجھ چکے تھے کہ ترکوں کے ہاتھ سے رہائی ناممکن ہے وہ اپنی جان پر کھیل کر مقابلے کے لیے آموجود ہوئے اور ایک آخری خوں ریز معرکہ ہوا جس میں آخری فرمانروائے روم قیصر بازو ہم مارا گیا۔ اور قسطنطنیہ کے قدیمی اور تاریخی شہر پر اسلام کا علم بلند ہوا۔

اس فتح میں بے شمار دولت ترکوں کے ہاتھ آئی اور قیصر کے محلات جو یورپ اور ایشیاء کی بہترین مصنوعات اور نفیس آثار قدیمہ سے بھرے پڑے تھے۔ ترکان عثمانیہ کے قبضے میں آ گئے۔ سلطان محمد اس عظیم الشان کامیابی کے موقع پر سجدے میں گر گیا اور پروردگار عالم کی بارگاہ میں دوگانہ شکر ادا کیا۔

شہر فتح ہو جانے کے بعد جب لڑائی ختم ہو گئی تو سلطان نے قیصر روم کی لاش ڈھونڈنے کا حکم دیا۔ چنانچہ بسیار تلاش و جستجو کے بعد پشتوں کے پشتے میں قیصر کی لاش ملی، جسے سلطان نے شاہانہ اعزاز و اکرام کے ساتھ اس کے باپ دادا کے مقبرے میں دفن کروا دیا۔

سلطان اپنی فوج کے ساتھ جس وقت مشہور کنیسہ ایا صوفیہ، یعنی سینٹ روماس کے دروازے پر پہنچا۔ اس میں آذان دلوائی اور ظہر کی نماز پڑھی۔ اس کے باعث یہ مقام جامع مسجد ہو گیا۔

سلطان نے رومیوں کے ساتھ نہایت اچھا برتاؤ کیا۔ اس نے ان کے مذہبی معاملات میں بالکل کوئی دخل نہیں دیا۔ بلکہ انھیں پوری پوری مذہبی آزادی بخشی۔ اور عیسائیوں کی ایک مذہبی مجلس قائم کر کے اُن کے تمام معاملات اس مجلس سے وابستہ کر دیے۔ اور سوائے چند کینسوں کے جو مسجدوں میں تبدیل ہو چکے تھے سب کے سب عیسائیوں کو دے دیے۔ اس کے علاوہ راہبوں اور کیتھیسوں کو ہر قسم کی خدمات و محصولات سے مستثنیٰ کر دیا۔ اور یہ سلطان کی اسی رواداری اور صلح و آشتی کا نتیجہ تھا کہ جو رومی ڈر کے مارے وہاں سے بھاگ گئے تھے۔ وہ پھر واپس آکر وہاں آباد ہو گئے اور امن و سکون اور آرام و آسائش کی زندگی گزارنے لگے۔

جشنِ فتح

اس فتح عظیم کی خوشی میں جو حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کے مطابق حاصل ہوئی تھی تمام دنیائے اسلام میں جشنِ مسرت منایا گیا۔ یورپ اور ایشیاء کے تمام بڑے بڑے بادشاہوں نے سلطان کی خدمت میں تہنیت اور مبارکباد کے خطوط اور پیغامات بھیجے اور دنیا کے تمام بادشاہوں نے سلطان محمد کی فرمانروائی کو تسلیم کرلیا اور سلطان کے رعب و دبدبے کا سکہ اُن کے دلوں پر بیٹھ گیا اور اسی فتح کی مناسبت سے سلطان محمد کو فاتح کے جلیل القدر لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

"بلدہ طیبۃ" جو قرآن حکیم کی ایک آیت کا ٹکڑہ ہے اس فتح کی تاریخ ہوئی۔ یعنی ۸۵۷ ہجری سلطان نے اس فتح کے بعد "اڈریانوپل" کی بجائے قسطنطنیہ ہی کو سلطنت عثمانیہ کا دارالخلافہ قرار دیا۔ اس کے علاوہ حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مزار پر ایک جامع مسجد تعمیر کرائی جس میں شیخ الاسلام محمد شمس الدین نے سلطنت عثمانیہ کے بانی غازی عثمان خاں کی تلوار سلطان محمد فاتح کے حمائل کی۔

اس کے بعد تبرکاً اسی جگہ عثمانی سلاطین کی کمر میں تبرکاً تلوار لٹکانا اور دیگر تاجپوشی کی رسمیں ادا کرنے کا رواج قائم ہوا۔

کہتے ہیں فتح قسطنطنیہ کے موقع پر سلطان محمد فاتح صرف ۲۶ سال کا تھا یعنی سکندر اعظم سے اس موقع پر جب اُس نے گرانیکوس کی مہم سر کی ہے تین سال بڑا تھا۔

اور نپولین اوّل سے جب اس نے معرکہ لودی ہیں کامیابی حاصل کی تین سال چھوٹا تھا۔

مفتوحین سے حسنِ سلوک

ٹی۔ ڈبلیو ارنلڈ جو ایک مشہور مغربی مفکر اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں پروفیسر تھا۔ اپنے ایک مضمون میں جو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ ماہ دسمبر ۱۸۹۲ء میں دہلی میں پڑھا گیا تھا سلطان محمد فاتح کے بارے میں لکھتا ہے کہ شاہ قسطنطین اور اس کے بزرگوں نے سلطنت کے اہلکاروں کو رعایا پر ظلم و ستم ڈھانے کی کھلی چھٹی دے رکھی تھی۔ عدالت کے حاکموں نے مظلوموں کے آنسو اور بے گناہوں کے خون سے خزانے بھر لیے تھے۔ فوج کے یونانی افسر اپنی زرق برق پوشاک پر بہت نازاں تھے۔ ملک کے باثر لوگ حکومت کے خلاف سنگین جرائم کرنے سے نہ چوکتے نہ اس پر نادم ہوتے تھے۔ فوج کے سپاہی اکثر میدانِ جنگ سے بھاگ کر چلے آتے اور اس پر انھیں کوئی عار محسوس نہیں ہوتی تھی۔ غرض خدا نے جب یہ حالت دیکھی تو اس کے سدھارنے کے لیے سلطان محمد فاتح کو پیدا کیا اور اس کی مدد کی۔

سلطان محمد فاتح کی فوج میدان جنگ کو عین مقام مسرت سمجھتی تھی اور اس کے قاضی (حاکم) دیانت میں بد دیانتی نہیں کرتے تھے۔ مفتوحین کے ساتھ سلطان کے فیاضانہ سلوک اور عمدہ برتاؤ کا اندازہ کچھ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ وہ امراء و رؤسا اور دوسرے آدمی جو سلطان کی فوج کے ہاتھ میں گرفتار ہو گئے تھے۔ سلطان نے فوج کو معاوضہ دے کر انھیں آزاد کرایا۔ اور شہر میں جلد امن و امان قائم کرنے کی طرف پوری توجہ دی۔

سلطان نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ شہر میں مکمل امن وامان قائم کیا۔ اور سلطان نے خود گریک چرچ کا سرپرست بن کر عیسائیوں سے اطاعت قبول کرائی اور ملک میں ممانعت کر دی کہ عیسائیوں پر ہرگز کوئی ظلم وستم نہ ہونے پائے اور ایک فرمان چرچ کے پیٹریارک کے نام جاری کیا جس میں تمام اختیارات جو اُسے یا اُس کے جانشینوں کو بلا تمت عیسائیوں کو پادریوں کے عہد حکومت میں حاصل تھے، عطا کیے۔

گناڈوس جو پہلا پیٹریارک (افسر اعلیٰ) ترکوں کے زمانے میں منتخب ہوا تھا، اسے سلطان نے خود اپنے ہاتھ سے وہ عصا تفویض کیا جو اس کے منصب کا نشان تھا۔ اور ایک تھیلی جس میں ایک ہزار طلائی ڈکٹ تھے اور ایک گھوڑا مع قیمتی ساز وسامان کے اسے مرحمت کیا۔ اور اجازت دی کہ وہ اپنے مقررہ سامان جلوس کے ساتھ شہر میں دورہ کیا کرے۔ علاوہ ان اعزازات کے جو عیسائیوں کی حکومت میں اسے حاصل تھے۔ سلطان نے اسے ملکی اختیارات بھی تفویض کیے۔ چنانچہ پیٹریارک گناڈوس نے ان عنایات بے پایاں پر سلطان کا ان الفاظ میں شکریہ ادا کیا۔

"میں حضور والا کی اس عزت افزائی کا بے حد ممنون ہوں اور شرمندگی کے ساتھ اس کے شکریہ ادا کرنے میں قاصر رہنے کی معافی چاہتا ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ میرے پیشرو بزرگوں نے خود عیسائی حکمرانوں کے دور میں ایسے اعزاز و اکرام کا نمونہ نہیں دیکھا گیا۔"

الغرض سلطان محمد فاتح نے رعایا کے ساتھ ہر طرح کی فیاضی اور مہربانی کا

سلوک کیا وہ لوگ جو ملکی انقلاب کے باعث قسطنطنیہ چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ وہ دوبارہ آکر آباد ہو گئے۔

سلطان محمد فاتح نے ایک بڑا کام یہ کیا کہ عیسائیوں کی مذہبی مجلس قائم کردی جس میں گریک چرچ کے معزز عہدے دار حضرات جمع ہوتے تھے اور عیسائیوں کے مذہبی اور دنیاوی معاملات کا فیصلہ کرتے تھے۔ سلطنت عثمانیہ کے جس قدر احکام عیسائیوں کے بارے میں جاری ہوتے وہ اسی مجلس کے ذریعے عیسائیوں تک پہنچتے تھے۔ اس مذہبی مجلس کو تمام ایسے فیصلوں پر جو ماتحت پادری صاحبان اپنی اپنی عدالتوں میں لکھتے تھے۔ ان کے منسوخ یا بحال رکھنے کا پورا پورا اختیار حاصل تھا۔ اور اس مجلس کو عیسائی مجرموں پر جرمانے کرنے یا انھیں قید کرنے کا بھی اختیار دیا گیا تھا جس کے لیے علیحدہ قید خانے بھی قائم کیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ خاص حالتوں میں بیٹری ارک کی عدالت سنگین جرائم میں سخت سزائیں تجویز کرنے کی بھی مجاز تھی۔

بیٹری ارک کو یہ اختیار بھی حاصل تھا کہ جب چاہے پادریوں کی مجلس منعقد کرے۔ اور جب چاہے اسے برخاست کردے۔ علاوہ ازیں عیسائیوں میں جو مذہبی اختلافات پیش آئیں ان پر سلطنت عثمانیہ کی شرکت کے بغیر فتوے یا فیصلے بھی لکھے۔ اگر گورنروں کی زیادتی کے باعث عیسائیوں پر کسی قسم کا ظلم وستم ہوتا تو سلطانی اہل کار ہونے کی حیثیت سے وہ سلطان سے داد خواہی کا بھی مجاز تھا۔

سلطنت عثمانیہ کے ہر صوبے میں بشپ پادریوں کے ساتھ نہایت اچھا سلوک ہوتا تھا اور معزز پادری ملکی انتظامات میں اسی سبب سے یہ نسبت اپنے منصبی

کام کے زیادہ مستعد رہتے تھے۔ اور عیسائیوں کو ہمیشہ اس کی ہدایت کرتے رہتے تھے کہ ہمارے چرچ کی حفاظت اور سرپرستی کے لیے خدا نے سلطان کو مقرر کیا ہوا ہے۔

دولت عثمانیہ نے پھر ایک فرمان جاری کیا جس سے تمام گرجا جو مسجدوں کے لیے ضبط نہیں ہوئے تھے۔ عیسائیوں کو واپس مل گئے۔ اور انھیں اپنے طریقے پر مذہبی رسموں کو کھلم کھلا ادا کرنے کی قطعی اجازت مل گئی۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

مذکورہ بالا اقتباس ہیں جو پروفیسر ازملڈ کے ایک طویل مقالے سے لیا گیا ہے۔ ایک جگہ گرجاؤں کو مسجدوں کے لیے ضبط کیے جانے کا اشارہ کیا گیا ہے۔ ممکن ہے اس سے کوئی غلط فہمی پیدا ہو اس لیے ضروری خیال کیا گیا کہ یہ بات واضح کردی جائے کہ سینٹ صوفیہ کے سوا کسی مسیحی معبد کو مسجد نہیں بنایا گیا۔ اب رہی سینٹ صوفیہ کی بات تو اصل میں سینٹ صوفیہ کی عمارت کو جو اس وقت جامع ایا صوفیہ ہے انقلاب دیکھنے کا یہ پہلا موقع نہیں ہے۔ اس سے پہلے اسے قسطنطین اعظم کے عہد میں بھی ایسے ہی انقلاب سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ قسطنطین اعظم سے پہلے یہ یونانیوں کا مندر تھا اور اس میں عقل کے دیوتا کی پوجا ہوتی تھی جب قسطنطین اعظم نے اس پر قبضہ کیا تو عقل کے دیوتا کی پرستش ختم کر کے عیسائیوں کے مذہب تثلیث کی عبادت کی رسم جاری کی گئی۔

دیگر فتوحات

یوں تو عیسائی حکومتیں شروع ہی سے مسلمان حکومتوں کو رشک و حسد کی نگاہ سے دیکھتی تھیں لیکن فتح قسطنطنیہ کے بعد تو وہ انگاروں پر لوٹنے لگیں۔ اور تہیہ کر لیا کہ جس قیمت پر بھی ہو سکے ترکوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے۔ اس سلسلے میں کالکتوس سوئم پوپ آف روما کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ صلیبی جنگ کے علمبرداروں میں ایک اس کی ذات بھی تھی۔ اس کی ترکوں کے خلاف متواتر اور لگاتار کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۸۶۰ھ میں عیسائی حکومتیں خم ٹھونک کر ترکوں کے مقابلے پر آگئیں اور سلطنت عثمانیہ پر حملہ آور ہوئیں۔

فتح سربیا

سلطان محمد فاتح بھی ڈیڑھ لاکھ فوج اور دو سو جنگی جہاز لے کر عیسائی حکومتوں کا مزاج بحال کرنے کے لیے مقابلے پر آگیا اور سربیا (سرویا) کے دارالسلطنت شہر بلگریڈ کا محاصرہ کر لیا۔ قریب تھا کہ دارالسلطنت کو فتح کر لے ہنگری کا مشہور سپہ سالار ہونیاد پچر کمک لے کر آپہنچا۔

ہونیاد، شاہ ہنگری کا ولد الحرام بیٹا تھا۔ اور کئی مرتبہ ترکوں کے مقابلے میں آچکا تھا۔ مگر سلطان محمد فاتح کی ضرب شجاعانہ اسے برابر میدانِ جنگ سے

بھگاتی رہی۔ اس مرتبہ وہ پھر مقابلے میں آیا۔ ایک عیسائی نے سلطان پر اور ایک مسلمان (ترک) نے ہونیادر پر وار کیا۔ دونوں زخمی ہو کر جنگ کے ناقابل ہو گئے جس سے لڑائی ملتوی ہو گئی۔

اس لڑائی میں بیس ہزار ترک شہید ہوئے۔ سلطان کا زخم معمولی تھا۔ چند روز میں اچھا ہو گیا۔ لیکن ہونیادر جسے قضا لے آئی تھی اس کا زخم کاری ثابت ہوا۔ بیس روز تک موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہ کر آخر کار اس نے دم توڑ دیا۔ اس کے مرنے سے دولت عثمانیہ نے اپنے سب سے بڑے دشمن سے نجات حاصل کر لی۔

اس جنگ کے بعد سلطان نے ۸۶۳ھ میں محمود پاشا صدر اعظم کو پھر تسخیر سربیا کے لیے روانہ کیا اور اس نے آتے ہی سربیا کے تمام مقبوضات فتح کر کے دولت عثمانیہ میں شامل کر لیے۔ صرف ایک شہر بلگریڈ اس کے ہاتھوں سے بچ گیا تھا کیونکہ اس نے سلطنت ہنگری میں شمولیت کر لی تھی باقی تمام مقبوضات سلطنت عثمانیہ میں آ چکے تھے۔

قبضہ مورہ

گزشتہ جنگ میں جو یورپ کی متحدہ افواج اور ترکان عثمانیہ کے درمیان ہوئی تھی اس میں چونکہ والی مورہ تو ماس نے بھی سلطان فاتح کے دشمنوں کا ساتھ دیا تھا۔ اس لیے سلطان نے فتح سے فراغت پانے کے بعد پھر مورہ کا رخ کیا اور حملہ کر کے شہر کورنتھ اور اس سے متعلقہ تمام شہروں پر قبضہ کر لیا۔ قریب تھا کہ مورہ پر بھی قبضہ کر کے اس کا خاتمہ کر دے کہ والی بوسینا کی عاجزی اور سفارش

آئے آئی سلطان نے والیٔ مورہ کو معاف کردیا۔ اور اس نے بارہ ہزار اشرفی سالانہ خراج ادا کرنے کا وعدہ کر کے جان بچائی۔ مگر افسوس والیٔ مورہ نے اپنی روایتی بدعہدی کی اور وہ پھر سرکش ہو گیا۔ اب سلطان نے دوبارہ مورہ پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا اور والیٔ مورہ جان بچا کر اٹلی بھاگ گیا۔

فتح بوسینا

والیٔ بوسینا ویتر بوس نے بھی گزشتہ جنگ میں سلطان کے دشمنوں کا ساتھ دیا تھا۔ اس لیے سلطان نے فتح قسطنطنیہ کے بعد سب سے پہلے بوسینیا ہی پر حملہ کیا تھا۔ مگر والیٔ بوسینیا نے بارہ ہزار سالانہ اشرفی خراج ادا کرنے کے وعدے پر سلطان سے صلح کر لی اور وہ آئندہ کے لیے اس کی دوستی کا دم بھرنے لگا۔ لیکن جبل گردد، جبلت نہ گردد کے بمصداق وہ اپنی فطرت سے مجبور تھا۔ چنانچہ اُس نے پھر عہد شکنی کی۔ سلطان نے بھی اس پر حملہ کیا مگر وہ یونان کے مجمع الجزائر کی طرف بھاگ نکلا اور وہ وہیں مر گیا۔

اب بوسینیا کے نئے حکمران نے بھی اپنا وہی طرزِ عمل اختیار کیا جو اس کے پیش رو کا تھا۔ بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ خراج ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ سلطان نے اپنے وزیر اعظم محمود پاشا کو حملہ کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ محمود پاشا نے فوج کشی کی اور بوسینیا پر فتح پائی اور بوسینیا کے نئے حکمران کو ترکوں نے گرفتار کر لیا۔ ہنگری کے نامور سپہ سالار ہونیاد کے بیٹے میتیاس نے بوسینیا پر حملہ کر دیا۔ ترکان عثمانیہ نے ڈٹ کر اس کا مقابلہ کیا جس میں بے شمار ہنگری سپاہ ترکوں

کے ہاتھ واصل جہنم ہوئی۔ اور میدان ترکوں کے ہاتھ رہا۔

اس لڑائی کے بعد بہت سے شہزادوں نے اپنی رضا و رغبت سے اسلام قبول کر لیا اور وہ ہمیشہ اس پر ثابت قدم رہے۔ یہ اسلام کی روحانی قوت اور مسلمانوں کے حسنِ عمل کا نتیجہ تھا جس کا نقش نئے نئے مسلمان ہونے والے عیسائیوں کے دلوں پر ہمیشہ کے لیے ثبت ہو گیا۔

فتح طرابزون

قسطنطنیہ سے نو سو کیلومیٹر کے فاصلے پر ایشیائے کوچک میں ایک نہایت پرانا اور قدیم شہر ہے جس کا نام ہے۔ طرابزون۔ یہ شہر جب قسطنطنیہ ابھی تعمیر نہیں ہوا تھا۔ رومی حکومت کا پایہ تخت تھا۔ بہت بڑا تجارتی مرکز اور ایک اہم بندرگاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ سلطان کے زمانے میں ایک ایشیائی امیر روزن حسن نے چاہا کہ وہ طرابزون کو سلطنتِ عثمانیہ سے علیحدہ کر لے۔ سلطان نے محمود پاشا کے ذریعے طرابزون اور اسفندیاران دونوں ریاستوں کو دولت عثمانیہ میں شامل کر لیا اور شاہ طرابزون جو قسطنطنیہ کے شاہی خاندان کا ایک شہزادہ تھا اسے نظر بند کر دیا۔

۹۸۱ھ میں حسن روزن نے جو افراط سے آمو دار یا تک قابض تھا۔ دولت عثمانیہ کے حدود میں تاخت و تاراج شروع کر دی۔ سلطان بذاتِ خود اس کے مقابلے کو نکلا اور اُسے آذربائیجان کے قریب ایسی شکست دی کہ پھر اس میں مقابلے پر آنے کی کبھی ہمت پیدا نہ ہوئی۔

سینوب

روزن حسن، تیمور لنگ کی نسل سے تھا۔ اور ایشیائے کوچک میں ساحل بحر اسود پر واقع ایک مشہور بندرگاہ سینوب پر حکمرانی کرتا تھا۔ (دیو جانسن کلبی، مشہور عالم فلسفی یہیں پیدا ہوا تھا) ہر چند وہ سلطان کا باجگزار تھا۔ تاہم ترکان عثمانی اور تیمور لنگ کے درمیان ایک جنگ ہو چکی تھی۔ اس لیے وہ عثمانی ترکوں کے خلاف دل میں کدورت رکھتا اور جب موقع پاتا عثمانی ترکوں کی مخالفت کرتا۔ اس لیے سلطان نے ۸۹۴ھ میں سینوب پر قبضہ کر لیا۔ یہیں سے ایک مستقل کدورت روزن حسن کے دل میں ترکوں کے خلاف پیدا ہو گئی، جس کے لیے وہ اکثر مواقع کی تلاش میں رہتا تھا جیسا کہ طرابزون کی مثال سامنے ہے۔

ٹڈیلی کی تسخیر

ٹڈیلی جسے ٹیلین بھی کہتے ہیں بحر متوسط کی ایک بندرگاہ ہے۔ ترکان عثمانی کے حملے کے دنوں میں اس پر اہل بندقیہ کا قبضہ تھا۔ ۸۶۶ھ میں صدر اعظم محمود پاشا کو خشکی کے راستے ٹڈیلی کی طرف روانہ کیا اور خود سلطان ادرنہ اور گیلی پولی کے بحری بیڑے کو لے کر بحری راستے سے ساحل اناطولیہ پر جا اترا اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن اس دوران میں شاہ ٹڈیلی نے اطاعت قبول کر لی جس سے سلطان نے محاصرہ اٹھا لیا اور اس پر اپنا قبضہ کر کے دار السلطنت کی طرف واپس چلا گیا۔

اہل بندقیہ

بندقیہ، یورپ کی سب سے عظیم الشان بحری اور تجارتی سلطنت تھی اس کی ہمسری کا دعویٰ صرف جنیوا کو ہو سکتا تھا اس کے سوا یورپ کی کوئی سلطنت اس کے پائے کو نہیں پہنچ سکتی تھی۔

ترکان عثمانیہ اور اہل بندقیہ کے درمیان قدیم زمانے سے عداوت چلی آرہی تھی۔ اہل بندقیہ کا حال یہ تھا کہ وہ جب موقع پاتے ترکوں کو شدید نقصان پہنچاتے اور ان کی مخالفت کرنے سے کبھی باز نہ آتے تھے۔

مورہ جس پر سلطان نے قبضہ کرلیا تھا بندقیہ اسے سلطان کے قبضے سے نکالنا چاہتے تھے اور اس کے لیے وہ اکثر وہاں کے لوگوں کو ترکوں کے خلاف اکساتے اور طرح طرح سے بہکاتے رہتے تھے۔ اس سے بڑھ کر انھوں نے یہ کیا کہ ایک موقع پر بہت سے ترکوں کو ناحق مار ڈالا اور اپنے ساتھ جہازوں کو لے کر اینوز پر قبضہ کرلیا۔

اہل بندقیہ کا صریحاً ظلم اور بڑھتی ہوئی سرکشی دیکھ کر سلطان نے چڑھائی کردی ۸۷۳ھ میں جزیرہ اغریبوز پر قبضہ کرلیا جو اہل بندقیہ کے جزائر بحر روم کی نوآبادیات کا صدر مقام تھا۔

اہل بندقیہ نے جزیرے والوں کی مدد کے لیے امیر البحر نکولس کو انشی جہازوں کو بیڑا دے کر روانہ کیا لیکن جزیرے والوں کو مدد پہنچنے سے پہلے پہلے وہاں مسلمانوں کا جھنڈا لہرا چکا تھا۔ امیر البحر نکولس یہ ماجرا دیکھتے ہی الٹے پاؤں واپس پھر گیا اور مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے بجائے اپنے جہازوں کے پلاس پاندارس کی طرف بھاگ نکلا۔

۸۸۲ھ میں ترکان عثمانیہ نے اہل بندقیہ کے مقبوضات پر پھر حملہ کیا اور

کر دا سیا، ڈلماسیا دونوں اقالیم کو فتح کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ اہل بندقیہ یہ صورتِ حال دیکھ کر ڈرے کہ کہیں ایسا نہ ہو ترکانِ عثمانیہ ہمارے اہل شہر پر قابض ہو جائیں۔ لہٰذا انھوں نے ایک لاکھ اشرفی سالانہ خراج ادا کرنے پر صلح کر لی اور شہر کرویہ (آقچہ حصار) کو جو اسکندر بیگ البانی کا صدر مقام تھا ترکوں کے حوالے کر دیا۔ اس کے علاوہ اہل بندقیہ کے اور بہت سے شہر بھی سلطان کے قبضے میں آئے جن میں اشقودرہ خاص کر بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

اہل جنیوا

جنیوا کی سلطنت بھی یورپ کی ایک عظیم الشان سلطنت تھی۔ چونکہ اہل جنیوا سے بھی ترکان عثمانی کی قدیم دشمنی چلی آرہی تھی اور اہل جنیوا جب موقع پاتے ترکان عثمانیہ کو نقصان پہنچاتے تھے اس لیے سلطان نے آئے دن کے خطرے کو روکنے کے لیے اپنے نئے وزیر اعظم "احمد پاشا" کو جنیوا پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔

مشرقی روس

جزیرہ نمائے کریمیا اور وہ تمام علاقے جو بحر اسود کے شمال میں واقع ہیں۔ اُن پر چنگیز خاں کے زمانے سے اُن تاتاریوں کی حکومت چلی آتی تھی جنھوں نے تیمور لنگ کے زمانے میں اسلام قبول کیا۔ تیمور لنگ نے ممالک تاران، اژدہان، کریمیا اور قبچاق کے تاتاریوں کو متحد کر کے قبچاق کی حکومت قائم کی اور یہ حکومتیں ایک عرصے تک طاقتور اور فاتحانہ شان کی مالک رہیں۔ لیکن ایک مدت گزر جانے کے بعد ان میں کمزوریاں اور بدعنوانیاں پیدا ہو گئیں جس سے فائدہ اُٹھا کر اہل جنیوا نے آزاف، کفہ اور سکوب وغیرہ بندرگاہوں پر قبضہ کر لیا اور ان مقامات پر اپنے تجارتی گودام کھول دیے جن سے انھیں سب سے بڑھ کر فائدہ

یہ پہنچا کہ وہ یہاں رہ کر اسلامی ملکوں میں فتنہ و فساد پھیلاتے اور پھر مسلمانوں کی باہمی نااتفاقی کا فائدہ اُٹھانے میں پورے پُورے کامیاب ہوتے رہے۔

سلطان نے اہلِ جنیوا کو یہاں سے نکالنے کے لیے اُن پر حملہ کیا اور احمد پاشا کو تین سو جنگی جہازوں کا بیڑا لے کر بندرگاہوں کی طرف روانہ کیا۔ بالآخر کئی ایک لڑائیوں کے بعد اہلِ جنیوا کو وہاں سے نکال کر سلطان نے اُن پر قبضہ کر لیا۔

اسی دوران میں قبچاق کے آخری حکمران "حاجی کرائے" فوت ہو گیا اور اس کے بارہ[12] بیٹے باپ کا تخت و تاج حاصل کرنے کے لیے آپس میں اُلجھ پڑے اور ان میں سخت خانہ جنگی ہونے لگی۔ علمائے اسلام نے ملک میں امن و امان بحال کرنے کی غرض سے ایک محضر نامہ سلطان کی خدمت میں پیش کیا اور درخواست کی کہ حاجی مرحوم کے بیٹوں میں مصالحت کرا کے ملک کو تباہی و بربادی سے بچایا جائے۔

سلطان اُس وقت اہلِ جنیوا کو شکست دے کر واپس آ رہا تھا۔ اس کے ہمراہ بہت سے جنگی قیدی بھی تھے جن میں حاجی کرائے کا بیٹا منکلی کرائے بھی تھا۔ سلطان کو اس کے حالات کا علم ہوا تو نہایت شفقت سے پیش آیا اور علمائے اسلام کی طرف سے پیش کردہ محضر دکھا کر اسے خان کریمیا مقرر کر دیا اور اس وقت سے کریمیا کو ترکی مقبوضات کا ایک ممتاز صوبہ قرار دے دیا گیا۔

۸۸۴ھ میں سلطان نے پھر جنیوا کے مقبوضات پر چڑھائی کی اور اس کے ایک افسر نے تیس جنگی جہازوں کو لے کر قلعہ توبنر پر حملہ کر کے اُسے فتح کر لیا۔

جزیرہ روڈس

روڈس ایک جزیرہ ہے جس میں اس کے نام پر ایک شہر بھی ہے اور جزیرہ بھی۔

شہر کو قدیم فصیلوں اور برجوں نے گھیرا ہوا ہے ۔ کہتے ہیں اُسے "جو میری یوحنا" کے نائٹوں نے تعمیر کیا تھا ۔ اس شہر کے دو گھاٹ ہیں جو ایک دوسرے سے ایک تنگ اور سخت قطعہ زمین کے ذریعے سے جُدا ہوتے ہیں ۔ اس گھاٹ کے شمال غربی حصّے کے کنارے پر گرینڈ نائٹ کا عالی شان محل واقع ہے اور وہی نائٹوں کے رہنے کی جگہ اور ایک قلعہ قدیم یادگاریں خیال کی جاتی ہیں ۔ اس کے چھوٹے بندرگاہ کے دہانے پر ایک بُرج بنا ہوا ہے جس پر اپولون کا مشہور بُت نصب تھا اور قدیم زمانے کی مستند یادگار تسلیم کیا جاتا تھا اور دُنیا کے سات عجائبات میں شمار ہوتا تھا اور لوگ اسے روڈس کا تانبے والا بُت کہتے تھے ۔

کہا جاتا ہے کہ یہ بُت اُن جنگی آلات سے بنایا گیا تھا جو سکندر اعظم کے جانشین دیمتریوس پولو کریٹ نے یادگار چھوڑے تھے ۔ اسٹرابون کا مؤرخ بیان کرتا ہے کہ شہر روڈس اپنے موقع کی خوشنمائی سے تمام دنیا کے شہروں سے فوقیت رکھتا تھا ۔ روڈس کا امیر اُن صلیبی جنگیں لڑنے والوں میں کسی امیر کی نسل سے تھا ، جو شام کے ملک سے نکال دیے جانے پر یہاں جزیرے پر قبضہ کر کے رہنے لگے اور انھوں نے بیس برس کی مدت میں بہت سے مستحکم قلعے تعمیر کر لیے تھے ۔

والیٔ روڈس نے دیرینہ اسلام دشمنی کی بنیاد پر اپنے جنگی جہازوں کو اشارہ کیا کہ وہ ترکان عثمانیہ کے جہازوں پر حملہ کریں اور لوٹ مار مچائیں ۔ دوسری طرف یہاں کی عیسائی رعایا باوجود اس کے کہ ان کا حکمران روڈس عیسائی تھا ، سلطان کے پاس روڈس کے ظلم و ستم کی فریاد لے کر گئی اور درخواست کی کہ انھیں روڈس کے مظالم سے نجات دلائی جائے ۔ چنانچہ ۸۸۴ھ میں سلطان نے "مسیح پاشا" کو

جس کا اسلام قبول کرنے سے پہلے مسیئں نام تھا اور قیصر روم کے خاندان سے تھا۔ ایک سو ساٹھ جنگی جہازوں کا بیڑا دے کر جزیرے پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ ان جہازوں پر کوئی ایک لاکھ کے لگ بھگ سپاہی تھے۔ راستے کے چھوٹے چھوٹے مقامات کو فتح کرتے ہوئے خاص اس شہر میں یہ بیڑا پہنچ گیا۔ اور محاصرہ کر لیا جو برابر چار مہینے تک قائم رہا۔ آخر کار ترکان عثمانیہ نے فتح پائی اور ترکوں نے قلعہ کی چھت پر اسلام کا جھنڈا بلند کر دیا۔

"مسیح پاشا" نے اعلان کیا کہ کوئی سپاہی رعیت کی جان و مال سے کسی قسم کا کوئی تعرض نہ کرے۔ پاشا کے اس اعلان پر ترک فوج اِدھر اُدھر منتشر ہو گئی، جس سے اہلِ قلعہ کو ترکوں پر حملہ کرنے کا اچھا موقع مل گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ترک سپاہیوں کو اپنے جہازوں کی طرف بھاگ بھاگ کر جان بچانی پڑ گئی اور جزیرہ روڈس کی فتح پھر پچاس برس کے لیے پیچھے رہ گئی۔

وفات

۱۴ ربیع الاول ۸۸۶ھ میں سلطان محمد فاتح قسطنطنیہ نے وفات پائی شاہی مقبرے کے لیے جو زمین قسطنطنیہ میں اُس نے پہلے سے مخصوص کی ہوئی تھی اُسی میں دفن ہوا۔

سلطان محمد فاتح اپنے خاندان یعنی سلاطین عثمانیہ میں نہ صرف قسطنطنیہ کی فتح بلکہ انتظامات ملکی کے اعتبار سے بھی ممتاز حیثیت کا مالک ہے اُس کے زمانے میں حکومت کے تمام فوجی اور ملکی انتظامات نئے سرے سے ترتیب دیے گئے اور نئے نئے قوانین بھی وضع ہوئے مگر تعزیرات میں بجائے شرعی حدود کے جرمانے رکھے گئے۔

علاوہ ازیں بے شمار مکاتب و مدارس اور دار العلوم بھی تعمیر کیے گئے۔